کرن
اپریل 2014
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

مستقل سلسلے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

اپریل 2014
جلد 37 شمارہ 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اپریل کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
موسم بہار اختتام پذیر ہے اور موسم گرما کی سختیوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے شہری ادارے جو عوام کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کے ذمے دار ہیں، اپنی اعلا کارکردگی کے جوہر دکھانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ موسم گرما کا آغاز ہوتے ہی بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ شدید اذیت کا باعث بنتی ہے۔ بظاہر نظر آنے والی ترقی کے باوجود مجموعی طور پر ایک عام آدمی کی زندگی دشوار سے دشوار ہوتی جا رہی ہے اور ان ہی مسائل نے سیاسی و معاشرتی اور سماجی تضاد اور تشدد کو جنم دیا ہے۔ ہم جن نامساعد حالات سے دوچار ہیں انہیں درست کرنے کے لیے فہم و فراست اور ایمان داری کی ضرورت ہے۔ اپنے معاشرے کو سنوارنے کے لیے ہم میں سے ہر شخص اپنا کردار پوری ایمان داری سے ادا کرنے کا عزم کرے تو کوئی شک نہیں کہ ہم ایک پُرسکون زندگی گزار سکیں۔
اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض ایمان داری سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اس شمارے میں،

- اداکارہ "مومل شیخ" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ ربعی سلیم قارئین کے روبرو،
- اداکار "شہزاد شیخ" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- "قلِ ہما" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "دردِ دل" نبیلہ عزیز کا ناول اختتامی مراحل میں،
- "دستِ کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- "شامِ آرزو" فرحانہ ناز ملک کا نیا سلسلے وار ناول،
- "ساتھ دل کے چلے" سحرش بانو کے مکمل ناول کا دوسرا اور آخری حصہ،
- "میرے اچھے چاند" شازیہ جمال تیتر کا مکمل ناول،
- بی سحر ملک اور سمیرا گل کے ناولٹ،
- ردا الیم سرور، حنا یاسمین اور فرحی نعیم کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

تحفہ،

"آپ کا چہرہ، آپ کی شخصیت" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

میرے سینے میں دل مرا بولے
سب ہیں محتاج اُس کی رحمت کے

دیکھتا ہے وہ ہر گھڑی سب کو
کون ایسا ہے، اُس کو جو دیکھے

اُس کی رحمت سے ہی ہوا ممکن
رحمتِ دو جہاں یہاں آئے

میں گنہگار ہوں، بہت خاطی
بخش دیتا ہے اپنی رحمت سے

مجھ نکمے پہ فضل ہے اُس کا
ایسا سجدہ کروں کہ سر نہ اُٹھے

آسماں پر ردا ہے تاروں کی
اور زمیں کو دیے ہیں گُل بوٹے

ہے وہ خالق، وہی مصور پھول
اُس نے سب کے بنائے ہیں چہرے

تنویر پھول

نعت رسول مقبول

وجودِ شاہِ بطحا سے ہی توقیرِ مدینہ ہے
پگھل جاتا ہے واں ہر دل یہ تاثیرِ مدینہ ہے

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا
ہے نازک عرشِ اعظم سے، یہ تقدیرِ مدینہ ہے

پرانا نام یثرب تھا، نجات آزار سے پائی
درودِ رحمتِ عالم ﷺ سے تطہیرِ مدینہ ہے

بہاریں خُلد کی یاں ہیں سمائی ذرے ذرے میں
جناں کا گوشہ گوشہ کیا ہے تفسیرِ مدینہ ہے

گیا تھا کچھ برس پہلے دیارِ نور و نکہت میں
ابھی تک قلب کے گوشے میں تنویرِ مدینہ ہے

خدا نے نعت کی عطا کوثر، وہ مالک باغِ جنت کے
یقیناً کوثر و فردوس جاگیرِ مدینہ ہے!

بکھر جا پھول طیبہ میں ہو قرباں اپنے آقا پر
وہیں کی خاک میں مل جا جہاں میرِ مدینہ ہے

تنویر پھول

مومل شیخ سے ملاقات

شاہین رشید

اپنے نام کی طرح نازک اور پیاری فنکارہ کا اپنا تعارف تو ہے ہی کہ یہ ایک بہت اچھی پرفارمر ہیں مگر ان کا ایک اور تعارف بھی ہے کہ یہ معروف آرٹسٹ جاوید شیخ کی دختر نیک اختر ہیں۔ شادی کے بعد اپنے ڈرامہ کیریئر کا آغاز کیا اور شہرت بھی اپنے کام کی وجہ سے حاصل کی اور کافی وقت گزرنے پر لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ جاوید شیخ صاحب کی بیٹی ہیں۔

★ "مومل کیسی ہیں؟"

❋ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "ماشاء اللہ ہر ڈرامے میں آپ کا کردار بہت اچھا ہوتا ہے خواہ وہ "تیری قدرت" "کدورت" "مجھے خدا پہ یقین ہے" "ہوبیا" "زارا اور مہرالنساء" ہو' مزید کیا ہو رہا ہے؟"

❋ "مزید بھی کام ہو رہا ہے مگر ابھی ان کے ٹائٹل سیٹ نہیں ہوئے تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

★ "آفرز آتی ہیں تو کن باتوں کو مدنظر رکھتی ہیں؟"

❋ "جی سب سے پہلے اسکرپٹ 'پھر اپنا کردار کیونکہ میری نظر میں کردار کی بہت اہمیت ہوتی ہے کردار ایسا ہو تو پرفارم کرنے کا مارجن زیادہ ہوتا ہے اور ہم دوسروں کی نظروں میں بھی آتے ہیں۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ چیلنجنگ رول کروں۔ کیونکہ عام کردار کرنے سے آپ کبھی بھی اپنی جگہ نہیں بنا سکتے۔"

★ "ڈائریکٹرز اور پروڈکشن کی کیا اہمیت ہے؟"

❋ "ان کی بھی بہت اہمیت ہے' پہلے نمبر پر اسکرپٹ اس کے بعد ڈائریکٹر' پروڈکشن رائٹرز اور کو آرٹسٹ وغیرہ۔"

★ "کسی مخصوص چینل کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہوتی ہے کیا؟"

❋ "نہیں ایسا کچھ نہیں ہے اور زیادہ تو پتا بھی نہیں ہوتا کہ سیریل کس چینل کے لیے تیار کیا جا رہا ہے اور ہمارا کام تو کام کرنا ہے' کچھ پروڈکشن ہاؤسز ایسے ہیں جو صرف مخصوص چینلز کے لیے کام کرتے ہیں تو پتا چل جاتا ہے ورنہ تو نہیں چلتا۔"

★ "گزرے زمانے میں آرٹسٹ حسینہ معین' بانو قدسیہ' امجد اسلام امجد' بجیا اور ان ہی کی طرح دیگر مشہور رائٹرز کے نام دیکھ کر ہی کام کرنے پر راضی ہو جاتے تھے۔ خواہ کردار کیا بھی ہو' اب آپ جیسا بتا رہی ہیں کہ پہلے اسکرپٹ دیکھتی ہیں اور پھر رائٹرز تو ایسا کیوں ہے؟"

❋ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم رائٹرز کا نام بھی پہلے دیکھتے ہیں مگر ساری بات یہ ہے کہ آپ کو اپنا کردار بھی تو دیکھنا ہوتا ہے تو میں کردار کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

★ "ابھی تک کیے گئے کرداروں میں کس کردار کو چیلنجنگ کہیں گی؟"

❋ "سچ بتاؤں' ابھی تک میرے لیے سارے ہی رول چیلنجنگ تھے کیونکہ میں تو ابھی سیکھنے کے عمل سے گزر رہی ہوں اور سیکھنے کا عمل تو ساری زندگی رہے گا۔ ایک پروجیکٹ شروع ہوتا ہے پھر ختم ہو جاتا ہے پھر دوسرا شروع ہوتا ہے۔ تو ہر سیریل میں ایک نیا چیلنج ملتا ہے اور میں نے اپنے تمام کرداروں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

★ "لوگ نگیٹو رول کو چیلنجنگ رول کہتے ہیں اور آپ نے ابھی تک کوئی نگیٹو رول نہیں کیا ہے؟"

❋ "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' میں نے ابھی تک نگیٹو رول نہیں کیا اور میری نظر میں بھی دو کردار ایسے ہوتے ہیں جو چیلنجنگ ہوتے ہیں۔ ان

میں ایک نگیٹو اور دوسرا کامیڈی یہ دو کردار تھوڑے ٹیکنیکل بھی ہوتے ہیں اور ٹیکنیکل اس حساب سے کہ اگر آپ ایک نارمل رول کر رہے ہیں تو وہ آپ کی نارمل لائف سے قریب ہوتے ہیں لیکن نگیٹو رول میں آپ کو لڑکی کا بیک گراؤنڈ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑکی کہاں پیدا ہوئی' کہاں سے آئی ہے کیا پڑھتی تھی صرف یہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ایک کردار ہے آپ کر لیں۔ یہ جاننا اس لیے ضروری ہے تاکہ آپ کو کردار کرنے میں آسانی ہو۔ کردار میں اترنے اور ابھرنے میں آسانی ہو۔"

★ "ڈراموں میں سچ ہوتا ہے؟ اور جو کچھ ڈرامہ سیریل "کدورت" میں دکھایا گیا تھا اس میں کتنا سچ تھا؟"

❋ "جی ڈراموں میں بالکل سچ ہوتا ہے۔ ہمارے آج کل کے ڈرامے تو بنی ہی حقیقت پر رہے ہیں جو کچھ ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے اس کی بہت صحیح

عکاسی کی جا رہی ہے۔ ہمارے ڈراموں کی کہانیاں ہر گھر کی کہانی ہوتی ہے۔ کیونکہ جو مسائل دکھائے جاتے ہیں وہ ہر گھر کے مسائل ہوتے ہیں۔ تھوڑا ڈرامائی ہو جاتا ہے مگر میرے خیال میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے اور جو کچھ ڈرامے میں دکھایا جا رہا ہے اگر آپ اس سے نہیں گزرے تو ضروری نہیں کہ کوئی بھی نہ گزرا ہو۔۔۔ اور جہاں تک "کدورت" سیریل کی بات ہے تو بالکل ایسا ہوتا ہے اور جو لڑکیاں حساس ہوتی ہیں وہ ایسا ہی ری ایکٹ کرتی ہیں جیسے اس کے کردار "مینا" نے کیا اور جو صبر ہمارا دکھایا گیا یعنی میرے کردار میں تو ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں برداشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مگر میرے کردار میں تھوڑا چڑچڑا پن بھی دکھایا گیا تھا۔"

★ "آپ بہت اچھی پرفارمر ہیں، مگر پھر بھی کسی نے کبھی کہا کہ "تم آپ نے یہاں اچھا پرفارم نہیں کیا؟"

✻ "بالکل جی تنقید ہوتی ہے اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی تنقید کرتا ہے کیونکہ جب تک کوئی تنقید نہیں کرے گا میں سیکھوں گی کیسے۔۔۔ مجھے کیا پتا چلے گا کہ کہاں میں نے غلط کیا اور مجھ پر تنقید کرنے والی بہترین تنقید نگار میرے گھر میں ہی ہیں اور وہ میری ماں ہیں اور چونکہ وہ بحیثیت ایک ناظر کے کافی زمانے سے ڈرامے دیکھ رہی ہیں تو وہ بڑا غور سے دیکھتی ہیں اور بتاتی رہتی ہیں کہ کہاں کیا کرنا چاہیے تھا اور نہ صرف اداکاری پہ تنقید کرتی ہیں بلکہ کپڑوں اور میک اپ پر بھی کہ یہاں ایسا میک اپ ہونا چاہیے تھا یہاں یہ لباس ہونا چاہیے تھا اور کس طرح چلنا اور کس طرح سے بیٹھنا چاہیے تھا اور ڈائیلاگ ڈلیوری کے بارے میں بھی بتاتی اور سمجھاتی رہتی ہیں اور جب میری کوئی تعریف کرتا ہے تو میں ان سے یہ سوال ضرور کرتی ہوں کہ آپ یہ بتائیں کہ میں برا کیا کر رہی ہوں تاکہ میں اپنے آپ کو مزید اچھا بنا سکوں۔"

★ "تو پھر ایک تنقید میں بھی کرنا چاہوں گی کہ آپ کا میک اپ بعض ڈراموں میں بہت over ہوتا ہے جیسے "مجھے خدا پہ یقین ہے" اور "کدورت" میں آپ کا میک اپ بہت ڈارک تھا۔"

✻ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور اس بات کو خود میں نے بھی نوٹ کیا ہے اور میں نے یہ بات خود ہی سیکھی بھی ہے کہ مجھے کردار کے حساب سے میک اپ اور کپڑوں کا انتخاب کرنا ہے اور گھر کے سین میں کس طرح کے کپڑے اور میک اپ ہو اور باہر کے سین میں کس طرح کے ہوں اور آپ دیکھیے گا کہ اس معاملے میں آپ کو اور کسی کو بھی شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔"

★ "سومل مزید باتیں بھی ہوں گی پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✻ "ضرور۔۔۔ میرا نام سومل شیخ ہے 15 مئی 1984ء میں لاہور میں پیدا ہوئی ایک بڑا بھائی ہے شہزاد شیخ۔ میرا نام میری والدہ نے رکھا جس زمانے میں میں پیدا ہوئی اس زمانے میں ایک ڈرامہ سیریل چل رہا تھا جس میں لڑکی کا نام سومل تھا تو اس سے متاثر ہو کر میری امی نے میرا نام رکھا اور نام چونکہ خود ہی بہت مختصر اور خوب صورت ہے تو کسی کو بگاڑنے کا موقع ہی نہیں ملا اور یہ سندھی نام ہے اور "سُومل" لکھتے ہیں اور سُومل سُومل کہتے تھے تو کچھ عجیب سا لگتا تھا تو پھر اس کے اوپر سے پیش ہٹا دیا اور "سومل" کر دیا امی اور سندھ کے لوگ تو مجھے "سومل" ہی کہتے ہیں۔ خیر۔۔۔ میں نے A لیول کے بعد لندن سے مارکیٹنگ اِن ایڈورٹائزنگ میں گریجویشن کیا اور اس کے علاوہ بینک مینجمنٹ میں بھی دو تین سال کام کیا ہے اور پھر "ہم" ٹی وی میں بھی بہ حیثیت پروڈیوسر کے بھی کام کیا شاید ڈیڑھ دو سال۔"

★ "گڈ۔۔۔ تو پھر کیا کام کر کے اچھا لگا 'بینک میں' اداکاری یا پروڈکشن میں؟"

✻ "اداکاری میں زیادہ مزا آ رہا ہے اور انسان کو وہی کام کرنا چاہیے جو اس کو اچھا لگے۔ اداکاری ہر بار چیلنج ہوتا ہے اس لیے زیادہ مزا آ رہا ہے۔"

★ "اداکاری گھر کی میراث ہے۔ پھر دیر سے کیوں آئیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ جاوید شیخ صاحب نے۔۔۔ کہا تھا کہ جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے اس فیلڈ میں نہیں آنا؟"

✻ "ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے کچھ ایسا ڈیسائیڈ کیا ہوا تھا اور میں نے خود بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے اس فیلڈ میں آنا ہے۔ بابا نے بھی کبھی نہیں کہا اور نہ میں نے سوچا۔ اس لیے میں نے مارکیٹنگ پڑھی اور پھر کبھی پروڈکشن میں گئی، کبھی بینک میں گئی۔ بھی بچپن سے نہیں سوچا تھا کہ ایکٹنگ ہی کرنی ہے۔ بس اتفاق دیکھیں کہ شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ کیا میں اداکاری کر سکتی ہوں؟ تو انہوں نے کہا "کیوں نہیں، اگر۔۔۔ اچھا لگتا ہے اور۔۔۔ شوق ہے تو ضرور کریں لیکن آپ اپنے والد صاحب سے بھی ضرور پوچھ لیں۔۔۔ تو جب بابا سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ تمہارا شوہر اجازت دے رہا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

★ "شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں۔۔۔ اور پھر جب شوبز میں آئیں تو سب سے پہلے کیا کیا آپ نے؟"

✻ "شادی کو ڈھائی سال ہو گئے ہیں۔ سب سے پہلے ایک "سٹ کام" میں کام کیا اور میں باقاعدہ آڈیشن سے آئی ہوں بابا کی سفارش سے ہرگز نہیں آئی ہوں اور آڈیشن کے بعد جب اپروو کیا تو پھر باقاعدہ اسکرپٹ ریڈنگ ہوتی تھی تقریباً ایک ہفتہ اور پھر سٹ کام میں کام کیا "کافی اچھا تجربہ رہا۔ پھر میرا پہلا سیریل "اعتراف" تھا جو لوگوں کو بہت پسند آیا اور میرا کام بھی سب کو اچھا لگا۔ بس پھر کمرشلز کا سلسلہ بھی چل پڑا۔"

★ "کہا جاتا ہے کہ کمرشل میں کام کرنا بہت آسان ہوتا ہے؟"

✻ "نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ کام آسان نہیں ہوتا ہاں کام ایک دو دن کا ضرور ہوتا ہے اور ان دو تین دنوں میں آپ کو اپنی best پرفارمنس دینی ہوتی ہے۔"

★ "مزا آ رہا ہے فیلڈ میں اور کب طبیعت بے زار بھی ہو جاتی ہے؟"

✻ "مزا بہت آ رہا ہے۔ کیونکہ اپنی پسند سے اپنے شوق سے آئی ہوں اور جہاں تک طبیعت کے بے زار

www.paksociety.com

ہونے کی بات ہے تو اس وقت بہت کوفت اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے جب کوئی پروجیکٹ وقت پر مکمل نہیں ہوتا۔"

★ "اس فیلڈ میں یا ایسے عام زندگی میں خوب صورتی کا کیا کردار ہے؟"

✻ "میرا خیال ہے کہ ہر انسان اپنی ذات میں خوب صورت ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو بھی اس دنیا میں بھیجتا ہے بہت سوچ سمجھ کر ہی بھیجتا ہوگا اور کبھی نہ کہیں کہ یہ چیز بری ہے وہ چیز بری ہے اور دنیا میں کوئی بھی برا نہیں ہے بس اپنا دھیان رکھیں اپنا خیال رکھیں تو آپ بھی خوب صورت کہلائیں گے۔ مجھے بہت برے لگتے ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ فلاں خوب صورت نہیں ہے 'فلاں لمبی ہے' فلاں چھوٹی ہے ہر شخصیت میں کوئی نہ کوئی چارم ہوتا ہے۔ ہم ظاہری خوبیاں دیکھتے ہیں اندر کی نہیں۔"

★ "آپ کا انداز گفتگو بہت نرم ہے 'کبھی چیخنے چلانے والے کردار ملے تو میرا نہیں خیال کہ آپ کر پائیں گی؟"

✻ "ارے نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایسے کردار ملے تو یقیناً" کرلوں گی کیونکہ اداکاری میرا کام ہے اور مجھے کرنا ہے اگر ایک بار نہیں کرپاؤں گی تو دوسری یا تیسری بار ضرور کرلوں گی ہار نہیں مانوں گی۔"

★ "انسان کی شخصیت پہ گھر کے ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے۔ گھر میں کس کا غصہ تیز ہے اور کس کا اثر آپ پہ ہے؟"

✻ "ہمارے گھر میں کسی کا غصہ تیز نہیں ہے نہ بابا کا نہ بھائی کا اور نہ ہی امی کا' اب جب سے شادی ہوئی ہے تو میاں صاحب کا غصہ بھی نہیں دیکھا۔ تو واقعی گھر کے ماحول کا اثر ہوتا ہے اور شاید یہ اثر ہی ہے کہ مجھے بھی غصہ نہیں آتا اور آئے بھی تو منٹ یا دو منٹ کے لیے۔۔۔ اس سے زیادہ نہیں اور امی نے یہی تربیت کی ہے کہ بیٹا ہمیشہ پوزیٹو ہو کر سوچا کرو۔"

★ "ذمہ داریوں کا احساس کب ہوتا ہے انسان کو؟"

✻ "میرے خیال سے شادی کے بعد کیونکہ جیسے کہ اب میں ہوں اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو شاید مجھے وقت کی پابندی اور ذمہ داریوں کا احساس نہ ہوتا لیکن شادی کے بعد جب میں نے اپنے شوہر سے کام کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا کہ اپنے ٹائمنگ دیکھ لو اور اپنے وقت کو تقسیم کرلو اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھا سکو تو بے شک کام کرو اور اللہ کا شکر ہے کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

★ "سیٹ پہ ڈائریکٹرز کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟ ڈانٹ پڑتی ہے؟"

✻ "رویہ عموماً" اچھا ہی ہوتا ہے مگر جب کام ٹھیک نہ ہو رہا ہو یا ری ٹیکس زیادہ ہو رہے ہوں تو پھر اونچی آواز میں بات بھی کرلیتے ہیں اور کبھی ڈانٹ بھی دیتے ہیں اور یہ سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

★ "زندگی کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"

✻ "یہ ہر لمحہ بدلتی ہے بچپن میں کچھ اور تھی پھر بڑے ہوگئے تو کچھ اور ہوگئی پھر والدین کے گھر میں کچھ اور تھی اب شادی ہوگئی ہے تو کچھ اور ہوگئی ہے اور زندگی اگر بدلے نہ تو پھر زندگی گزارنے کا مزا بھی نہ آئے۔"

★ "کردار کے لیے مشاہدہ کرتی ہیں۔۔۔ یا ذہن سے بناتی ہیں؟"

✻ "کوئی مشکل کردار ہوتا ہے تو پھر ان کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرتی ہوں اور اپنے طور پر مشاہدہ بھی کرتی ہوں 'مگر ابھی تک ایسا کوئی کردار ملا نہیں کہ مشاہدہ کرنا پڑا ہو۔"

★ "روڈ پہ کھڑے فقیروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں؟"

✻ قہقہہ "سلوک؟ انکار نہیں کرتی بیگ میں ہاتھ ڈالتی ہوں جو ہاتھ میں آجاتا ہے دے دیتی ہوں ضروری نہیں کہ پانچ روپے ہوں یا بہت زیادہ ہوں۔"

★ "اور جی آپ کی لو میرج ہے اور میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟"

✻ "جی جی۔۔۔ لو میرج ہے اور کارپوریٹ ورلڈ میں ایک کمپنی کے ایچ آر ہیڈ ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ کافی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے ہم دونوں میں اور ہم ایک دوسرے کی باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور انڈر اسٹینڈ کرتے ہیں۔"

★ "میاں صاحب کا نام کیا ہے اور آپ موئل شیخ ہی لکھتی ہیں یا میاں کا نام لکھتی ہیں؟"

✻ "جی ان کا نام نادر نواز ہے اور میڈیا میں تو موئل شیخ ہی ہے اور ویسے میں نے اپنا نام change نہیں کیا اور کام میں نے شادی کے ایک سال کے بعد شروع کیا اور میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ میں نام تبدیل کروں تو انہوں نے کہا کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں مسز نادر کے نام کے ساتھ پہچانی جاؤں لیکن نام میرا موئل شیخ ہے 'اپنے والدین کا نام کیسے ہٹادوں جن کے ساتھ میں نے اتنی زندگی گزاری تو میں مسز نادر بھی ہوں اور میں موئل شیخ بھی ہوں۔"

★ "آپ کے خیال میں ہمارے لوگ وقت ضائع کرتے ہیں یا کام میں لاتے ہیں؟"

✻ "لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی' جہاں تک میری بات ہے تو میری کوشش ہوتی ہے کہ میں وقت ضائع نہ کروں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اتنی مصروف رہتی ہوں کہ میرے پاس وقت ضائع کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔"

★ "تقریبات میں جانے کے لیے جلدی تیار ہو جاتی ہیں یا وقت لگتی ہیں؟"

✻ "میں تو بہت جلدی تیار ہو جاتی ہوں 'بلکہ اگر کہیں کہ میں تو منٹوں میں تیار ہو جاتی ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ میری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ وقت پر پہنچ جاؤں اور کسی کو ہمارا انتظار نہ کرنا پڑے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے موئل شیخ سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے وقت دیا۔ اپنی مصروفیات میں سے۔

☼ ☼

میری بھی سنیے

شہزاد شیخ

شاہین رشید

1- "پورا نام؟"
"شہزاد شیخ۔"

2- "پیار سے بلاتے ہیں؟"
"شہزی۔"

3- "جنم دن/ جنم سال؟"
"26 ستمبر 1982ء۔"

4- "اسٹار ہائیٹ؟"
"برابر 6 فٹ 2 انچ۔"

5- "تعلیم؟"
"بیچلر آف کمپیوٹر سائنس اور کورسز آف فلم میکنگ۔"

6- "فیملی ممبرز؟"
"والدین ایک چھوٹی بہن سول شیخ۔"

7- "شادی؟___ جسے چاہا ملی؟"
"دسمبر 2012ء میں ہوئی اور جی ہاں میں نے جسے چاہا وہی ملی مجھے۔"

8- "اداکاری شوق یا ورثے میں ملی؟"
"شوق بھی تھا اور ورثے میں بھی ملی ہے۔ آنکھ ایسے ماحول میں کھولی جہاں چاروں طرف ایک ہی ماحول تھا___ پھر والد بھی بہت بڑے اسٹار ہیں۔"

9- "شہرت کا باعث والد یا پرفارمنس؟"
"اپنے اردگرد کے حلقے میں والد صاحب اور عام ناظرین میں پرفارمنس سے شہرت پائی۔"

10- "کس ڈرامے نے پہچان دی؟"
"ڈر میرا پہلا ڈرامہ تھا___ بس پھر اس کے بعد سب ہی مقبول ہو گئے۔ ہر سیریل میں میرے کام کو سراہا گیا۔"

11- "میں ملنا چاہتا ہوں؟"
"قائداعظم سے___ بتاؤں کہ پاکستان کا کیا حال ہو گیا ہے۔"

12- "اداکاری کے علاوہ کیا کرنا چاہتا ہوں؟"
"کچھ نہیں آئندہ پانچ دس سال صرف اداکاری ہی کرنا چاہتا ہوں خواہ ڈرامے ہوں فلم ہو ٹیلی فلم ہو یا کمرشل۔"

13- "گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"گرم گرم چائے مل جائے___ اور مل بھی جاتی ہے اکثر۔"

14- "چھٹی کے دن کی خواہش؟"
"خوب سوؤں اور کوئی نہ اٹھائے۔"

15- "مجھے افسوس ہوتا ہے کہ؟"
"اپنی اس مصروف زندگی میں "نماز" کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔"

16- "ہاتھ کی لکیریں بولتی ہیں کیا؟"
"جی بالکل بولتی ہیں___ کسی نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کہا تھا کہ تم بہت خوش قسمت انسان ہو اور بہت ترقی کرو گے اور دیکھ لیں کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

17- "شدید بھوک میں کھانا نہ ملے؟"
"اف___ بہت غصہ آتا ہے اور اب سب کو میری اس عادت کا پتا چل گیا ہے اس لیے ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ کھانے میں دیر ہو جائے۔"

18- "پسندیدہ ناشتا؟"
"آملیٹ، بریڈ بہت پسند ہے۔"

19- "اپنی شخصیت میں کیا کمی محسوس کرتا ہوں؟"

"شخصیت تو اللہ کا شکر ہے اللہ نے مکمل بنائی ہے' بس طبیعت میں تھوڑی سستی بھری ہے۔"

20۔ "مجھے اچھا لگتا ہے؟"

"جب لوگ میری ایمانداری ' دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں۔"

21۔ "کس ملک کی شہرت کی خواہش ہے؟"

"کسی ملک کی نہیں۔ اپنے ملک سے بہتر اور خوب صورت کوئی ملک نہیں ہے۔ ویسے میرے پاس امریکہ کا گرین کارڈ ہے۔"

22۔ "اپنے ملک کا ایک شہر جو مجھے بہت پسند ہے؟"

"اپنا شہر کراچی۔"

23۔ "تب بہت غصہ آتا ہے جب؟"

"جب کوئی گہری نیند سے اٹھا دے اور کہے کہ کب تک سوؤ گے اب اٹھ بھی جاؤ۔"

24۔ "میری نظر میں بہترین کک؟"

"میری ماں۔۔۔ بہترین کھانا پکاتی ہیں۔"

25۔ "تقریب میں جانے کے لیے جلدی تیار ہو جاتے ہیں؟"

"جی۔۔۔ میں تو جلدی تیار ہو جاتا ہوں۔ بیگم دیر کرتی ہے۔"

26۔ "ایک دن جس کا انتظار رہتا ہے؟"

"سالگرہ کا۔۔۔ بچپن سے ہی یہ دن بہت اہم لگتا ہے۔ کیونکہ خاص اہتمام ہوتا ہے اس دن۔"

27۔ "مجھے رشک آتا ہے؟"

"جب میں ملک سے باہر جا کر بہت سی ایسی باتیں دیکھتا ہوں جو صرف اور صرف ہمارے قرآن نے سکھائی اور بتائی ہیں اور ان کو ہم نے اپنانے کی بجائے انگریزوں نے اپنائی ہوئی ہیں۔ تو رشک آتا ہے اپنے مذہب پر اور دکھ ہوتا ہے اپنے لوگوں پر اپنے حکمرانوں پر۔"

28۔ "آئینہ دیکھنا کیسا لگتا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔۔۔ ضرورت کے تحت ہی دیکھتا ہوں۔ جب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا ہوں تب۔۔۔ ورنہ نہیں۔"

29۔ "کیا انسان اپنی مرضی کی زندگی گزارتا ہے؟"

"میں تو اپنی مرضی سے ہی گزار رہا ہوں دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

30۔ "فارغ اوقات کے مشاغل؟"

"موویز بہت دیکھتا ہوں۔۔۔ یا پھر کہیں گھومنے پھرنے چلے جاتے ہیں ہم سب۔"

31۔ "گھر میں کہاں سکون ملتا ہے؟"

"ویسے تو اپنے پورے گھر میں سکون ملتا ہے لیکن اپنے کمرے کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

32۔ "مسائل شیئر کرتا ہوں؟"

"اپنی بیگم سے اور اپنی ماں سے۔"

33۔ "من حیث القوم ہم کیسے ہیں؟"

"اف۔۔۔ بہت ہی جذباتی۔۔۔ بہت زیادہ جذباتی۔"

34۔ "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"کہ ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اصل میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے انسان کی زندگی میں۔"

35۔ "میں منتظر ہوں؟"

"ایک دن ایسا بھی آجائے کہ میرے والد فخر سے کہہ سکیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔"

36۔ "میری سیونگ؟"

"سیونگ۔۔۔ کیا ہوتی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں' کیونکہ بہت فضول خرچ ہوں۔ جو کماتا خرچ کر دیتا ہوں۔"

37۔ "میں مسکرا دیتا ہوں؟"

"جب لوگ مجھ سے ملتے ہیں۔ میری تعریف بھی کرتے ہیں اور پھر فوراً" کہتے ہیں کہ ابا کیسے ہیں۔ وہ بہت اچھے فنکار ہیں۔ بے شک میرے والد بہت مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ مگر میرا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے میرے حوالے سے بھی پہچانیں۔"

38۔ "دنیا میں کیا چیز اوریجنل ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ ہر چیز کاپی ہے۔ ہم وہ ہی کچھ سیکھتے ہیں جو ہمارے والدین سکھاتے ہیں ہم وہ ہی زبان بولتے ہیں جو ہمارے والدین بولتے ہیں۔ اداکاری بھی اوریجنل نہیں ہوتی۔ ہم کسی نہ کسی کی کاپی کر رہے ہوتے ہیں۔"

39۔ "پہلی کمائی کہاں لٹائی؟"

قہقہہ "پہلی کمائی بڑی ہینڈسم تھی 75 ہزار روپے ایک سیریل میں کام کرنے کے ملے تھے اور وہ اپنے اوپر اور گھر والوں پر لٹا دی۔ بہت اچھا لگا خرچ کر کے۔"

40۔ "اداکاری شغل ہے یا پروفیشن ہے؟"

"پروفیشن ہے جی۔۔۔ باقاعدہ Subject ہے جو یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ شغل تو کسی اور زمانے میں ہو گا اب نہیں ہے۔"

41۔ "بچپن میں سوچا کرتا تھا؟"

"کہ پڑھ لکھ کر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کروں گا یا اپنی ایجنسی بناؤں گا۔ مگر پھر اداکاری میں مزا آنے لگا تو۔۔۔ اداکاری کا ہو گیا۔"

42۔ "لڑکیوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"

"بلاوجہ کوئی گھورے تو بہت برا لگتا ہے۔ پھر میں بھی تیز نظروں سے گھورنا شروع کر دیتا ہوں۔"

43۔ "اپنی ایک عادت جو بدلنا چاہتا ہوں؟"

"دیر تک سونے کی۔ میں صبح جلدی اٹھنا چاہتا ہوں مگر ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔"

44۔ "دوسروں کی کیا بات بری لگتی ہے؟"

"نصیحت جو بلاوجہ عقلمند بن کر نصیحت کرتے ہیں ان کی نصیحتیں بری لگتی ہیں۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے وقت گزارنے کا حق ہے۔"

45۔ "قابل اعتماد کون ہوتا ہے؟"

"میرے خیال میں لڑکیاں۔۔۔ لڑکیوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ بات کو راز نہیں رکھتیں مگر ایسا نہیں ہے۔"

46۔ "پرسکون کب ہوتے ہیں؟"

"رات کے وقت۔۔۔ سارا دن کی تھکن کے بعد

"شخصیت تو اللہ کا شکر ہے اللہ نے مکمل بنائی ہے' بس طبیعت میں تھوڑی سستی بھری ہے۔"

20۔ "مجھے اچھا لگتا ہے؟"

"جب لوگ میری ایمانداری' دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں۔"

21۔ "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"کسی ملک کی نہیں۔ اپنے ملک سے بہتر اور خوب صورت کوئی ملک نہیں ہے۔ ویسے میرے پاس امریکہ کا گرین کارڈ ہے۔"

22۔ "اپنے ملک کا ایک شہر جو مجھے بہت پسند ہے؟"

"اپنا شہر کراچی۔"

23۔ "تب بہت غصہ آتا ہے جب؟"

"جب کوئی گہری نیند سے اٹھاوے اور کہے کہ کب تک سوؤ گے اب اٹھ بھی جاؤ۔"

24۔ "میری نظر میں بہترین کک؟"

"میری ماں۔ بہترین کھانا پکاتی ہیں۔"

25۔ "تقریب میں جانے کے لیے جلدی تیار ہو جاتے ہیں؟"

"جی۔ میں تو جلدی تیار ہو جاتا ہوں۔ بیگم دیر کرتی ہے۔"

26۔ "ایک دن جس کا انتظار رہتا ہے؟"

"سالگرہ کا۔ بچپن سے ہی یہ دن بہت اہم لگتا ہے۔ کیونکہ خاص اہتمام ہوتا ہے اس دن۔"

27۔ "مجھے رشک آتا ہے؟"

"جب میں ملک سے باہر جا کر بہت سی ایسی باتیں دیکھتا ہوں جو صرف اور صرف ہمارے قرآن نے سکھائی اور بتائی ہیں اور ان کو ہم نے اپنانے کی بجائے انگریزوں نے اپنائی ہوئی ہیں۔ تو رشک آتا ہے اپنے مذہب پر اور دکھ ہوتا ہے اپنے لوگوں پر اپنے حکمرانوں پر۔"

28۔ "آئینہ دیکھنا کیسا لگتا ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ ضرورت کے تحت ہی دیکھتا ہوں۔ جب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا ہوں تب۔ ورنہ نہیں۔"

29۔ "کیا انسان اپنی مرضی کی زندگی گزارتا ہے؟"

"میں تو اپنی مرضی سے ہی گزار رہا ہوں دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

30۔ "فارغ اوقات کے مشاغل؟"

"موویز بہت دیکھتا ہوں۔ یا پھر کہیں گھومنے پھرنے چلے جاتے ہیں ہم سب۔"

31۔ "گھر میں کہاں سکون ملتا ہے؟"

"ویسے تو اپنے پورے گھر میں سکون ملتا ہے لیکن اپنے کمرے کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

32۔ "مسائل شیئر کرتا ہوں؟"

"اپنی بیگم سے اور اپنی ماں سے۔"

33۔ "من حیث القوم ہم کیسے ہیں؟"

"اف۔ بہت ہی جذباتی۔ بہت زیادہ جذباتی۔"

34۔ "زندگی سے کیا سیکھا؟"

"کہ ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اصل میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے انسان کی زندگی میں۔"

35۔ "میں منتظر ہوں؟"

"ایک دن ایسا بھی آجائے کہ میرے والد فخر سے کہہ سکیں کہ یہ میرا بیٹا ہے۔"

36۔ "میری سیونگ؟"

"سیونگ۔ کیا ہوتی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں' کیونکہ بہت فضول خرچ ہوں۔ جو کماتا خرچ کر دیتا ہوں۔"

37۔ "میں سکرا دیتا ہوں؟"

"جب لوگ مجھ سے ملتے ہیں۔ میری تعریف بھی کرتے ہیں اور پھر فوراً" کہتے ہیں کہ ابا کیسے ہیں۔ وہ بہت اچھے فنکار ہیں۔ بے شک میرے والد بہت مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ مگر میرا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے میرے حوالے سے بھی پہچانیں۔"

38۔ "دنیا میں کیا چیز اوریجنل ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ہر چیز کاپی ہے۔ ہم وہ ہی کچھ سیکھتے ہیں جو ہمارے والدین سکھاتے ہیں ہم وہ ہی زبان بولتے ہیں جو ہمارے والدین بولتے ہیں۔ اداکاری بھی اوریجنل نہیں ہوتی۔ ہم کسی نہ کسی کی کاپی کر رہے ہوتے ہیں۔"

39۔ "پہلی کمائی کہاں لٹائی؟"

فقرہ۔ "پہلی کمائی بڑی ہینڈسم تھی 75 ہزار روپے ایک سیریل میں کام کرنے کے ملے تھے اور وہ اپنے اوپر اور گھر والوں پر لٹا دی۔ بہت اچھا لگا خرچ کر کے۔"

40۔ "اداکاری شغل ہے یا پروفیشن ہے؟"

"پروفیشن ہے جی۔ باقاعدہ Subject ہے جو یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ شغل تو کسی اور زمانے میں ہو گا اب نہیں ہے۔"

41۔ "بچپن میں سوچا کرتا تھا؟"

"کہ پڑھ لکھ کر کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کروں گا یا اپنی ایجنسی بناؤں گا۔ مگر پھر اداکاری میں مزا آنے لگا تو۔ اداکاری کا ہو گیا۔"

42۔ "لڑکیوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"

"بلاوجہ کوئی گھورے تو بہت برا لگتا ہے۔ پھر میں بھی تیز نظروں سے گھورنا شروع کر دیتا ہوں۔"

43۔ "اپنی ایک عادت جو بدلنا چاہتا ہوں؟"

"دیر تک سونے کی' میں صبح جلدی اٹھنا چاہتا ہوں مگر ابھی تک کامیاب نہیں ہوا۔"

44۔ "دوسروں کی کیا بات بری لگتی ہے؟"

"نصیحت جو بلاوجہ عقلمند بن کر نصیحت کرتے ہیں ان کی نصیحتیں بری لگتی ہیں۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے وقت گزارنے کا حق ہے۔"

45۔ "قابل اعتماد کون ہوتا ہے؟"

"میرے خیال میں لڑکیاں۔ لڑکیوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ بات کو راز نہیں رکھتیں مگر ایسا نہیں ہے۔"

46۔ "پرسکون کب ہوتے ہیں؟"

"رات کے وقت۔ سارا دن کی تھکن کے بعد

گھر آکر بہت سکون ملتا ہے۔"

47۔ "محبت میری نظر میں؟"
"محبت کے بارے میں میری سوچ یہ ہے کہ سچی محبت تو آپ کو شادی کے بعد اپنی لائف پارٹنر سے ہی ہوتی ہے باقی محبتیں تو چلتی رہتی ہیں۔"

48۔ "خیرات دینی چاہیے؟"
"بالکل دینی چاہیے مگر ان چلتے پھرتے صحت مند فقیروں کو نہیں بلکہ جو مستحق ہیں ان کو دینی چاہیے تاکہ کسی کے کام تو آئے۔"

49۔ "سائنس کا کارنامہ؟"
"بہت سے کارنامے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ موبائل فون سب سے بڑا کارنامہ ہے۔"

50۔ "جھوٹ بولتے ہیں؟"
"ہوں۔۔۔ کبھی کبھی بولنا پڑتا ہے۔۔۔ اور اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو جھوٹ نہ بولتا ہو۔"

51۔ "پسندیدہ تہوار؟"
"14 اگست۔۔۔ بہت اہتمام سے مناتا ہوں۔"

52۔ "منہ نوچنے کو دل چاہتا ہے؟"
"اپنا نہیں، سامنے والے کا، جب وہ میرے منہ پر بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔"

53۔ "وقت پڑنے پر دھوکہ کون دیتا ہے؟"
"یقیناً" اپنے ہی دیتے ہیں۔ پرائے تو پھر بھی مخلص ہوتے ہیں۔"

54۔ "ملک کے حالات کس طرح بہتر ہوں گے؟"
"اگر ہر انسان اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہوا خود اچھا ہو جائے تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ ملک کے حالات بہتر نہ ہوں۔"

55۔ "دکھی ہو جاتا ہوں؟"
"جب پاکستان کے بارے میں کوئی غلط اور بری بات کہتا ہے۔۔۔ سوچتا ہوں کہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں۔"

56۔ "پاکستان سے میری محبت؟"
"اتنی جتنی اولاد کو ماں باپ سے اور ماں باپ کو اولاد سے ہوتی ہے، میں چاہتا تو بڑی آسانی سے امریکہ رہ سکتا تھا مگر مجھے پاکستان بہت عزیز ہے بہت پیارا ہے۔"

57۔ "کچھ چیزیں جو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں؟"
"منرل پانی اور موبائل۔"

58۔ "موبائل نمبر بدلتے رہنا چاہیے؟"
"ہرگز نہیں، میں نے ایک ہی بار بدلا تھا بار بار بدلنے سے بندہ خود ہی مشکل میں آجاتا ہے۔"

59۔ "لوکل سفر کے لیے پسندیدہ سواری؟"
"اپنی اور صرف اپنی کار۔"

60۔ "پسندیدہ چینل؟"
"کھیلوں سے بہت لگاؤ ہے اس لیے اسپورٹس چینلز بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔"

☼ ☼

آواز کی دنیا سے

روبی سلیم

شاہین رشید

ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو ہر کامیاب عورت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوتا ہے ۔۔۔ تب بھی عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے ہمارے معاشرے میں عورت کو بہت ہلکا لیا جاتا ہے مگر درحقیقت عورت بہت بہادر ہوتی ہے اور ہر مشکل کو سہنے اور جھیلنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہتے ہیں کہ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے۔ میں کہتی ہوں مرد عورت کے بغیر ادھورا ہے۔ بیوی کا انتقال ہو جائے تو مرد فوراً" دوسری شادی کر لیتا ہے جبکہ عورت اگر صاحب اولاد ہے تو اپنی پوری زندگی ان پر قربان کر دیتی ہے۔ عورت اگر مرد کے بغیر ادھوری ہے تو صرف اس لیے کہ مردوں کا یہ معاشرہ اسے جینے نہیں دیتا۔ اسے بری نظروں سے دیکھتا ہے۔

معروف آر جے اور ماضی کی فنکارہ "روبی سلیم" کے والد بھی ینگ ایج میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ تب والدہ نے ہی اپنے بچوں کی پرورش کی اور انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ روبی سلیم شادی سے پہلے روبی درانی کہلاتی تھیں۔

* "کیسے مزاج ہیں اور آج کل کر کیا رہی ہیں آپ؟"

* "جی اللہ کا شکر ہے اور میری مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ ریڈیو ایف ایم 100 تو کر ہی رہی ہوں اور ایف

ایم 100 کی پہلی آر جے ہوں۔ اس کے علاوہ ایف ایم 100 کی ہی مارکیٹنگ کرتی ہوں۔ کمرشلز کے حوالے سے وائس اوور بھی کرتی ہوں اور کمرشلز شوٹ بھی کرتی ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتی ہوں۔"

* "ان سارے کاموں کے لیے ٹائم کو کس طرح تقسیم کرتی ہیں کس طرح مینج کرتی ہیں؟"

☆ "جس کام کے کرنے کا طریقہ آتا ہے وہ کام خود بخود Manage ہو ہی جاتا ہے اور کام کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا۔ لیکن اگر میری پہلے سے کوئی کمٹمنٹ ہوتی ہے جیسے کسی ایم ڈی سے یا کسی اور سے ملاقات کرنی ہوتی ہے مارکیٹنگ کے سلسلے میں تو پھر کمرشل کے لیے میں ٹائم نہیں دیتی بلکہ ٹائم کو Skip کر کے کوئی اور ٹائم دے دیتی ہوں تو اللہ کا شکر ہے manage ہو جاتا ہے۔"

* "ایک زمانے میں آپ نے اداکاری بھی تو کی ہے!"

☆ "وہ تو ابھی بھی جاری ہے پہلے اداکاری تھی اب صداکاری ہے۔ اصل کام تو ریڈیو پہ کام کرنا ہے ٹی وی میں تو لوگ آپ کی شکل دیکھ کر شکل کے سحر میں ہی کھو جاتے ہیں تو آواز کے اتار چڑھاؤ کا اتنا اندازہ نہیں رہتا۔ اس لیے ریڈیو پہ کام کرنا مشکل بھی ہے اور فن بھی ہے۔۔۔ اور ابھی بھی میرے پاس دو تین سیریلز کی آفرز ہیں اور بہت جلد میرے ناظرین مجھے ٹی وی اسکرین پہ بھی دیکھیں گے اور جب میں یونیورسٹی میں تھی تو مجھے شوق بھی تھا ٹی وی میں کام کرنے کا اور میرے پاس وقت بھی تھا۔ والدہ نے بہت ساتھ دیا پھر شادی ہوئی تو شوہر نے بہت سپورٹ کیا۔ اور کرتے ہیں آج تک۔"

* "ریڈیو' ٹی وی کا سفر کس طرح شروع ہوا اور کس طرح اس مقام تک آئیں؟"

☆ "ریڈیو سے سفر کا آغاز ہوا' ریڈیو پاکستان کے بزم طلبہ میں گئی تھی پروگرام کیے پھر کہا گیا کہ آپ کی آواز ایسی ہے کہ آپ نیوز پڑھ سکتی ہیں آپ نیوز کے لیے آڈیشن دے دیں' چنانچہ جس دن آڈیشن تھا تقریباً" ڈھائی سو کے قریب اور بھی لوگ تھے میری خوش قسمتی کہ میرا سلیکشن ہو گیا۔ تو نیوز پڑھیں' پھر صداکاری بھی کی ڈراموں میں' ریڈیو کمپئرنگ بھی کی پھر ٹی وی کے کچھ ڈراموں میں کام کرنے کی آفرز آ گئیں۔ کچھ کے لیے انکار کیا۔۔۔ ایک دن انور مقصود صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ میں ایک پروگرام اسٹوڈیو ڈھائی کر رہا ہوں اس میں ایک شخصیت کی ضرورت ہے اور مجھے اندازہ ہے کہ آپ کر لیں گی میں نے کہا کہ پتا نہیں گھر سے اجازت ملتی ہے یا نہیں کیونکہ ڈراموں کی آفرز آئی تھیں مگر میں نے انکار کر دیا تو انہوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا مجھے پتا ہے کہ وہاں کا ماحول کیسا ہے مگر میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہوں کیونکہ جو کام میں آپ سے کروانا چاہتا ہوں وہ ٹیلنٹ مجھے آپ میں نظر آ رہا ہے۔ پھر گھر سے امی سے انہوں نے اجازت لی اور امی نے انور مقصود صاحب کی وجہ سے اجازت دے دی اور جب میں نے اسٹوڈیو ڈھائی میں پرفارم کیا تو میرا آکشن بہت ہٹ گیا' جس پر معین اختر نے کہا کہ کامیڈی میں میں دو لوگوں سے بہت متاثر ہوا ہوں' ایک روحی دوانی سے اور اس لحاظ سے کہ وہ سیریس تھی اور لوگ ہنس رہے تھے اور ایک میں "جیری لوئس" سے متاثر ہوں کہ اس کا چہرہ سپاٹ ہوتا تھا مگر لوگ ہنس رہے ہوتے تھے اور یہ میرے لیے بہت بڑا compliment تھا' محسن علی صاحب بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کہ تم تو انٹرنیشنلی فیمس ہو چکی ہو۔ پھر انور مقصود کا "اسٹوڈیو پونے تین" کیا "مقدمہ کشمیر" میں کام کیا اس میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا کردار کیا تھا اس کے بعد "خوابوں کی زنجیر" کیا' یہ لونگ پلے تھا "پیا گھر آئے" یہ بھی لونگ پلے تھا۔ یہ طاہر شیخ کا اور "خوابوں کی زنجیر" انور مقصود کا تھا "سویرے سویرے" 55 اقساط کی تھی سیریل۔ تو اسی طرح کافی کام کیا ہے میں نے پھر جب ایف ایم

100 شروع ہوا تو میں نے اپلائی کیا 1995ء میں اور میں ایف ایم 100 کی پہلی خاتون آر جے ہوں اور یہ سفر اب تک جاری ہے۔

* "بے شمار چینلز ہیں اور بہت کام ہو رہا ہے اگر آپ ٹی وی کو ٹائم دیں گی تو پھر میرے خیال میں ریڈیو کو نہیں دے پائیں گی؟"

☆ "نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں کے (ریڈیو کے) لوگ مجھے کہتے ہیں کہ اگر اچھی آفرز آئیں تو آپ کام کریں لیکن سارا مسئلہ وقت کا ہے مجھے اپنے گھر کو بھی

دیکھنا ہوتا ہے اس لیے چھوڑ دی ہوں' اچھا رول ہو گا تو ضرور کروں گی۔"

* "ایک وقت میں کئی فیلڈز سے وابستہ ہیں۔ انجوائے کہاں کر رہی ہیں؟"

☆ "دیکھیں جی کسی کام کو کرنے کا اگر جنون ہو تو پھر کوئی کام بوجھ نہیں لگتا انجوائے کرتے ہوئے کام کرتے ہیں تو پھر ہر کام آسانی سے ہو جاتا ہے اور میں ہر کام کو انجوائے کرتی ہوں۔ ورنہ تو لوگ بہت جلد اکتا جاتے ہیں کہ نہیں جی ریڈیو بہت مشکل کام ہے مارکیٹنگ بہت مشکل کام ہے اور مجھے کبھی بوریت کا احساس ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں جب ملک سے باہر جاتی ہوں تو وہاں کے ریڈیو والے مجھے بلاتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ پاکستان سے آئی ہیں اور پاکستان کے چینلز کے پروگراموں میں اور ہمارے پروگراموں میں کیا فرق ہے اور وہاں کے ایک پنجابی چینل سے میرا انٹرویو ہوا تو وہ لوگ جو 90ء کی دہائی میں پاکستان رہتے تھے اور جنہوں نے میرے پروگرام سنے ہوئے تھے وہ مجھے فوراً" پہچان گئے اور پھر انہوں نے کالز کیں اور بتایا کہ جب ہم 99-1998ء میں پاکستان میں تھے تو آپ کے پروگرام سنا کرتے تھے۔ تب بہت اچھا لگا پھر کہتے ہیں کہ آپ تو مستقل یہیں رہ جائیں تو اچھا ہے۔ تو اس ساری کامیابیوں میں میری والدہ کا ہاتھ ہے چھ سال قبل ان کا انتقال ہوا اور ان کی زندگی میں ہی میری شادی بھی ہوئی تو میرے شوہر نے بھی مجھے بہت سپورٹ کیا۔"

* "تعلیم کہاں تک حاصل کی اور اس فیلڈ میں آپ کی تعلیم کام آئی جو آپ نے حاصل کی؟"

☆ "میں نے ایم ایس سی کیا ہے کراچی یونیورسٹی سے اور فرسٹ کلاس پوزیشن تھی میری اور جس فیلڈ میں میں نے اسپیشلائز کیا ہے وہ شوبز میں میرے کام نہیں آ رہی۔ بس مجھ سے اللہ تعالیٰ نے جس فیلڈ میں کام لینا تھا اس میں مجھے بھیج دیا ہے تو شوبز کے کئی

شعبوں میں میں کام کر رہی ہوں اور بہت مطمئن ہوں اپنی جاب سے اور ایجوکیشن کا ڈیپارٹمنٹ بالکل الگ ہے اس میں لیکچرر شپ ——— آجاتی ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ ایک طرف تو ہم ایکٹنگ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم پروفیسر بنے ہوئے ہیں تو لوگوں سے یہ بات ہضم نہیں ہوتی اور میری پہچان ریڈیو ٹی وی ہے اور آج بھی جب سگنل پہ گاڑی کھڑی ہوتی ہے میری تو لوگ مجھے سلام کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔"

* "آپ اس فیلڈ میں آئیں کامیاب بھی ہو گئیں تو کیا خیال نہیں آیا کہ ماس کمیونکیشن میں بھی ڈگری حاصل کرلوں؟"

☆ "بالکل بھی خیال نہیں آیا' کیونکہ اس وقت تو ذہن میں یہی تھا کہ پروفیسر بننا ہے اور مجھے یونیورسٹی سے آفر بھی آگئی تھی۔ مگر نہیں تھا قسمت میں ریڈیو پاکستان میں اپلائی کیا اور پھر منتخب ہو گئی۔ گھر پر جب لیٹر آیا تو امی بہت خوش ہوئیں کہ جاب نہیں کرنا بس اپنا شوق پورا کرلو اور شوق پورا کرتے کرتے جنون اور پروفیشن بن گیا۔"

* "اگر آپ لیکچرار یا پروفیسر ہوتیں تو شاید پیسوں کے معاملے میں اتنی اسٹرگلنگ نہ ہوتیں؟"

☆ "میں نے پیسے کو تو کبھی زیادہ ترجیح دی ہی نہیں ابھی بھی کچھ ایسے لوگوں سے میری کمٹمنٹ ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ بجٹ ہے تو مجھے اندازہ ہوتا ہے ان کے بجٹ کا تو میں کبھی بھی ان سے بارگیننگ نہیں کرتی کہ ایک ٹیم کے ساتھ مجھے کام کرنا ہے اور انہوں نے کچھ سوچ کر ہی مجھے بلایا ہے اور ایسے میں میں کیوں اس بارے میں سوچوں کہ مجھے تین لاکھ مل جائیں یا 5 لاکھ مل جائیں۔ پیسے کو کبھی ایشو بنایا ہی نہیں ہے۔"

* "میاں صاحب کبھی رکاوٹ بنے؟"

☆ "نہیں بالکل نہیں۔ میاں صاحب دس سال پہلے میری زندگی میں آئے اور میرے ساتھ بہت کوآپریٹ کیا انہوں نے مجھے کبھی روکا ہی نہیں اور کہا کہ بے شک اپنا شوق پورا کرو مگر اپنی صحت کا بھی خیال رکھو' مارکیٹنگ بھی کرتی ہو اور رات بارہ سے لے کر صبح 4 بجے تک پروگرام بھی کرتی ___ صبح نو بجے میں آفس کے لیے نکل جاتی تھی۔ تو سب کہتے تھے کہ اپنی نیند تو پوری کرلیا کریں تو میں کہتی تھی کہ کام تو کام ہے نو بجے جاب کی کمٹمنٹ ہے تو 9 کا مطلب 9 ہی ہے۔"

* "اس الیکٹرونک دور میں جب انٹرنیٹ اور فیس بک نے تہلکہ مچایا ہوا ہے تو کیا ریڈیو سننے والوں کی تعداد ہے؟ اور کب سنتے ہیں؟"

☆ "میں سمجھتی ہوں کہ دنیا بھر میں ریڈیو سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور میں مارکیٹنگ میں ہوتے ہوئے جب اپنے کلائنٹ کو کینوس کرتی ہوں ائر ٹائم کے لیے تو کلائنٹ نہ صرف میری بات سنتے ہیں بلکہ بزنس بھی دیتے ہیں اور میں ان کو بتاتی ہوں کہ ایف ایم کی نشریات نے ہی لوگوں کو جگایا ہے اور آپ دیکھ لیں کہ آج کتنے ایف ایم کھل چکے ہیں اور ڈرائیونگ کے وقت ریڈیو سننے والوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے اور ریڈیو ٹریفک کے سلسلے میں لوگوں کو گائیڈ بھی کرتا ہے۔ ہاؤس وائف بہت شوق سے سنتی ہیں۔ ٹی وی کے پروگرام تو بیٹھ کر دیکھنے پڑتے ہیں جبکہ ریڈیو سننے کے ساتھ ساتھ آپ اپنے کام بھی کرسکتی ہیں اور ہر عمر کے لوگ ریڈیو شوق سے سنتے ہیں۔"

* "آپ نے ریڈیو پاکستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا' پھر ایف ایم 100 میں آگئیں تو ریڈیو پاکستان کے ہی ایف ایم 101 میں کیوں نہیں گئیں؟"

☆ "ایف ایم 101 بعد میں آیا' پہلے ایف ایم 100 آیا۔ مجھے بہت جگہ سے آفرز آئیں۔ لوگ پیسے کے چکر میں ادھر سے ادھر چلے جاتے ہیں مگر اس چیز کے حق میں نہیں ہوں۔ جگہ بنانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ نئی جگہ پر جا کر پھر اپنی جگہ بنانا مشکل ہوتا ہے تو

میرے ادارے کے لوگ بہت حیران ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اس ادارے کے ساتھ بہت وفادار ہیں کہ اتنی آفرز کے باوجود نہیں جاتیں۔ اگر انسان اپنے کام سے کام رکھے تو زندگی اچھی گزر جاتی ہے۔"

* "ورکنگ وومن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں گھر کے کاموں سے بالکل دلچسپی نہیں ہوتی تو کیا ایسا ہے؟"

☆ "ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں گھر میں کھانا خود پکاتی ہوں۔ اپنے کچن کا سارا کام اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی ہوں میں نے کوئی میڈ نہیں رکھی' امی بد دران لاء کی وجہ سے رکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد اب کوئی میڈ نہیں ہے' بلکہ امی بد دران لاء کی خدمت بھی ہم دونوں میاں بیوی نے کی۔ اب ہمارے گھر میں کوئی بزرگ نہیں ہے اور بزرگوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔"

* "مزاجاً" کیسی ہیں آپ؟"

☆ "یہ تو دوسرے ہی بتا سکیں گے لیکن جو مجھ سے ملتے ہیں بات کرتے ہیں وہ تو یہی کہتے ہیں کہ آپ بہت کوآپریٹو ہیں اور کسی کو مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے تو میں کبھی انکار نہیں کرتی۔ اکثر لوگ میرے پیسے لے کر بھاگ بھی جاتے ہیں تو میں یہی کہتی ہوں کہ جو میرے نصیب میں نہیں تھا وہ مجھے نہیں ملتا اور جو ملنا ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ مجھے سب منی بنک کہتے ہیں تو میں کہتی ہوں کہ بنک تو ریٹرن لیتا ہے مگر میں تو ریٹرن نہیں لیتی اور جہاں تک غصے کی بات ہے تو غصہ تو ایک فطری عمل ہے کوئی ہٹ کرے گا تو غصہ تو آئے گا مگر اتنا ضرور قابو میں ہونا چاہیے کہ دنیا آپ کا مذاق نہ بنائے یا آپ سے خوفزدہ ہو جائے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں سے لڑ رہی ہوتی ہیں غصے کا بھرپور اظہار کر رہی ہوتی ہیں تو میری یہ سوچ ہے کہ اتنے زیادہ غصے سے لڑکی پن یا عورت پن ختم ہو جاتا ہے۔ کنٹرول کرنا چاہیے اور میں کرتی ہوں۔"

* "زندگی کو کس انداز میں دیکھتی ہیں۔ کرائسس آئے؟"

☆ "زندگی ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے۔ کرائسس آئے اس لحاظ سے کہ ماں باپ جدا ہو گئے اور ان کی کمی کو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔ والد بہت جلدی جدا ہو گئے تھے تو ماں نے ہی ہم بہن بھائیوں کی پرورش کی اور اعلا تعلیم دلوائی۔ اب وہ بھی ہمارے درمیان

ہمیں ہیں تو زندگی بہت خالی خالی سی لگتی ہے۔"

* "اپنے پروگرام خود سنتی ہیں اور کبھی کسی نے آپ کی غلطی کی نشان دہی کی؟"

☆ "اپنے پروگرام پہلے سنتی تھی۔ مگر اب نہیں ہاں کبھی میرا ریکارڈ شدہ ہیلتھ شو پروگرام چل رہا ہو تو سن لیتی ہوں اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے میری غلطی کی نشان دہی کی ہو کیونکہ میں بہت ریسرچ ورک کے بعد پروگرام کرتی ہوں۔"

* "گانوں کی سلیکشن آپ کی اپنی ہوتی ہے اور کیا موڈ کے حساب سے لگاتی ہیں؟"

☆ "گانوں کا سلیکشن میرا اپنا ہوتا ہے اور موڈ کے حساب سے بھی لگاتی ہوں اور مجھے یہ بھی آئیڈیا ہوتا ہے کہ ہمارے سامعین کس قسم کی میوزک پسند کرتے ہیں میوزک بور ہو تو میرا خیال ہے کہ کوئی بھی سننا پسند نہیں کرتا۔"

* "کچھ مزید اپنے بارے میں بتائیں، مطلب ذاتی زندگی کے بارے میں؟ بہن بھائی ۔۔۔؟"

☆ "28 مارچ کو میرا جنم دن ہوتا ہے اور میرے میاں کی 23 مارچ ہے اور ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو وش کر رہے ہوتے ہیں اور وہ اپنی سالگرہ میری سالگرہ کے ساتھ مناتے ہیں، کہتے ہیں کہ پانچ دن کا تو فرق ہے اس لیے مل کر منائیں گے۔ ان کا نام سلیم ظہور ہے اور شوبز سے ہی ان کا تعلق ہے۔ وہ 3d animator ہیں اور بہت اچھے سنگر بھی ہیں اور میں ان کے شوز بھی آرگنائز کرتی ہوں۔ آرٹس کونسل میں اور کافی اچھا ریسپانس آتا ہے۔ یہی فیلڈ رہ گئی تھی جو شوہر کے آنے کے بعد اس میں بھی میں نے کام شروع کر دیا۔ اور ہم تین بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ میرے علاوہ میرا بھائی اس فیلڈ میں تھا جو ماڈلنگ کرتا تھا مگر اب اس نے اپنا بزنس شروع کیا ہے تو ماڈلنگ چھوڑ دی ہے۔"

* "آپ کو شوق نہیں گلوکاری کا ۔۔۔ یہی تو شعبہ رہ گیا ہے آزمانے کو کیا خیال ہے، باتھ روم سنگر تو ہوں گی آپ؟"

☆ "ارے نہیں باتھ روم سنگر سے زیادہ اچھی سنگر ہوں سلیم کہتے ہیں کہ میرے ساتھ تم بھی تیاری کر کے مل کر پروگرام کریں گے۔ ویسے مجھے شوق بہت ہے گلوکاری کا اور ان شاء اللہ اپنا یہ شوق ضرور پورا کروں گی۔"

* "شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اور بچے؟"

☆ "شادی کو 10 سال ہو گئے ہیں 11 اکتوبر 2003ء کو ہوئی ہماری شادی اور بچے نہیں ہیں ابھی تو ہم خود بچے ہیں ۔۔۔ خیر یہ تو اللہ اور بندے کا معاملہ ہے وہ جس کو نواز دے اللہ نے اس کے بدلے میں مجھے اتنا کچھ دیا ہوا ہے کہ جتنا شکر کروں کم ہے۔ میرے میاں صاحب اتنے اچھے اور کوآپریٹو ہیں کہ میں شکر کرتی ہوں سب کا، میں ان کو اکثر کہتی ہوں کہ آپ دوسری شادی کر لیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ایسا سوچنا بھی مت اور آئندہ تم نے ایسی بات کی تو پھر میں زندگی بھر کے لیے تم سے ناراض ہو جاؤں گا کیونکہ جتنی شیئر نہیں ہوتیں ان کے یہ الفاظ ہوتے ہیں۔"

* "اور کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟"

☆ "بہت کچھ آپ نے پوچھ لیا ۔۔۔ بس یہ ضرور لکھیے گا کہ میں FM-100 کی پہلی خاتون آر جے پریزنٹر ہوں اور مرد پریزنٹر میں پہلے آر جے اور پریزنٹر "آصف غزالی" ہیں اور ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ جو انسان بہت چوزی ہوتا ہے کہ مجھے یہ بھی مل جائے وہ بھی مل جائے وہ بندہ زندگی میں کسی سے بھی وفا نہیں کر پاتا تو بچیوں کے حوالے سے یہ بھی ضرور کہوں گی کہ اپنے ساتھی اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ ضرور وفا کریں تاکہ وہ زندگی بھر آپ کا ساتھ دے سکے۔"

* "ہمارے ڈائجسٹ آپ پڑھتی ہیں؟"

☆ "جی بہت شوق سے اور ۔۔۔ اپنے پروگرام کے لیے یہ میرے بہت کام آتے ہیں کیونکہ آپ کے ڈائجسٹوں میں بہت کارآمد تحریریں ہوتی ہیں۔"

"اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روبی درانی صاحبہ سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔"

☆☆ ☆☆

مُقابل ہے آئینہ

ظل ہما

س "آپ کا پورا نام اور پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج "ظل ہما حسنی۔"

س "آئینے نے آپ سے یا آپ نے کبھی آئینے سے کچھ کہا؟"

ج "ہی ہی ہی میں آئینہ بہت کم دیکھتی ہوں شاید کچھ کہتا ہو میں نے سنا نہیں۔ البتہ لوگ بہت کچھ کہتے ہیں۔"

س "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

ج "17 اگست 2008ء اور 24 دسمبر 2010ء سے 7 جنوری 2011ء یہ وہ لمحے تھے جنہوں نے زندگی کا رخ بدل دیا اور بہت سے اپنوں کی اصلیت کھولی۔"

س "محبت کے بارے میں خیال؟"

ج "محبت سراب مگر زندگی کا حاصل ہے، سانحہ ہے۔"

س "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

ج "ایم اے ایم ایڈ کہلانا، (ہنسیں مت) جاب حاصل کی، کچھ دوستوں میں اضافہ ہوا، کچھ کے اصل چہرے سامنے آ گئے۔"

س "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

ج "امید۔"

س "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج "یہ سب سے مشکل سوال لگ رہا ہے، کسی دوست نے کہا تھا۔"

تم محبت نہیں عقیدت ہو
میں تمہیں اختیار کر لوں کیا

س "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

ج "محبت اور اپنوں کو کھونے کا خوف، آنے والے وقت کا خوف اور اپنے گناہوں پہ ندامت اور خوف، پتا نہیں اللہ کا سامنا کیسے ہو گا؟"

س "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"

ج "میری کمزوری خلوص اور رشتے ہیں اور میری طاقت اللہ عزوجل پر اعتماد خواہ سب مجھ سے محبت نہ کریں وہ مجھ سے محبت کرتا رہے۔"

س "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج "مطالعہ کرنا میرا جنون ہے سو فارغ وقت کتب میں گزرتا ہے البتہ فیملی اور فرینڈز کے ساتھ بھی ٹائم اچھا گزرتا ہے خاص کر بکل کے ساتھ۔"

س "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

ج "بس اتنی کہ ضرورت پوری ہو سکے، خواہش ضرورت نہ بنے۔"

س "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج "گھر زندگی اور کائنات کا مرکز، عورت کی جنت اگر محبت عزت بھی ہو۔"

س "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج "اللہ کا کرم ہے کہ معاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی ہوں اور بھولنے کا انحصار حادثے اور

دشمنوں کی تو عیت رہے۔"

س "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج

وہ سفید پھولوں سی اک دعا ' میرے ساتھ ساتھ رہی سدا
یہ اسی کا فیض ہے بابا ' میں بکھر بکھر کے سنور گیا

س "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"

ج "میں اللہ کی رحمت کے بعد اپنی کامیابیوں کا کریڈٹ اپنی ماما اور ٹیچرز کو ہی دیتی ہوں' مجھے قدم قدم پہ ان کی دعاؤں اور محنت نے سنبھالا۔"

س "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

ج "کامیابی اللہ کی رحمت اور محنت کا حاصل جس میں دعائیں بھی شامل ہوتی ہیں۔"

س "سائنس نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر دیا ہے کیا؟"

ج "واقعی ہم بھی مشینوں میں ہی ڈھلتے جا رہے ہیں۔"

س "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج "عجیب خواہش تو یہ کہ ساری دنیا کی کتب میرے پاس ہوں اور خواب یہ کہ ہمارے ملک کا لٹریسی ریشو 100 ہو جائے۔"

س "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج "مجھے بارش بہت افسردہ کرتی ہے۔ سو میں کاغذ قلم لے کر دل کی بھڑاس نکالتی ہوں' کبھی شعر' کبھی افسانے کی صورت۔"

س "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

ج "ابھی تو ایک اسٹوڈنٹ ہوں' البتہ اگر جاب کے حوالے سے ہے تو اگر میں ٹیچر نہ ہوتی تو ڈاکٹر ہوتی کاش۔"

س "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

ج "جب میرے اردگرد سب اچھا ہو' میں کسی بک فیئر میں ہوں یا فرینڈز کے ساتھ ٹائم گزرے' تلاوت کے وقت۔"

س "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج "مجھے تعلیم' بلند کردار متاثر کرتا ہے جب کہ اکڑ اور نخرہ بالکل نہ ہو اور مجھے خوب صورت نام اور خوب صورت آنکھیں بھی پسند ہیں۔"

س "کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پا لیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

ج "مجھے وہ سب ملا جو میرے مولا کی چاہت تھی اور یقیناً" اللہ کی چاہت میری چاہت سے اچھی ہے سو کوئی دکھ یا پچھتاوا نہیں۔"

س "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

ج "اپنا خلوص اور معاف کرنے کی عادت مجھے پسند ہے اور خامیاں بہت سی ہیں مثلاً" وقت کی پابند نہیں' بھلکڑ ہوں اور آج کل کی خاص خامی ماما کے بقول کہ میں خود کو مین ٹین نہیں رکھتی یعنی رف حلیے میں رہتی ہوں۔"

س "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟"

ج "غصے میں کبھی ماما سے بدتمیزی کر جاؤں تو بہت شرمندگی ہوتی ہے۔"

س "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"

ج "بہت انجوائے کرتی ہوں اور اللہ کا کرم ہے کہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اول رہی ہوں۔ البتہ رشتوں میں مقابلہ نہیں کر سکتی' ہار جاتی ہوں۔"

س "متاثر کن کتاب مصنف مووی؟"

ج "عشق کا عین' مشین' قافلہ۔ علیم الحق حقی۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	ماریہ رضوی
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

میں مووی نہیں دیکھتی۔"

س "آپ کا غرور؟"

ج "اللہ کے سوا کسی پہ کامل بھروسہ نہیں' سو بدل جانے والی چیزوں پہ غرور کیسا۔"

س "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہو؟"

ج "جو شکست مجھے 24 دسمبر 2010ء کو ملی جس کی بنیاد 17 اگست 2008ء کو رکھی گئی تھی۔"

س "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی؟"

ج "میں حسد نہیں رشک کرتی ہوں اور ان جیسا بننا چاہتی ہوں۔"

س "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

ج "مطالعہ میرا جنون ہے' جس نے میری زندگی کو بہت سنوارا۔"

س "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے جو آپ اپنے علم تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

ج "صرف دعا اور محبت کام آتی ہے اور امید ختم ہونا موت کا دوسرا نام ہے۔"

س "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

ج "میری پسندیدہ شخصیت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم جیسے عام انسانوں میں محسن نقوی' ہٹلر' نیلسن منڈیلا اور عبدالستار ایدھی ہیں۔"

س "آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

ج "میرا سب سے پسندیدہ مقام لائبریری کے بعد مظفر آباد اور مالم جبہ ہیں۔ تھل اور تھر بھی انسپائر کرتے ہیں۔ فیصل آباد میں امین پور بازار پسند ہے۔"

☆ ☆

فرحانہ ناز ملک

سحرِ آرزو
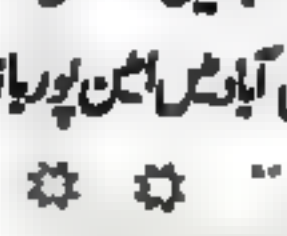
دُوسری قسط

شام میں خنکی کافی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ مگر پھر بھی جلال کو نہلایا گیا۔ وہ تو جب تک اسے نہلاتا رہا، عالم صاحب اس کے سر پر کھڑے رہے۔ شاید یہی وجہ تھی ہمیشہ جلال کو نہلانے کے معاملے میں آنا کانی کر جانے والے وہ تو نے آج رگڑ رگڑ کر اس کی کھال بھی چمکا دی تھی اور وہ تو اور خود عالم صاحب اپنے کپڑوں اور مقام کی پروا کیے بغیر کبھی اس کے شیمپو لگے بال مسلنے لگتے تو کبھی پیٹھ پر لگا صابن رگڑنے لگتے۔ جلال منٹوں میں نکھر گیا تھا۔

"اسے انگیٹھی کے سامنے جا بٹھاؤ میں وہیں آ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا تھا۔ وہ تو نہایت ادب و احترام کے ساتھ جلال کو وہیل چیئر کے ذریعے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ جہاں ابھی کچھ دیر قبل سحر سمیت وہ تو اور شاداں کی کلاس لگی تھی۔ کپڑے بدلنے کے بعد عالم صاحب فوراً جلال کے پاس آئے تھے۔ جسے وہ تو نے آتش دان سے قدرے فاصلے پر بچھے گدے پر تکیوں کے سہارے بٹھا دیا تھا۔ وہ بیٹے کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئے۔ جلال باپ کے لمس کو پہچانتا تھا۔ ان کی شفقت محسوس کر سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح باپ کی موجودگی ابھی بھی اس کے لیے سکون کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ان کی داڑھی سے کھیل رہا تھا تو کبھی ان کے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جو اپنے دماغ میں اس منظر کی کڑیاں ملانے میں لگے ہوئے تھے۔ جس نے کچھ لمحوں کے لیے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود کر دی تھیں۔

وہ پیدائشی مفلوج و اپاہج تھا۔ نہ بول سکتا تھا' نہ حرکت کرسکتا تھا۔ اپنی ہر ضرورت کے لیے دوسروں کا محتاج تھا۔ دتو کی یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت اور خیال رکھنے پر مامور رہے گا۔ آج نہ جانے وہ کیسے غافل رہ گیا۔ جلال کے جسم میں کوئی طاقت نہیں تھی۔ وہ ایک جگہ گھٹنوں' اپنے دھڑ اور سر کو سنبھال کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بغیر سہارے کے اسے بٹھا دیا جاتا تو کچھ دیر کے بعد وہ غیر متوازن ہوجاتا اور اس کا سر زمین سے جا ٹکراتا اور اب نہ جانے وہ کس وقت سے بندھا پڑا ہوگا۔ نہ جانے کتنی ہی بار اس کا سر زمین سے ٹکرایا ہوگا کہ ماتھے پر ہلکا سا نشان بن گیا تھا۔

وہ اور طلال جب گھر میں داخل ہوئے تھے تب مغرب ہورہی تھی اور شدید ٹھنڈ بھی۔ دھوپ میں تپے جلال کو یہ ٹھنڈ کتنا بے سکون کررہی ہوگی' سوچ کر ہی ان کے پیٹ میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ منٹ منٹ بعد وہ اپنے کپڑے ناپاک کردیتا تھا اور اب صبح سے مغرب تک بندھے رہنے کی وجہ سے نہ جانے کتنی بار اس کے کپڑے گیلے ہوئے ہوں گے اور مغرب تک بہت ٹھنڈے بھی ہوگئے ہوں گے۔ عالم صاحب جتنا سوچتے جارہے تھے اتنا ہی فشار خون بڑھتا جارہا تھا۔ اس سب کے پیچھے سحر تھی' یہ واضح تھا۔ مگر نہ جانے کیوں تھی' کیوں ایک لاچار محتاج کے لیے قہر کا باعث بنی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔

"کھانا لے آؤ اس کے لیے۔" انھوں نے کب سے بت بنے کھڑے دتو میں گویا جان بھری۔ وہ آنا" فانا" کھانا لے آیا۔ عالم خان اپنے ہاتھوں سے اسے کھلانے لگے۔ وہ چباتا کم' اگلتا زیادہ' بری طرح سے بہتی رال دتو جیسے کو بھی گھن دلا دیا کرتی تھی' لیکن وہ بنا تردد کے ہر نوالے پہ اس کا منہ پونچھتے اور پھر دوسرا دیتے۔

آج ان کی وجہ سے جلال کے سب کام صفائی کے دائرے میں ہورہے تھے۔ ورنہ تو دتو جیسے بنا ہاتھ لگائے بس پانی ڈال ڈال کر نہلاتا' ایسے ہی کھانا بھی کھلاتا۔ ایک نوالہ وہ اگلتا نہیں دوسرا منہ میں ڈال دیتا۔ سارے دن کی اس کی صفائی بھی اوپرے دل سے کرتا۔ نتیجتاً" اس کے وجود میں ایک مستقل باس رچ بس گئی تھی۔ جو دور سے بھی محسوس ہوتی۔ عالم صاحب کے لیے ابھی ابھی سوچ کے نئے اور پریشان کن در وا ہوئے۔

"مجھے کچھ ہوگیا تو۔ میں مرگیا تو۔ اس کا کیا ہوگا؟" انھیں چکر سے آگئے تھے۔

ان کی موجودگی میں اسے زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا' بعد میں تو۔ آگے کی سوچ انھیں تھرا گئی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا سحر کو کڑی سے کڑی سزا دے ڈالیں۔ اگر ہوتی وہ پہلی سی آن بان اور سحر اس حرکت کا ارتکاب کرتی تو انھوں نے اسے طلاق دلوانے میں دوسری بار سوچنا بھی نہیں تھا' لیکن وہ جاہ و جلال۔ وہ شان و شوکت اپنے ہاتھوں مٹی میں ملا چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ان کی ہستی ہی مٹ گئی تھی۔ ہاتھی مرنے پر بھی لاکھوں کا ہوتا ہے۔ انھیں بھی زوال کی طرف جانے میں کچھ وقت تھا۔

جائیداد کے نام پر جو چند سکے ان کی مٹھی میں تھے' وہی انھیں معتبر بنانے کے لیے کافی تھے۔ یعنی ان کی موجودگی میں جلال کے ساتھ ایسا دوبارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اتنا انھیں یقین تھا۔

☼ ☼ ☼

"سحر تمہارا دماغ خراب تھا؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟" اندر بند کمرے میں طلال کے ہاتھوں سحر کی گوشمالی ہورہی تھی۔

"طلال صاحب ایک حد ہوتی ہے اور وہ میری ختم ہوگئی ہے۔ میں تھک گئی اس اپاہج کی خدمت کرکر کے' منٹ منٹ بعد جس کو صاف کرنا پڑے۔" سحر کو عالم صاحب کی طرف سے جو ڈوز ڈانٹ کی مل چکی تھی۔ اس کے بعد

اسے دو روز لگنے تھے نارمل ہونے میں' ابھی بھی بھڑک کر بولی تھی۔

"تو تم تو نہیں کرتی ہو نا' دتو کرتا ہے اور صفائی بھی کنیز کرجاتی ہے۔"

"کرنے والے بھی انسان ہیں۔ دن میں ایک بار کرسکتے ہیں' چار بار نہیں اور کنیز صرف صبح کے وقت آتی ہے اور جیسی وہ صفائی کرتی ہے وہ بھی سب کو نظر آتی ہے۔ لوگ گھر میں داخل بعد میں ہوتے ہیں اس اپاہج کی وجہ سے بو ان تک پہلے پہنچتی ہے۔ کنیز اس بو کا توڑ کرنے سے قاصر ہے' پورے گھر میں رچ چکی ہے۔ حتیٰ کہ مجھ میں آپ میں اور سجاول میں بھی۔ کل امی بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ تمہارے گھر کی بو ہمیں اپنے گھر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ الٹی آتی ہے تمہارے گھر آنے سے۔" سحر بولنے پر آئی تو بولتی گئی۔ طلال دانت پہ دانت جمائے خاموشی سے سنتا رہا۔

"اور جیسا دتو اس کو صاف کرتا ہے۔ وہ بھی سب کو نظر آتا ہے۔ اس کا بھی قصور نہیں' کون سارا دن پڑا گند صاف کرے۔"

"تم نے اس کو کیوں باندھا۔ مجھے صرف یہ جواب چاہیے۔"

"بس مجھے غصہ آگیا تھا۔ پرسوں امی اور بھابیاں آئی تھیں۔ دتو اس کو نہلا دھلا کر اسی کمرے میں لے آیا جہاں ہم بیٹھے تھے۔ سجاول بھی اس کے آس پاس منڈلا رہا تھا' پانچ منٹ ہوئے نہیں' اس نے پھر کپڑے خراب کرلیے۔ اس کی گندگی میں سجاول کا بھی حشر ہوگیا۔"

"تو یہ کون سی ایسی ناقابل گرفت حرکت تھی کہ تم انسانیت سے نیچے گر جاتیں۔ بابا کا غصہ اب جاتے جاتے جائے گا۔"

طلال کی تشویش بے وجہ کی نہیں تھی۔ سحر جانتی تھی عالم خان کو' یہ بات شاید ہی کبھی بھولے اور اگر جو انھیں یہ معلوم ہوجائے کہ سحر آج نہیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن جلال کو باندھ کر رکھتی ہے تو شاید وہ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالیں۔ آج جس قہر کے ساتھ وہ ایک ایک پر برسے تھے' انھیں ایک لمحے کو تو گمان بھی گزرا تھا کہ آج کا دن اس گھر میں آخری دن نہ ہو' عالم صاحب کی پرجلال زبان نے گھر کے ہر فرد کو روند ڈالا تھا۔

"میں تھک گئی ہوں طلال۔ شادی کے بعد سے اسے سہہ رہی ہوں۔"

"سحر۔" طلال جھنجلاہٹ کا شکار ہوگیا تھا۔

"کہتے ہیں اپاہج ہے' گونگا ہے' اللہ لوک ہے' کوئی بات نہیں' خیر ہے' ارے اللہ لوک کو کھانے پینے کی سمجھ

بوجھ ہے یہ بڑے بڑے لوالے ڈکار جاتا ہے۔"

"تم چپ کروگی؟" طلال کی بلند آواز نے سحر کی زبان کو بریک لگایا تھا۔ وہ دانت پیستی چپ تو ہو گئی لیکن سوچنے پر طلال کا کیسا پہرہ۔ جلے اور بھرے دل کے ساتھ وہ سوچنے لگی تھی۔

"لوگ کہتے ہی ایسے بچے زیادہ زندہ نہیں رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین سال یا پانچ سال یا بہت ہو گئے تو نو سال۔ اور یہ سولہ سال سے ہم پر عذاب کی طرح مسلط ہے' ہٹا کٹا' پیدا ہوتے وقت ماں کو کھایا اور اب لگتا ہے ہم سب کو بھی چٹ کرے گا تب مرے گا۔"

✡ ✡ ✡

گاڑی کی خاموش فضا میں ہلکا سا ارتعاش پھیلا جب اویس نے "کچن کوزین" کے سامنے بریک لگائے۔ کب سے چپ بیٹھی تحریم نے یوں گاڑی رو کنے پہ شدید کوفت کے ساتھ اسے دیکھا تھا یعنی کہ مزید دیر ہونی تھی۔

"آ تا ہوں' نویا آپ کو کچھ چاہیے؟" وہ پہلے اس سے اور پھر سیل فون پہ مگن نویا سے مخاطب ہوا اور اس کے نفی میں سر ہلانے پر تیز روی کے ساتھ بیکری میں گھس گیا۔ تحریم کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی' وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ حسب توقع اس کی واپسی ٹھیک ٹھاک سامان کے ساتھ ہوئی تھی۔ مٹھائی' کیک اور بھی کافی کچھ۔

"یار بس۔" تحریم کی طیش زدہ نظروں سے خائف ہوا' وہ کندھے اچکا تا صفائی دینے لگا۔ "سمجھا کرو نا' ایسے زیادہ اچھے لگیں گے۔" تحریم ہنوز ناراضی وخفگی سے اسے دیکھتی رہی۔

"اصل میں تو یہ سب تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ نیاز کو بھیج کر کچھ بھی سہی مگر منگوا ضرور لیتیں۔" اس نے ملازم کا نام لیا تھا۔

"اصل میں تو۔ میں جانے کے حق میں ہی نہیں تھی۔" بالکل اسی کے انداز میں وہ تنکی سے بولی تھی۔

"اور پھر مجھے آپ جناب کی دریا دلی کا اندازہ تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی ایسی کوئی فکر پالنے کی جب آپ ہیں۔" اس کے طنزیہ لب و لہجے پہ وہ گہری سانس لیتا اسے کیا کہہ کر رام کرے سوچنے لگا تھا۔

"یار ہنی۔ کہتے ہیں نا۔ اچھے کام کی ابتدا اچھے سے ہونی چاہیے۔" اس نے ماحول کی کثافت دور کرنی چاہی۔ تحریم مزید بھڑک اٹھی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیکری اٹھا لے جاؤ؟" اس کا اشارہ بھرے بھرے شاپرز کی طرف تھا۔ اویس کو گمان تھا اس کو یہ بھی کھٹک رہے ہوں گے' عجیب تنگ دل ہو رہی تھی وہ۔

"یار پلیز۔ کیوں اتنا ہائپر ہو رہی ہو' ایسا کیا کر دیا میں نے۔"

"اچھا تو کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟" وہ جیسے آپے سے باہر ہونے لگی تھی۔

"میں بھی تمہیں ایسے ارجنٹ بلانا چاہوں تو تمہاری ہزار مصروفیات اور آج تم اسپیشلی ——— لیے لیے کر جا رہے ہو۔ اتنا انٹرسٹ کیوں؟"

"صرف تمہاری وجہ سے۔" اویس کو پہلی بار بچوں کے ہمراہ موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے تحمل سے کہا۔ مگر اب تحریم کی زبان کے آگے بند باندھنا مشکل تھا۔ اس نے اپنی بھڑاس نکال کر چپ ہونا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا تم بھاگے آؤ؟" وہ بخشنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اویس نے بے ساختہ اسٹیئرنگ وہیل پہ ہلکے سے ہاتھ مار کر خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے کب۔"

"مما پلیز۔" اور نویا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ سیل سیٹ پر پٹخ کر وہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔

"چپ ہو جائیں آپ دونوں' فار گاڈ سیک۔" اویس نے ہونٹ بھینچ کر اسے جلاتی نظروں سے گھورا۔ وہ خراب موڈ لیے شیشے سے پار دیکھنے لگی تھی اور تمام راستہ ایسے ہی خراب موڈ لیے رہی۔

✡ ✡ ✡

ناشتے سے فراغت کے بعد اماں کمرے میں چلی گئی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد سے انہیں نیند کی کمی کا مسئلہ ہو رہا تھا۔ وہ رات ساری جاگتیں اور اس وقت آرام کرنے کی غرض سے لیٹ جاتیں۔ گو کہ نیند ابھی بھی نہ آئی۔ ان کے جانے کے بعد جمیلہ صفائی میں جت گئی تھی۔ عقیدت لاؤنج میں کھلتی سیڑھیوں پر بیٹھی اسے صفائی کی غرض سے اندر باہر آتا جاتا دیکھتی رہی۔ جمیلہ نے اسے ٹوکا بھی تھا۔

"بلی یہاں نہ بیٹھو۔ سیڑھیاں ٹھنڈی ہیں۔" مگر وہ ان سنی کیے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ جمیلہ کے ہاتھوں پورا گھر چمک گیا۔ اب وہ صابن سے رگڑ رگڑ کر خود کو چمکا رہی تھی۔ ہاتھ' منہ' پاؤں دھوتی جمیلہ پر اس کی نظریں ساکت ہو گئی تھیں۔

"کیا ہے بلی۔ مجھے نظر لگاؤ گی کیا؟" اس کی نظروں کے ارتکاز نے جمیلہ کو متوجہ کر لیا۔ وہ شرارت سے بولی تھی۔ عقیدت کی نظروں کا زاویہ پھر بھی نہ بدلا۔ یہاں تک کہ جمیلہ بھی چمک گئی۔ اب بال سنوارنے کی باری تھی۔ تیل' شیشہ' کنگھا دہیں لاؤنج میں بچھے کارپٹ پر رکھے۔ اس نے پہلے بال سلجھائے' پھر کس کس کر اپنی چٹیا گوندھی اور آخر میں فیئر اینڈ لولی کے دو کوٹ لگانے کے بعد آنکھوں میں کاجل ڈالا۔ جمیلہ تیار تھی روزانہ کی طرح۔

"کیا ہے بلی۔ ایسے منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو؟" وہ شیشہ' کنگھا رکھ کر آئی عقیدت تب بھی ایسی ہی بیٹھی تھی۔

"پچی دل ڈر رہا ہے تمہاری چپ سے۔ ایسی شکل بنا رکھی ہے جیسے بیٹیاں ماں' باپ کے گھر سے وداع ہوتی ہیں۔ چل نا' موڈ سیدھا کر' اچھی بھلی شکل سڑا ہوا آم لگ رہی ہے۔ اچھا باجی سے کہتے ہیں آج ہمیں شالا مار باغ' مینار پاکستان یا شاہی قلعہ گھما لائیں۔ میں کبوں کی تم یہاں میں ہاں ملانا۔ پھر تو تیری پڑھائی شروع ہو جانی ہے۔ کہاں موقع ملے گا۔" وہ بھی اس کے پاس سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔ عقیدت نے ایسے کوئی شوق نہیں پال رکھے تھے اور نہ ہی اتنے ڈپریسنگ موڈ کے ساتھ وہ کہیں سیر کرنے کا سوچ سکتی تھی۔ جب تک کہ کالج میں حاضری نہ لگوا لیتی۔

"تو تو ہے ہی آدم بے زار۔ تیرے سے ایسی کوئی امید بھی بے کار ہے۔" جمیلہ نے منہ بنا کر کہا۔ پھر کچھ سوچ کر جوش سے اس کی طرف رخ کیا۔

"اچھا ادھر منہ کر۔" اس نے کہا اور پکڑ کر عقیدت کا چہرہ اپنی طرف موڑا' خوب جانچا' پھر کچھ سمجھ کر سر ہلاتی اسٹور میں گھس گئی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں دھاگے کی ٹکی تھی۔

"بھنویں تو تمہاری بنی بنائی ہیں۔ ان کو ہاتھ لگانا بھی ٹھیک نہیں۔ ہاں مونچھیں مردانہ ہو رہی ہیں۔ ان کو اکھڑوا لو' نہیں تو کالج میں مذاق بن جاؤ گی۔" اس کا اشارہ اپر لپس کی طرف تھا۔ ہاتھ اور منہ میں دھاگہ پکڑتی وہ عقیدت کو دہلا ہی گئی۔

"نہیں۔" قدرے زور سے کہتی عقیدت اس سے پرے کھسکی تھی۔

"ارے کرون۔ یہ تھوڑی پھیر رہی ہوں۔ ایسی پیلی سرسوں ہو گئی۔ چل ادھر منہ کر۔ زمانہ کہاں کا کہاں پہنچ گیا ہے اور تو تھریڈنگ کرواتے کانپ رہی ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں کروانا۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" اس نے گھبرا کر اماں کے کمرے کی طرف دیکھا تھا۔ جمیلہ بھی

اماں سے ڈر رہی ہے۔

"اوہو باجی کچھ نہیں کہیں گی۔ انہیں بھی آج کے فیشنوں کا پتا ہے۔ تو بس جیسا میں کہوں ویسا ماسٹر بنانا۔ جا۔ وہ مفت بھی نہیں لگیں گے۔" جمیلہ کسی آفت کی طرح اس کے سر پر سوار ہونے لگی تھی۔

"مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا۔" وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی، ہلکا سا چیخی تو جمیلہ کو منہ پھلا کر پیچھے ہونا پڑا۔

"جاؤ گی تب پتا لگے گا کیسے کیسے فیشن کیے ہوں گے سب نے۔ تو توان میں "گوا چی گاں" لگ رہی ہوگی۔ یہ دیکھنا یہی منہ لے کر آؤ گی میرے پاس۔ تھریڈنگ کروانے۔ اور نہیں تو کیا۔" جمیلہ کا مشن ناکام ہو چکا تھا۔ وہ دھاگہ واپس جگہ پر رکھ آئی کہ اماں کو کسی بھی چیز کا یہاں وہاں ہو جانا سخت ناپسند تھا اور جمیلہ ان کے اس کہے پر پوری طرح عمل کرتی تھی۔

"اچھا۔ یہ تو بتا دے آج کیا پکاؤں؟" جمیلہ کی بڑی اچھی سی سامع اماں تھیں۔ وہ جتنا اور جو جو بولتی اماں سنتیں بھی۔ بیچ بیچ میں لقمے بھی دیتیں، ڈانٹتیں اور فلک شگاف قہقہے لگانا بھی ضروری سمجھتیں۔ جمیلہ کو ایسی کوئی امید عقیدت سے تھی تو نہیں، مگر وہ پھر بھی بول رہی تھی۔ کہیں نہ کہیں وہ عقیدت کا موڈ بھی بدلنا چاہ رہی تھی۔ جس پر اس کی طرح نہ تو لاہور شہر کا نقشہ چھپا تھا اور نہ ہی وہ کالج جانے کی مشتاق ہو رہی تھی، بلکہ کالج تو کسی ہوا کی طرح لگ رہا تھا۔ جہاں جب تک حاضری نہ لگوا آتی ایسے ہی دہشت زدہ سی رہتی۔

"مجبور مرضی پکالو۔" عقیدت کا جواب توقع کے عین مطابق ملا تھا۔

"اور جب مرضی کا پکاؤں تم کھاتی نہیں ہو۔" جمیلہ کچن سے پیاز، لہسن کی ٹوکری اور چھری لے آئی تھی اور اب کارپٹ پر پھسکڑا مارے چھیلنے میں لگی تھی۔

"مرغی پکاؤں تم بوٹی بھی نہیں چکھتیں، سبزی تمہیں پسند نہیں۔ قیمے سے تمہیں الٹی آتی ہے۔ باقی بچتا ہے دال چاول، وہی بنا لیتی ہوں۔" "اور بیشتر اس کے کہ عقیدت دال چاول پہ ہاں کی مہر لگاتی گیٹ دھڑ دھڑایا، جمیلہ نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"باجی سے کہتی ہوں گھنٹی ٹھیک کروانے کی کریں۔ بجانے والے گیٹ کھڑکانے پر آجاتے ہیں۔ ساری جان کانپ جاتی ہے جب بجتا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی گیٹ تک آئی۔ گیٹ کھولا اور منہ کھول کر رہ گئی۔ سامنے باجی کے ہی جیسی حسین، ان کے نقوش چرائے۔ تحریم کھڑی تھی۔ مگر بے حد ناراض ناراض سی۔

☼ ☼ ☼

اتنے سارے افراد کی موجودگی میں بھی لاؤنج میں ایسا ہول سناٹا۔ اویس نے پہلو بدل کر سب کی طرف دیکھنے کے بعد عقیدت پر نظریں جمائی تھیں۔ ان کی آواز پر خوش گوار حیرت و بے یقینی میں مبتلا ہو جانے والی عقیدت اس وقت ستا ہوا چہرہ لیے ان سے قدرے دور۔ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں دکھ اور رنجیدگی کے سائے تھے۔ ابھی کچھ دیر قبل۔ انہیں دیکھتے ہی جمیلہ کی زوردار چیخ نما پکار "تحریم باجی آگئی ہیں" پر اماں اور عقیدت دونوں وہیں آگئی تھیں۔ عقیدت حیرت و بے یقینی کا شکار ہوئی، انہیں دیکھتی رہی تھی، اماں بھی۔ پہلے تو کچھ دیر بے یقین رہیں، چند ثانیوں تک تحریم کو محض دیکھتی رہیں۔ پھر اس والہانہ پن سے گلے ملیں کہ ایک پل کے لیے تحریم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں مگر صرف ایک پل کے لیے۔ اماں اسے کتنی ہی دیر تک لپٹائے رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ وہ ضبط سے کام لے رہی تھیں۔ پھر بھی ان کے چہرے پر درد کی کیفیت تھی۔

اماں کی لگاوٹ کے جواب میں بظاہر نارمل نظر آنے والی تحریم نے عقیدت سے محض ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا

تھا۔ وہ جو جھجکتی، شرماتی اس سے گلے ملنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ جمیلہ کے حصے میں یہ ہاتھ ملانا بھی نہ آسکا۔ بلکہ اس کی طرف تو تحریم نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا شاید۔ اماں اور عقیدت کے لیے کسی اپنے کا درجہ رکھنے والی تحریم کے اس رویے سے گویا اوقات میں واپس آگئی۔ بڑی شرمندہ شرمندہ سی وہ ان سب کے بیچ سے دور ہوئی تھی۔ اماں نے زویا کو بھی اسی محبت سے گلے لگایا تھا۔ مگر وہ بے تاثر ہی رہی۔ لاؤنج میں آنے کے بعد عقیدت نہ جانے کس جذبے سے لبریز حاذق کی طرف بڑھ رہی تھی کہ تحریم کی تیز اور سخت آواز نے قدم جکڑ لیے۔

"اسے مت اٹھانا۔" عقیدت سہم کر وہیں تھم گئی تھی۔ "نیند خراب ہو جائے گی اس کی۔" اس کا لب و لہجہ کیا عیاں کر رہا تھا؟ عقیدت سمجھی یا نہیں۔ اماں کا دل کٹ کر رہ گیا۔ عقیدت بیٹھ گئی۔ لیٹے حاذق پر دوسری نظر ڈالے بنا سیڑھیوں پر جا بیٹھی تھی۔ اداس اور بے حد رنجیدہ۔ اویس کو ایک پل کے لیے تو گمان گزرا جیسے وہ بیمار تو نہیں۔ انتہائی زرد رو۔ اور کمزور۔ وہ زویا سے چار سال تو بڑی تھی۔ مگر حیرت انگیز حد تک زویا اس سے بڑی لگ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک مستقل اداسی ڈیرہ ڈالے ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں کہ اسے زندگی میں کیا کیا گیا ہے۔

اویس کو رہ رہ کر تحریم کا رویہ کھل رہا تھا۔ اس نے جس طرح سے حلق پھاڑ کر عقیدت کو حاذق کے قریب جانے سے روکا تھا۔ اس کے بعد اسے جرأت نہیں ہوئی تھی۔ حاذق کو اٹھانے کی یا اسے دیکھنے کی بھی۔ بلکہ وہ تو ان سب کے بیچ بھی کہیں نہیں بیٹھی تھی۔ اویس کو اندازہ تھا تحریم ایسا ہی کوئی گل کھلائے گی، لیکن اتنا اوور ری ایکٹ کر جائے گی یہ نہیں پتا تھا۔

اور کب سے تحریم کو مرکز نگاہ بنائے جمیلہ کی تو جیسے پتلیاں ہی ساکت ہو گئی تھیں۔ "وہ یقیناً" اماں کی جوانی کا عکس تھی۔ ویسی ہی حسین اور اتنی ہی پر غرور بھی۔ اپنی شکل سے ہٹ کر وہ اماں کی بیٹی ذرا بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اماں اکثر تحریم۔ تحریم کرتی تھیں۔ اس کی عادتیں، اس کا بچپن، اس کی شرارتیں۔ کیا کچھ نہیں یاد کرتی تھیں۔ سن کر جمیلہ کی ذہن میں عقیدت جیسی ہی دوسری تصویر بن جاتی۔ مگر یہ تو عقیدت جیسی شکل کیا اس کی بہن بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اوپر سے مستزاد بے حد ماڈ اور اسٹائلش بالکل ٹی وی پہ نظر آنے والیوں جیسی۔ اس نے دوپٹے کا تکلف نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کی لمبی قمیص پیروں تک آرہی تھی۔ زویا نے بھی جینز پر ٹاپ پہن رکھا تھا اور جمیلہ مرعوب ہوئی۔ سوچ رہی تھی۔ عقیدت ابھی ابھی اس سے اپر پسند بنوانے پر ناراض ہو رہی تھی۔

دو بہنوں میں ایسا اور اتنا زیادہ تضاد اس سے ہضم ——— نہیں ہو رہا تھا۔

"ویل۔" اماں شاید کسی مجرمانہ خاموشی کی زد میں تھیں۔ چہرے پر عجیب پھیکا پن آگیا تھا۔ کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہ جانے کب آئیں۔ تحریم نے خود بات کرنے کا آغاز کیا۔ اس کے ماتھے کی شکنوں سے معلوم ہو رہا تھا وہ کچھ الگ ہی طریقے سے خوش آمدید کہنے جا رہی ہے۔

"بھائی کو پتا ہے آپ کے یہاں آنے کا۔" اس نے خود سے بڑے شہوار کا ذکر کیا تھا۔ اماں کے چہرے کی بے رونقی مزید بڑھی تھی۔ وہ حقیقتاً گڑبڑائی تھیں۔

"آ۔ نہیں۔ میں نے سوچا بعد میں بتا دوں گی۔"

"گریٹ۔" تحریم نے گویا مسخر اڑایا۔

"کیا کہنے آپ کی سوچ کے۔ آپ نے میرے لیے نہیں سوچا۔ آپ نے اپنے لیے نہیں سوچا۔ اور آپ نے صرف اس کا سوچا۔" وہ زہر خند ہو رہی تھی۔ اس کا اشارہ عقیدت کی طرف تھا۔ اماں اور اویس دونوں نے با آسانی سمجھ لیا۔

"کس بہادری کے ساتھ آپ یہاں اٹھ آئیں' نہ پوچھا' نہ بتایا' کوئی فون کال نہیں' ایک میسج بھی نہیں ہو سکا۔ آپ سے اور آپ آ گئیں۔" تحریم شروع ہو چکی تھی۔ اویس کو بے چینی گھیرنے لگی۔ کم از کم آج کے دن وہ اپنے گلے شکووں کو ٹال لیتی تو کیا ہو جاتا۔ آج وہ ان کو اپنے شہر میں ویلکم کہنے آئے تھے۔ سو ویلکم ہی کہتے۔ مگر وہ تحریم ہی کیا جو دل کی دل میں رکھنا سیکھے۔

"میں تمہیں سرپرائز کرنا چاہتی تھی گڑیا۔" اماں کا چہرہ آہستہ آہستہ تاریک پڑنے لگا تھا۔

"آپ نے واقعی سرپرائز کیا۔ آپ نے مجھے زندگی کے ہر موڑ پر سرپرائز کیا۔" وہ لفظ چبا رہی تھی۔ اویس نے محسوس کیا چائے کا کپ تھامے اماں کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔

"اصل میں۔ عقیدت کا میرٹ بن گیا تھا۔ میں لاہور کے کسی کالج میں تو۔"

"یہ بھی اپنے آپ میں ایک شاکنگ سرپرائز ہے۔ جس نے تمام زندگی کسی اسکول' کالج کا منہ نہیں دیکھا۔ وہ بھی سیدھی سیدھی میڈیکل کالج جا رہی ہے۔ ہاؤ جینئس اینڈ لکی شی از۔" اویس کا دل کر رہا تھا یا تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے' یا پھر یہاں سے لے کر چلتا بنے۔ مگر دونوں ہی کام ناممکن تھے۔ وہ یوں بیچ میں بولتا تو تحریم کا ری ایکشن الگ سمت اختیار کر لیتا اور چپ رہنے میں اسے خود کو تکلیف ہو رہی تھی۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔

"ماما۔ ہم گھر چلیں؟" یہاں زویا کی دلچسپی کا سامان نہیں تھا۔ پہلے سے بور ہوتی ماں اور نانی کی گفتگو سے مزید اوب گئی۔ اس نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا تو اماں پریشان ہو گئیں۔

"ابھی سے کیوں بیٹا۔ ابھی ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔ ابھی تو آئے ہو۔ میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ یہ کیا بات ہوئی۔" مگر تحریم کھڑی ہو گئی تھی۔

"آپ جانتی ہیں ہمارا ایک سوشل سرکل ہے۔ ہماری ایک الگ لائف ہے۔" وہ اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جو سمجھانا چاہ رہی تھی۔ وہ اماں بخوبی سمجھ گئیں۔

"یہ سب مجھے بہت عزیز ہے اور میں اس سب کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ امید ہے آپ۔"

"عقیدت۔" تحریم آگے بھی نہ جانے کیا کہتی کہ اویس کی آواز نے اسے فوراً "چپ کرا دیا۔

"گڑیا تمہیں کوئی پرابلم ہو' کسی بھی قسم کی ہیلپ چاہیے تو مجھے ضرور بتانا۔ مجھے خوشی ہوگی تمہارے کام آ کے۔" یہ ان کی آمد کے بعد سے پہلی بات تھی۔ جس نے عقیدت کو ہونق تو اماں کو توانا کر دیا۔ عقیدت' اماں اور تحریم کی باتوں سے بے جان ہوئی بیٹھی تھی کہ اویس کے اس ہمدرد اور نرم لہجے نے بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہ کیا۔ وہ ہونق سی ہو گئی تھی۔

"چلتے ہیں۔" تحریم نے گویا زہر اگلا تھا۔ اویس جانتا تھا اس کی آنکھیں شرارے چھوڑ رہی ہیں۔ سو بنا اس کی طرف دیکھے اماں اور عقیدت کو خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔ جمیلہ گیٹ کھولنے کے لیے فوراً "پیچھے لپکی تھی۔ آج ان کی چندھیائی گاڑی نے گھر کے گیراج کی شان ہی اور کر دی تھی۔

"میرے آنے سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی' بے سکون مت ہونا۔" اماں نے تحریم سے گلے ملتے وقت کہا تھا۔ وہ نروٹھی سی شکل بنائے عقیدت سے ہاتھ ملانے کی فارمیلٹی نبھانے کی ضرورت سمجھے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ اماں گیٹ تک انہیں الوداع کہنے گئی تھیں۔ عقیدت وہیں لاؤنج میں جمی رہی۔ خالی الذہن اور خالی آنکھوں کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

کسی بھی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لینے سے قبل اس نے ڈاکٹر شمسی سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"میرے خیال میں۔ مسز زکریا کو علاج سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اپنے رویے سے انہیں بتاؤ کہ تم ان سے بے حد محبت کرتے ہو۔ وہ کسی کمی کا شکار لگتی ہیں۔"

"کمی۔"

"کمی صرف پیسے کی ہی معنی نہیں رکھتی۔ محبتوں کی کمی بھی ذہنی امراض کا باعث بن جاتی ہے۔ انسان خودکشی کرنے پر آ سکتا ہے اور یہ بہت زیادہ حساس لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میرا جہاں تک تجربہ ہے تمہاری ممی بے حد حساس ہیں۔ کہیں نہ کہیں وہ بے توجہی کا شکار ہیں۔ تمہاری طرف سے' زکریا کی طرف سے۔ ان کا علاج ضرور کرواؤ۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنی محبت اور توجہ بھی دو۔ ان کے لیے بہترین علاج یہی ہوگا۔"

ڈاکٹر شمسی کی بات سے اسے انکار نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ کلینک سے باہر تک اپنے آپ سے گویا لڑتے گیا تھا۔

"ہمارے گھر میں توجہ اور محبت دی کس کو گئی ہے ڈاکٹر صاحب۔!!!" وہ اپنی مرسڈیز غیر متعلقہ راستے پر ڈالتے ہوئے خود ترسی سے سوچے گیا۔

"محبت اور توجہ کی خواہش ہوتی کسے نہیں ہے۔ ماں باپ کو اولاد سے۔ اور اولاد کو ماں باپ سے۔ اگر میرے باپ کی بے توجہی میری ماں کو ان حالات تک لانے کا باعث بن سکتی ہے۔ تو انہیں کب اور کیسے معلوم ہو کہ ماں باپ کی لاتعلقی' بے توجہی بھی اولاد کے لیے ناسور جیسی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا بچپن تباہ و برباد کر سکتی ہے' اس کے مستقبل کے آگے سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ اس کی پوری شخصیت میں خلا پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے کسی کی بھی محبت ایک خلا ہے۔ کیا کبھی میرے ماں باپ بھی اپنے کیے کو غلطی تسلیم کریں گے۔ یا میں سدا ہی اس خلا میں معلق رہوں گا؟"

بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا وہ یاسیت کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

فائزہ اسے لیونگ روم میں ہی مل گئی تھیں۔ گویا وہ اس کے انتظار میں ہی بیٹھی ہوں۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ کبھی لیٹ نائٹ گھر آتا۔ فائزہ کسی بھی بہانے سے جاگ ضرور رہی ہوتیں۔

"اور یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں یہ کیوں بیٹھی ہوتی ہیں۔ کیا یہ میرے انتظار میں ہوتی ہیں؟" وہ سست روی سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا

"شاید الٹا سیدھا سوچ رہا ہوں میں۔ گزشتہ کئی دنوں سے ایک ہی بات دماغ پر سوار کرنے کا یہی اثر ہو سکتا ہے۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ جو اس کے آتے ہی ٹی وی بند کر چکی تھیں۔ اور اب بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ سنعان کو ان کی حالت قدرے بہتر لگی۔ وہ حواسوں میں نظر آ رہی تھیں۔ کم از کم ان کی آنکھوں میں پہچان کی رمق موجود تھی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" کیا ہی عجیب بات تھی۔ یوں بیٹھ کر حال احوال پوچھتے ہوئے وہ جھجک میں مبتلا ہو رہا تھا۔ قابل رحم تھا یا اس کے لیے۔ اور ممی کے لیے بھی' فائزہ نے جواب دینے کے بجائے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں ایکچوئلی۔" وہ جیسے سوچ سوچ کر الفاظ بولنے لگا۔ "ڈاکٹر شمسی کے پاس تھا ابھی' مجھے آپ کے لیے ان سے مشورہ چاہیے تھا۔ ان ایکچوئلی کسی قابل ڈاکٹر کے متعلق معلومات چاہیے تھیں مجھے۔ Hopefully جلد ہی ڈاکٹر تنویر احسان سے اپائنٹمنٹ مل جائے گی۔ شاید ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد تک۔"

"مگر تم نے مجھ سے تو مشورہ کیا ہی نہیں۔" وہ ایک تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ اچانک بولیں تو وہ کچھ الجھ سا گیا۔

"مجھے کسی بھی ڈاکٹر کو نہیں دکھانا۔ میں بیمار نہیں ہوں۔" انہوں نے اٹل لہجے میں کہا تھا۔ سنعان کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔

"بیمار نہیں۔ لیکن یہ روٹین کا چیک اپ ہوگا۔ جو بہر حال آپ کو کرانے کی ضرورت ہے"۔ اس نے بات سنبھالنی چاہی تھی۔

"مجھے روٹین چیک اپ بھی نہیں کروانا۔ مجھے علاج نہیں کرانا۔ مجھے ٹھیک نہیں ہونا۔" سنعان نے بے اختیار اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ فائزہ کا یہ رد عمل خلاف توقع تھا۔

"میری تمام خواہشیں ختم ہو گئی ہیں۔ اب مجھے زندگی کے دن گزارنے ہیں۔ جنہیں ایسے گزاروں یا ویسے مجھے فرق نہیں پڑتا۔" وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔ فائزہ ہمیشہ جیسا سوچ رہی تھیں اور چاہ رہی تھیں۔

"آپ آج بھی صرف اپنے متعلق صرف اپنی مرضی کا سوچ رہی ہیں۔ جو آپ چاہتی ہیں صرف وہی کرنا چاہ رہی ہیں۔ ماں کیا ہم بھی زندگی کے کسی موڑ پر۔ ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کا سوچ سکیں گے؟ ایک دوسرے کے لیے ہنسنا' ایک دوسرے کے لیے رونا' ایک دوسرے کے لیے سہنا۔ کیا ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ کیا ایسا کرنا قربانی کہلائے گا۔ کیا ہم ایک دوسرے کے لیے قربانی نہیں دے سکتے۔" وہ نہ جانے زندگی کے کس دور میں کھویا یہ سب کچھ منت بھرے انداز میں کہہ گیا تھا۔ جو سراسر اس کے دل کی کیفیت تھی۔ نہ جانے کچھ دنوں سے وہ کیوں چاہ رہا تھا مما کے سامنے اپنا آپ کھول کر رکھ دے۔ انہیں دکھائے ان کی محبت کی کمی نے سے کتنا نامکمل اور بکھرا ہوا انسان بنا چکی ہے۔ شاید وہی کیفیت چھائی تھی کہ وہ آزردہ ہوا کہتا چلا گیا۔ فائزہ پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھتی رہیں۔ جس کے نقوش ان کا پر تو تھے۔ جس کا مثالی حسن اور مردانہ وجاہت اسے دوسروں میں ممتاز کرتی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے ادھورا ہونے کی کہانیاں سنا رہا تھا۔

"تم کیوں چاہتے ہو ایسا؟ تمہیں اب جا کر کیوں احساس ہوا میری بیماری کا۔ میرا۔" وہ بہت اداسی سے شکوہ کناں تھیں۔ سنعان کا دل چاہا زور زور سے قہقہے لگائے۔ وہ جو ماں کے سامنے اپنے ادھورے پن کی تصویر دکھانے آیا تھا۔ الٹا مجرم ہو گیا تھا۔ مما اپنی حالت کے لیے اسے بھی یا صرف اسے ہی قصوروار ٹھہرا رہی تھیں۔ وہ جوان کے شوہر کہلاتے تھے۔ ان کا کیا نہ جانے کس کھاتے میں جاتا تھا۔؟

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے دن میں کھانا نہیں کھایا۔ تم چاہو تو جوائن کر سکتے ہو۔" وہ اسے آج حیران کرنے پر تلی تھیں۔ اپنے پیچھے اس کی آمد کا انتظار کیے بغیر ڈائننگ ہال کی طرف جانے سے پہلے انہوں نے کہا۔

"تو ثابت ہوا۔ ایک دوسرے کے لیے رو نہیں سکتے۔ ایک دوسرے کے لیے ہنس نہیں سکتے۔ لیکن ایک دوسرے کی غلطیوں کا بوجھ ایک دوسرے کے کندھوں پر ڈال سکتے ہیں۔ کیا مذاق ہے!" وہ جیسے اپنا مذاق اڑاتا ڈائننگ ہال کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ نہ جانے کتنے عرصے کے بعد وہ ماں بیٹا ایک ساتھ ڈنر کرنے والے تھے۔ اسے فضول خیالات کی نذر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس نے سر جھٹک کر ڈائننگ ہال میں قدم رکھے تھے۔

☼ ☼ ☼

زینب اور علیزہ نک سک سے تیار جب نورین کو بلانے کے لیے ان کے پورشن میں آئیں وہ جب کمرے سے بے حد مشتعل سی نکل رہی تھیں۔ علیزہ اور شانزے کی آمد زینب لوگوں کے پیچھے ہوئی دونوں کی تیاری دیکھ کر نورین نے بے ساختہ کو ہر آمد کی۔ سارے جگ کی اولاد اپنے ماں باپ کی ستی تھی۔ ایک سوائے ان کی یہ شانزے۔ جب سے اس قدر چھوٹی تھی مگر ماں اس کو کیسے تیار کروا کے اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ اور علیزہ ۔۔ جس کا اول جلول حلیہ ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا تھا اور جو کبھی بھی اس کو سدھارنے یا سنوارنے کے لیے ہلکان نہیں ہوتی تھی۔ آج وہ بھی تیار شیار ہو کر کسی اور جہاں کی لگ رہی تھی اور ان کی بیٹیاں۔ سوچ کر دل پر آرے

سے چل گئے۔ کشف گھر پہ نہیں تھی ملیکہ کو وہ خود ساتھ نہیں لے جانا چاہتی تھیں اور حبہ نے انھیں ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ نہیں تو نہیں۔۔۔ آگے سے وہ کچھ کہہ بھی نہیں پائیں۔۔۔ نہ منت نہ اصرار اور نہ تکرار اور اب سب کے بیچ بیٹھ کر خود سے لڑ رہی تھیں۔

"ہوا کیا۔۔۔ کچھ پتا تو چلے۔" زینب ان کے خراب موڈ کی کچھ وجہ جان تو گئی تھیں پھر بھی پوچھا۔

"میری اولاد مجھ سے زیادہ سیانی ہو گئی ہے۔ اپنے فیصلوں کی خود مالک۔۔۔ ماں باپ جائیں بھاڑ میں" شاید حبہ کا انکار انھیں کچھ زیادہ ہی کھل رہا تھا۔۔۔ کبھی یوں سب کے سامنے غصہ نکال بیٹھی تھیں ورنہ تو انھیں حبہ چھوٹی چھوٹا بھی پریشان کرتیں۔ وہ الگ جگہ بیٹھ کر ان سے بازپرس ڈانٹ پھٹکار کر لیتیں۔ لیکن یوں سب کے سامنے آپے سے باہر نہ ہوتیں۔ "ارے مسز انور جب اس قدر گرینڈ پارٹی کے تھرو سب کو بیٹے سے متعارف کرانا چاہ رہی ہیں تو اس کا صاف مطلب ہے وہ بیٹے کو لڑکیاں دکھانا چاہ رہی ہیں۔ لیکن میری بیٹی کے مزاج کے خلاف ہے یوں جانا"

مسز انور کا بیٹا امریکہ سے آیا تھا۔ آج کی پارٹی اس کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ بظاہر مسز انور بیٹے کو سب سے متعارف کروانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن سب کے علم میں تھا انھوں نے آج ہی کوئی لڑکی پسند کرنی ہے۔ ان سب کی تیاری اس مقصد کے تحت تھی۔

"یہ تو حبہ نا سمجھی کر رہی ہے۔۔۔ لازمی تو نہیں مسز انور ہماری ہی لڑکیوں کو پسند کر لیں۔ لیکن جانے میں کیا حرج ہے۔ یہ علیزہ اور شانزے بھی تو جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ ہم بھی تو جا رہے ہیں۔" شانزے نے علیزہ کو دیکھ کر آنکھ ماری تھی۔

"کیا چلا جائے گا اگر ہم مسز انور کے آگے دو چار بار کیٹ واک کر لیں گے تو۔۔۔ ویسے بھی فائدہ ہو نا ہے نقصان نہیں" نورین نے ستائشی نظروں سے شانزے کو دیکھا تھا۔ بھلے chill کرنے ہی سہی جا تو رہی تھی۔

"میری تو ایک بھی میرے ہاتھ نہیں آئی۔۔۔" نورین کے دل میں بھی درد شروع ہو گیا اس غم کے مارے۔ ملیکہ کو یہ سب فضول اور بے عزتی محسوس ہو رہا ہے۔ کشف گھر پہ نہیں اور حبہ۔۔۔ وہ پیدائشی بدذوق سا۔۔۔ اسے تو لوگوں کا درد ہی بس۔۔۔" ان کا آخری جملہ منہ میں ہی تھا جب حبہ ڈریس اپ ہوئی کمرے سے باہر آئی۔

"آپ چلیں۔" اس نے ماں کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا کر طنزیہ کہا تھا جو اسے دیکھ کر گم سم ہو بیٹھی تھیں۔

"تم پارٹی پہ جا رہی ہو؟" ان کے لہجے میں شکوک تھے۔

"Obviously مما۔۔۔ ورنہ آپ نے مجھے بخشا نہیں۔۔۔" وہ زچ ہوئی تھی۔

"تو تم پارٹی پہ جا رہی ہو۔۔۔ چالیسویں پہ نہیں اور نہ ہی مسز انور کوئی فیشن شو سیلیبریٹ کر رہی ہیں کہ تم لالی، پرچم اوڑھ چلیں۔۔۔" حبہ نے ٹائیٹ جینز کے اوپر سبز کرتا پہن رکھا تھا بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی بنا کر وا میں سائیڈ سے آگے کر رکھی تھی۔ بس یل ہی آج تمیز کے بن گئے تھے ورنہ حلیہ معمول کا تھا نورین کے نتھنے تک پھول رہے تھے اسے یوں دیکھ کر۔

"ٹی وی پہ کام کرتی ہو۔۔۔ کہاں کیا پہننا ہے اتنی سمجھ تو ہو گی تم میں۔۔۔ میری ناک کٹاؤ گی۔" نورین کو بس غش آنے باقی تھے۔

"ممی جانا ہے تو مجھے ایسے ہی لے جائیں۔ نہیں تو میرا موڈ change ہو جائے گا۔ مشکلوں سے میں نے خود کو تیار کیا ہے۔۔۔ اور پھر جھگڑنے کا بھی مت۔"

"بڑا احسان کر رہی ہے مجھ پر۔" نورین بڑبڑائی تھیں۔ حبہ کی دھمکی نے انھیں پرسکون ضرور کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اب امید بے کار تھی حبہ کا حلیہ ناقابل برداشت تھا۔

"یار آپی۔۔۔ کچھ بناؤ سنگھار کر لینے میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔۔۔ یوں بھی بیرونٹ نے جب سے امریکا کا ڈاکٹر اٹھایا ہے وہاں کے ڈاکٹرز کی بڑی ڈیمانڈ ہو گئی ہے یہاں بچی ماؤں کی نیندیں اڑ گئی ہوں گی جب اس کی منہ دکھائی پتا چلی ہو گی۔۔۔ اسی لیے میں تو بھی پوری کوشش کروں گی مسز انور متاثر نہیں ہو رہیں تو ڈائریکٹ بیٹے پر اٹیک کروں۔۔۔ سچ بتائیں چانسز لگ رہے ہیں نا۔" شانزے کی گل افشانیوں پہ حبہ اور نورین دونوں کے چہروں پہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"Naughty" حبہ نے اسے شرارت سے چپت رسید کی۔

"میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔" زینب نے بھی بیٹی کی بلائیں لیں۔۔۔ بیٹی کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں ماں کی ممتا پہ۔

"اور پھر ممی مجھے کہتی ہیں تم دس لڑکیوں میں بھی نظر نہیں آتی ہو۔" علیزہ نے شانزے کے کان میں دکھڑا رویا۔

"فکر نہیں کرو۔۔۔ میری ممی بھی یہی زبان بولتی ہیں۔۔۔ سب کے سامنے اداکاری کر رہی ہیں۔"

"اب چلتے ہیں بھابی۔۔۔ کہیں لیٹ نہ ہو جائیں۔"

"سہیل نے گاڑی نکال لی۔۔۔؟"

"جی ہاں کب کی۔۔۔" سب آگے پیچھے لیونگ روم سے باہر نکلی۔۔۔ حبہ نے اپنی گاڑی پہ جانا تھا۔ شانزے اور علیزہ اس کے ساتھ تھیں دو گاڑیوں کا یہ قافلہ مسز انور کے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہائے واوے۔۔۔ آپ کی بدر اور سسٹر آپ سے match نہیں کرتیں۔" ڈنر کے لیے ٹیبل پہ وہ زوہا کی وجہ سے آ بیٹھی تھی لیکن کھانا جیسے زہر ہو گیا تھا اوپر سے زوہا کا تفتیشی انداز۔۔۔ اماں اور عقیدت سے مل آنے کے بعد یہ پہلا تبصرہ تھا جو زوہا کی زبانی سننے کو ملا تھا۔ اور جس سے تحریم کو کچھ سننے کی بلکہ صرف کھری کھری ہی سننے کی امید تھی۔ وہ انھیں گیٹ پر ہی اتار کر چلتا بنا تھا۔

"کدھر ہے۔۔۔" اس نے ہانک بھی لگائی تھی لیکن وہ دھیان دیتا تو سن پاتا۔ تمام دن اس کا اس بدتمیزی کو سوچ سوچ کر کھولتے گزرا تھا۔

"ایسی بھی کیا جلدی کہ جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔" غصے کی شدت سے کمرے کو اوپر نیچے تک تلپٹ کر دیا درحقیقت تو سارا ڈیپریشن اماں اور عقیدت کی وجہ سے تھا۔۔۔ ان کے حالات اور اپنے رویے کا تقابل کرتے کرتے بالآخر خود کو بری الذمہ قرار دے چکی تھی۔

"میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔۔۔ مجھے ایسا کرنے کا پورا پورا حق تھا۔" لنچ اس ٹینشن کی نذر کرنے کے بعد وہ شاید ڈنر بھی فراموش کر دیتی۔ اگر زوہا بھوک بھوک کا شور نہ مچاتی۔ یہاں کی حالت کو کسی حد تک سمجھتے ہوئے اس نے دن میں تو صبر کر لیا تھا مگر اب بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ وہ نہایت بددلی کے ساتھ زوہا کا ساتھ دینے کے لیے آ بیٹھی۔

"آپ کیا ایسے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہیں؟" دزدیدہ نظروں سے زوہا کی طرف دیکھتے ہوئے تحریم کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"آپ تو مجھے اپنے متعلق اور ہی کچھ بتاتی رہی ہیں۔" اسے لگا زوہا مذاق اڑا رہی ہے۔

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔" اس سے یہ چند الفاظ بولنا بھی مشکل ہو گیا۔ بے تحاشا رونا آنے لگا تھا۔

"پھر یہ سب کیا ہے۔۔۔؟" ماں کی حالت سے بے نیاز زوہا ہر اس سوال کا جواب چاہ رہی تھی جو تمام دن اس کے

دماغ میں کلبلاتے رہے تھے۔

"زوہا کھانا کھاؤ۔" ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ وہ جیخ کے بولی تو زوہا نے زور سے چمچ پلیٹ میں پٹخ دیا۔

"میں نے کھالیا۔" اس کا لہجہ سرد اور خفگی لیے ہوئے تھا۔

"اور آئندہ ہم اس ٹاپک پہ بات نہیں کریں گے۔" زوہا کی خفگی کو نظرانداز کیے اس نے گویا پہلے سے طے شدہ فیصلہ پر مہر لگائی اور شعوری طور پر زوہا کے اٹھ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ ہنوز بیٹھی رہی۔

"کیا واقعی آپ کی سسٹر نے تھرو آؤٹ پرائیویٹ ایجوکیشن لی ہے؟" اس نے بیٹھنے کی وجہ بھی اگل دی۔ اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ کیونکہ وہ بیمار رہتی تھی اکثر۔" جلدی جلدی جملہ مکمل کرکے تحریم نے گویا جان چھڑانی چاہی۔

"گھر بیٹھ کر پڑھنے کے باوجود بھی میرٹ بنالیتا۔۔۔ پھر تو واقعی آپ کی سسٹر بہت شائننگ ہیں۔"

"زوہا۔۔۔ اس کا نام عقیدت ہے۔" بار بار زوہا کے منہ سے "آپ کی سسٹر" اسے زچ کر گیا۔ وہ لفظ چبا کر جتلا گئی۔

"آئی نو۔۔۔ لیکن بہت بھاری نام ہے۔۔۔ بار بار کہنا مشکل۔ آئی تھنک مجھے ان کو خالہ یا آپا جیسا کچھ بولنا چاہیے۔" وہی زوہا کا تمسخرانہ انداز۔۔۔ تحریم نے خون کے گھونٹ بھر کر چند ساعت اپنے آپ کو قابو کرنے میں لگائے۔

"تم نے کھانا کھالیا ہے تو اٹھ جاؤ۔" وہی ایک موضوع جو کئی دنوں سے اس کے دماغ کو مفلوج کرچکا تھا اور جس کی وجہ سے آج کا تمام دن خود پر ترس کھاتے گزرا تھا۔۔۔ اس کی اب کھانے کی میز پر بھی باتیں شدید تکرار۔۔۔ تحریم کی برداشت ختم ہوگئی وہ باقاعدہ چلا کر بولی تو زوہا کو اٹھنا ہی پڑا زوردار آواز کے ساتھ کرسی دھکیلتی وہ وہاں سے گئی تھی۔ تحریم نے سر ہاتھوں میں گرالیا۔۔۔ ڈھیر سارے آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ نسرین برتن سمیٹ گئی کافی بنا کے رکھ گئی۔۔۔ تحریم یوں ہی بے آواز روتی رہی۔۔۔ اتنے دنوں کا صبر اب چھوٹ گیا تھا۔ خود ترسی کا ایسا عالم کہ صرف اپنا آپ ہی ہمدردی کے قابل لگ رہا تھا۔ بے حد شدت اور رنج کے ساتھ وہ تب تک روتی رہی جب تک کہ گیراج میں اویس کی پراڈو رکنے کی آواز نہیں آگئی۔۔۔ اس نے سرعت سے اپنے منہ پہ ہاتھ رگڑ کر آنسو مٹائے تھے۔ ابھی اسے اویس کے سوالات کا بھی سامنا کرنا تھا اور وہ تیار تھی اس سب کے لیے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا فون کیوں آف تھا؟" وہ اس کے پیچھے پیچھے اسٹڈی میں آئی تھی۔

"ایمرجنسی تھی۔" اویس کوٹ اتار کر کرسی پر گر سا گیا۔ وہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ مگر فی الحال تحریم کے لیے اپنی ذات کے علاوہ سب بے معنی تھا۔ اویس تھکا ہوا کیوں ہے؟ اسے بھوک کیوں نہیں ہے؟ تھکاوٹ اتارنے کے لیے وہ بیڈروم کے بجائے اسٹڈی میں کیوں آیا۔۔۔؟ یہ سب بے معنی تھا۔ اسے اویس سے اپنے لیے وضاحتیں درکار تھیں اسے صرف انہی سے سروکار تھا اور بس۔

"تم پھر بھی مجھے بتاسکتے تھے۔۔۔ کال نہ سہی ایک Text ہی کردیتے۔۔۔" ہمیشہ کی طرح وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے صرف قصوروار گن رہی تھی۔ اویس کا یہ رد عمل ہے۔۔۔ تمام دن کیوں رہا۔۔۔ وہ جاننے کی خواہشمند نہیں تھی۔

"بھول گیا تھا۔" اویس کے انداز و لہجے میں بے گانگی تھی۔ تحریم کے اندر غصے کی شدید ترین لہر نے سر اٹھایا۔

"بھول گیا؟" وہ ہی بولی زبان میں چیخ کر گویا کنفرم کرانا چاہا۔

"ہاں تحریم۔۔۔ بھول گیا کیونکہ میں بھی انسان ہوں میں بھی بھول سکتا ہوں۔" وہ دیر تک عجیب پر سوچ نظروں

سے اسے دیکھتی رہی۔۔۔ اس کے انداز نئے ہو رہے تھے۔ مختلف اور اجنبی تحریم کو بے چینی نے آلیا۔

"تم آج ہی کیوں بھولے؟ آج جب میں اماں اور عقیدت سے مل آئی۔۔۔ تم آج ہی بھولے۔۔۔؟ تم یوں کیوں نہیں کہتے ہو تمہیں ان کا غم ستا رہا تھا۔۔۔ تمہیں مجھ سے زیادہ ان کی فکر ہو رہی تھی۔ وہ جن سے تم پوری زندگی میں شاید تیسری بار ہی مل رہے ہوگے۔ وہ جن کی پوری ہسٹری۔۔۔ میں تمہیں AtoZ سب بتا چکی۔۔۔ تم پھر بھی ان کا غم کھا رہے ہو۔۔۔ تم ان کی وجہ سے مجھے نظرانداز کر رہے ہو تم۔۔۔" شاید غبار ابھی بھی باقی تھا۔ دانت پیس پیس کر چیختی وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔۔۔ بے حد انت کے ساتھ۔ مضطرب ہوئی۔ اویس نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد آہستگی سے پوچھا تھا۔

"تم نے اچھا کیا کیا؟ خود بتاؤ۔"

"میں نے اچھا کیا۔۔۔ میں ان کے ساتھ ایسا ہی کچھ کرسکتی تھی۔" وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ اویس نے بے ساختہ گہری سانس کھینچی۔۔۔ جیسے کہ شکست تسلیم کرلی ہو۔

"مجھے حیرت ہے۔۔۔ میں سمجھتا تھا تم صرف میری ممی کو ہی dis respect کرتی ہو۔۔۔ مگر تم نے تو اپنی اماں کا عزت مقام سب کچھ ختم کردیا۔"

"تم کیوں اتنا انٹرسٹ لے رہے ہو اس سب میں۔۔۔ تمہارا کیا مطلب ہے اماں اور عقیدت سے؟ وہ میری اماں ہیں میں انہیں respect دوں یا نہیں۔ تم کیوں جوک لے رہے ہو؟" اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ اویس کو خواہ مخواہ نظریں چرانی پڑ گئیں۔۔۔ واقعی وہ کیوں انٹرسٹ لے رہا تھا۔

"تحریم میں صرف تمہاری وجہ سے۔۔۔" اس نے کہنا چاہا تھا مگر تحریم نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"تم نہیں کروگے میری وجہ سے۔۔۔ تمہیں ضرورت نہیں میری وجہ سے خود کو رائٹ ثابت کرنے کی۔۔۔ اچھا دکھانے کی ہم نے دیکھ لیا میں نے ان کے ساتھ کیسا بے ہوگیا۔ اب اگر تمہیں میری وجہ سے کچھ کرنا ہے تو کچھ کروگے۔" انتہائی رکھائی اور سنگدلی سے کہتی وہ اویس کو جتلا گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

"اور اگر میں نے سنا کہ تم نے عقیدت کو کسی بھی حوالے سے سپورٹ کیا ہے تو میرا وہ دن تمہارے گھر میں آخری ہوگا۔۔۔ گڈنائٹ۔" انگلی اٹھا کر وارن کرتی وہ اویس کو ایک بار پھر خود سے دور بہت دور محسوس ہوئی۔ اس کے جانے کے کتنی دیر بعد تک اس کے لفظ کی بازگشت اسٹڈی میں گونجتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اوہو۔۔۔" چائے کا جو کپ تحریم کے لیے تھا وہ ویسے کا ویسا بھرا رکھا تھا۔ تحریم نے اسے ہاتھ تک لگانا گوارا نہیں کیا تھا۔ جمیلہ جب سب کو سرو کرتے کرتے اس کے قریب آئی تھی اس نے نہایت نخوت سے کہا تھا۔

"رکھ دو۔" جمیلہ نے اس کے سامنے ٹیبل پر کپ رکھ دیا تھا۔ جسے اب یہاں سے اٹھاتے ہوئے اس کی اس سبکی پہ غصہ غالب آنے لگا تھا جو تحریم کے لقشنہ کرانے کی وجہ سے تب سے اب تک سوار تھی۔ ان لوگوں کو گئے ہوئے تو کافی وقت ہوچلا تھا۔۔۔ شام دہلیز پر آکھڑی ہوئی تھی۔۔۔ اسے ہی اماں کے ساتھ لگے رہنے کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ تحریم کے جانے کے بعد انہوں نے چاہے کتنا ہی خود کو کیوں نہ سنبھال رکھا ہو۔۔۔ جمیلہ جانتی تھی ان کے اندر درد کا سمندر موجزن تھا۔ وہ کمرے میں گھس گئی تھیں۔ جمیلہ نے برتن وغیرہ سمیٹنے کے لیے لاؤنج کا رخ کیا ہی تھا جب ان کی پکار پر دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچی تھی۔

"جمیلہ۔۔۔ عجیب سی گھٹن ہو رہی ہے۔" وہ بیڈ پر بیٹھی سینہ مسل رہی تھیں۔ جمیلہ کا ایک پل کے لیے تو دل دھک سے رہ گیا۔

"اللہ خیر کرے باجی۔ کیا ہوا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے پیٹ میں درد ہو یا سینے میں سانس تنگ کر رہی ہے۔" وہ کبھی پیٹ پکڑ لیتیں کبھی سینہ مسلنے لگتیں۔ جمیلہ کا رنگ فق ہونے لگا۔ کچھ ان ہونی نہ ہو جائے اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔

"میں قریب کے ہمسایوں سے کہتی ہوں مجھے ڈاکٹر کا پتا بتادیں۔ دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" ان کے درد نے کرکنے پر جمیلہ نے مشکلوں سے قدم روکے۔ "مجھے لگتا ہے گیس دماغ پر چڑھ رہی ہے۔ سارا وقت بیٹھی بھی تو رہی تھی ایسا کرو مجھے سبز چائے بنادو۔"

"وہ تو میں بنادیتی ہوں باجی۔ دار چینی اور سونف ڈال کے پر آپ ڈاکٹر کو دکھانے میں سستی نہ کرو۔" جمیلہ کی پریشانی بجا تھی۔ لیکن وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا چاہ رہی تھیں۔ خوامخواہ کا خرچہ۔

"بعد میں دکھالوں گی۔ تم پہلے سونف اور دار چینی والی سبز چائے بنالاؤ۔"

"ابھی لائی۔" چند منٹوں بعد اس نے سبز چائے اور وہ سفوف انہیں لا تھمایا جو وہ ایسی حالت ہونے پہ اکثر پھانک لیا کرتی تھیں۔ چائے پینے کے آدھے گھنٹے بعد تک انہیں قدرے افاقہ ہوا تھا۔ جمیلہ تب تک ان کی پشت دباتی رہی تھی۔ ایک تھکی ہوئی خاموشی ان کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھی۔ نہ کوئی حال احوال' نہ جمیلہ سے کوئی پرانی یادگار سننے کی فرمائش بس خاموشی سے کمر دبوائی رہیں۔ ان چند گھنٹوں میں ان کا چہرا اتر کر رہ گیا تھا۔ وہ رو نہیں رہی تھیں۔ لیکن ان کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا پانی ان کے دل کا حال بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی دکھی ہوئی بیٹھی ہیں۔

"جمیلہ۔ عقیدت نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔" یک دم جیسے یاد آنے پر وہ نئی پریشانی کا شکار ہو گئیں۔

"آپ فکر نہ کریں باجی۔ میں نے پوچھ لیا تھا اس سے۔ اس نے کہا بھوک نہیں ہے۔"

"عجیب مزاج کی لڑکی ہے۔ لڑکیوں جیسا کچھ ہے ہی نہیں اس میں۔ نہ کھانے پینے کی شوقین۔ نہ پہننے اوڑھنے کی۔ میں کہوں گی تو کھالے گی۔ میں نہیں کہوں گی تو نہیں کھائے گی۔ جو پہناؤں گی خاموشی سے پہن لے گی۔ نہ کوئی ضد' نہ فرمائش' نہ کوئی اپنی مرضی۔" وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں۔ جمیلہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"باجی جیسے مرغی چوزوں کو پروں میں دبائے رہتی ہے۔ ایسے آپ نے اس کی پرورش کی ہے۔" جمیلہ کو بڑا مان تھا باجی پر۔

"میں اب سوچتی ہوں میں نے غلط کیا۔" ان کی آنکھوں میں ملال اور پچھتاوا ہونے لگا۔

"میری حد درجہ توجہ نے اسے کمزور اور کم ہمت بنادیا۔ اس کا اعتماد چھین لیا۔ وہ اب ہر کام کے لیے میری طرف دیکھتی ہے۔ مجھ پر انحصار کرتی ہے۔ کاش میں اسے زمانہ شناس بناتی۔ اسے دنیا سے چھپا کر رکھنے کی بجائے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھاتی۔ وہ اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتی۔ کاش وہ ایسی نہ ہوتی۔" جمیلہ نے محسوس کیا ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"ہماری بلی جیسی بھی ہے سب سے اچھی ہے۔ آپ دیکھیں آپ کو کبھی پلٹ کر جواب نہیں کرتی۔ ہمیشہ آپ کا کہا مانتی ہے۔" جمیلہ نے انجانے میں ان کے زخم ہرے کر دیے۔ ایک بیٹی کہا مانتی تھی۔ دوسری بس منواتی تھی ان کے حلق میں نمکین پانی جمع ہونے لگا۔

"باجی رہے زمانہ شناسی کے گر تو وہ آہوں آپ سیکھ جائے گی۔ کالج جا کر لڑکیاں سب سیکھ جاتی ہیں۔"

"جمیلہ بس کرو۔" انہوں نے جمیلہ کو اشارہ کیا تھا۔ اس کے کندھے دباتے ہاتھ ذرا دیر کو رک گئے۔

"کیوں باجی۔ میں دباتی ہوں نا۔"

"نہیں جمیلہ۔ بہت دیر ہو گئی۔ میں تھوڑی دیر سو جاتی ہوں۔ تم عقیدت کو دیکھو۔ اسے رات کے کھانے میں دال چاول بنادو۔ وہ کہے گی نہیں۔ مگر اس کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ ساتھ کوک بھی منگوا لینا۔ عقیدت شوق سے پیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے باجی۔" وہ ان پر لحاف ڈالتی' لائٹ بند کرتی جوں ہی باہر نکلی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو دھاریں کانوں تک بہتی چلی گئیں اور پھر جیسے سیل رواں ہو گیا۔ ان کے زخم نئے سرے سے درد کرنے لگے تھے اور لب۔ باہر لاؤنج میں چائے کے کپ اکٹھے کرتی جمیلہ' تحریم کو سوچے جارہی تھی۔

"اچھا تو یہ تھیں باجی کی بڑی بیٹی۔ جن کی باتیں بتاتے ہوئے وہ تھکتی نہیں تھیں اور وہ نہ جانے کیوں اتنی ناراض ہیں کہ برسوں بعد ملنے پر بھی ماں اور بہن کے لیے قریبی رہیں۔" جمیلہ کو یاد نہیں تھا اس کے یہاں کام کرنے کے بعد تحریم کبھی ان کے گھر آئی ہو۔ ہاں باجی ضرور دو' تین بار تحریم کے پاس لاہور آچکی تھیں اور یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اب تو عرصہ ہوا باجی بھی لاہور نہیں گئی تھیں۔ حتیٰ کہ حاذق کی پیدائش پر بھی نہ جاسکیں۔

"ہاہ باجی آپ نہیں جائیں گی۔ اتنی مرادوں بعد آپ کا نواسا ہوا ہے۔" جمیلہ تو جی بھر کر حیران ہوئی تھی۔

"ہاں وہ۔ اصل میں تحریم لوگ یہاں ہیں نہیں۔" جمیلہ سمجھی تھی حاذق کہیں اور پیدا ہوا ہو شاید۔ مگر آج اس کا رویہ دیکھ کر اسے سوچنے میں شبہ نہیں ہو رہا تھا کہ تحریم نے خود ہی منع کر دیا ہو گا۔

پانچ بجنے والے تھے جب چاول بھگوتے ہوئے اسے عقیدت کا خیال آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی ٹیرس پہ گئی۔ عقیدت کرسی کے اوپر ٹانگیں رکھے ان کے گرد بازو لپیٹے ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے گمان گزرا سو ہی گئی ہے۔

"چلیں۔ نیچے چل۔ مغرب ہونے کو ہے۔ تو نے یہیں بستر لگانا ہے کیا؟ وہ دیکھ۔ بابا جی تجھے پوری آنکھیں کھولے گھور رہے ہیں۔" عقیدت نے سر اٹھا کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ بابا جی واقعی دیکھ رہے تھے۔ لیکن تشویش سے۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ زمانہ بھلائے بڑی ہی ان تے کے ساتھ رو رہی تھی۔ گویا زمانے میں ایک صرف وہی غم زدہ ہو۔

"نیچے چلو۔" وہ بابا جی کے دیکھنے پہ خائف فوراً سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔ جمیلہ بھی بھاگتی ہوئی پیچھے آئی۔

"دیکھ تو اپنا منہ۔ رو' رو کر اتنا سوج رہا ہے۔ شکر ہے باجی سو گئیں۔ ورنہ کئی سوال کرتیں۔" وہیں کچن کے سنک سے اس نے منہ پر دو' چار چھپاکے مارے اور وہیں ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

"دال بن گئی ہے۔ چاول ابھی پک جاتے ہیں تم کھالو جلدی سے۔"

"مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔" عقیدت کی آواز ابھی بھی بھاری ہو رہی تھی۔ شاید تحریم کے جانے کے بعد سے روتی رہی تھی۔

"چپ۔" جمیلہ نے ہاتھ میں پکڑا کفگیر لہرا کر گویا دھمکایا۔ "باجی نے کہا ہے زبردستی کھلاؤں۔ کوئی بہانہ نہیں سننا بس۔" چونکہ باجی یعنی اماں کا نام آگیا تھا۔ سو وہ چپ چاپ دال چاول کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ جمیلہ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ کیسے مان گئی تھی۔ نہ بحث' نہ ضد' نہ تکرار اور ابھی باجی کہہ رہی تھیں انہوں نے اس کی ٹھیک تربیت نہیں کی۔

"تو تحریم باجی ہوراں کی وجہ سے دکھی ہے۔" جمیلہ کن انکھیوں سے اس کی طرف بھی متوجہ تھی۔ چاول دم پر لگاتے ہوئے سرسری سا پوچھا اور پچھتائی بھی۔ عقیدت کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگی تھیں۔

"اچھا بس جواب نہ دے۔ دفع کر۔ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔" اس کے آنسو جمیلہ کے ہاتھ پیر پھلا گئے۔ اگر جو باجی آجاتیں تو بات سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

"میرے منہ میں خاک میں نے پوچھ لیا۔" جمیلہ کو ملال نے آگھیرا عقیدت پھر سے اداس ہو بیٹھی تھی۔

"حاذق کتنا پیارا تھا نا۔" آنسوؤں بھری آنکھوں میں حاذق کا نام لیتے ہوئے جو چمک ابھری دیکھ کر جمیلہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں واقعی۔ خوب صورت اور بہت صحت مند ماشاء اللہ۔" وہ بھی مسکرا دی۔ عقیدت شاید تصویر کا اچھا رخ بھی دیکھنا چاہ رہی تھی۔

"تحریم باجی نے اپنی مرضی کی شادی کی تھی کیا؟" دال چاول پک گئے تو جمیلہ بھی اس کے قریب چیئر پر آبیٹھی۔

"ہاں شاید۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں بہت چھوٹی تھی تب۔" اب کے عقیدت کا لہجہ نارمل تھا۔

"باجی خود گئی تھیں کیا؟" جمیلہ کے پوچھنے پہ عقیدت نے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے آپی اور اویس بھائی نے کورٹ میرج کرلی تھی۔"

"اوہ۔" جمیلہ کو اگلی بات کہنے میں کافی دیر لگی۔ "اچھا ہی کیا۔ اپنے جیسا شان دار بندہ دیکھ کر شادی کی۔ اتنا امیر اور بچے بھی رج کرکے سوہنے۔" جمیلہ نے اچھا پہلو ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ عقیدت چپ چاپ میز پر انگلی سے لکیریں کھینچتی رہی۔

"چلی۔ میں تو کہتی ہوں۔" اس کے پاس سے اٹھ کر چاولوں کا دم کھولتی وہ مزید بولی تھی۔ "تو بھی کوئی اپنی مرضی کا دیکھ کر بیاہ کرلینا۔ میں اور باجی کہاں تیرے لائق ڈھونڈتے پھریں گے۔ کالج میں ہی کوئی۔" تبھی اسی لمحے آواز آئی۔

"جمیلہ۔ جمیلہ۔"

"باجی۔" جمیلہ کی ہنسی گم ہوگئی۔ گڑبڑا کر عقیدت کی طرف دیکھا۔ "کہیں باجی نے سن تو نہیں لیا۔ ہائے ربا کیا کہیں گی میں تجھے کیسی پٹیاں پڑھا رہی ہوں۔" عقیدت نفس سی بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی کیا نہیں۔ اماں نے سنایا نہیں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

"جان کی اماں چاہتا ہے تو ابھی کے ابھی میرے گھر آجا۔ میں شدید مشکل میں ہوں۔" ہارون کا ٹیکسٹ تھا۔ پڑھتے ہوئے مسکراہٹ اس کے لبوں پر ٹھہری گئی۔ فوراً کال ملائی۔ ہارون جیسے اسی انتظار میں تھا۔ چھوٹتے ہی اٹینڈ کی۔

"میں نے کال نہیں کی کہیں تم میٹنگ میں نہ ہو۔"

"میں میٹنگ میں تو نہیں۔ مگر آفس میں ضرور ہوں۔ آنا تھوڑا مشکل ہے۔" اس نے مجبوری بیان کی تھی۔

"ارے تو باپ کا آفس ہے۔ مرضی سے آؤ مرضی سے جاؤ۔" وہ ہارون ہی کیا جو مسئلے کا حل نہ بتا پائے۔

"بھائی یہ میرے والا باپ ہے تیرے والا نہیں۔ یہاں ایک سادے کاغذ پر کھینچی لکیر کا بھی حساب دینا پڑے گا۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا بس تو آرہا ہے ورنہ بھول جانا کوئی ہارون نامی دوست بھی تھا تیری زندگی میں۔" کال کٹ گئی تھی۔ وہ ہونٹ سکوڑے کچھ دیر کشمکش میں رہا۔ پھر ڈاکر صاحب کو بلا کر ضروری فائلز پکڑائیں اور آفس سے اٹھ آیا۔ آدھے گھنٹے کا فاصلہ بیس منٹ میں طے کرکے ہارون کے گھر تھا۔ انٹرنس پر ہی صوفیہ آنٹی مل گئیں۔ ہمیشہ کی مسکراتی

"ارے نعمان۔" اسے دیکھ کر جیسے کھل اٹھیں۔ "کیسے ہو بیٹا۔"

"میں تو ٹھیک ہوں' البتہ آپ کے بیٹے کی خیریت مشکوک لگ رہی ہے۔" صوفیہ آنٹی نے اونچا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"تم آگئے ہو نا تو وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔" دونوں ایک ساتھ ہارون کے بیڈ روم کی طرف بڑھے۔

"سنعان آگیا۔" آنٹی نے اندر داخل ہوتے ہی گویا نعرہ مارا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی تقلید میں اندر آیا۔ ہارون صاحب بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ آس پاس بیڈ پر تصویریں بکھری پڑی تھیں۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے میں بڑا ہو گیا ہوں۔" اس نے اطلاع کم' دہائی زیادہ دی۔

"میں سمجھا تیرے گھر ملک الموت آیا کھڑا ہے۔" سنعان نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ تصویریں ایک طرف ہٹا کر وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ ہارون نے لمبی چھوڑی ہوگی جانتے ہوئے بھی وہ آ گیا کہ یہ چند لمحے اسے فریش کرنے والے تھے۔ ہارون اور اس کے گھر والوں کے بیچ اس کا ڈپریشن بھاگ جاتا تھا۔

"یعنی میرے ساتھ بیلے کرنے کی ابتدا کی اسٹیج آگئی ہے۔" ہارون نے باقاعدہ شرمانے کی ایکٹنگ کی۔

"جوکر۔" مصنوعی گھرکتے ہوئے صوفیہ نے تصویریں سنعان کے ہاتھ میں دی تھیں۔

"دیکھو اور پسند کرو۔"

"میں۔" سنعان دہل ہی تو گیا۔ فوراً تصویریں بیڈ پر رکھ دیں۔ گویا ڈنک مار رہی ہوں۔

"او ہو بھئی میرے لیے۔" ہارون جھلایا۔ "تو اپنی باری پہ احمق نظر آنا۔ ابھی میرا وقت ہے۔"

"اچھا ہوا تم فائزہ کو بھی ساتھ لے آتے۔ ہم دونوں مل کر پسند کرتیں تم دونوں کے لیے۔"

"لیکن یہ تو ایک ہی لڑکی کی تصویر ہے؟" سنعان کو حیرت ہوئی۔

"تو بھائی میں نے ایک ہی لڑکی سے شادی کرنی ہے۔" ہارون پر مزید جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔

"اوہ۔ میں اس لیے بولا کہ آنٹی کہہ رہی تھیں فائزہ کو ساتھ لانے کا۔" سنعان جھینپ سا گیا۔ آنٹی مسکرا رہی تھیں۔

"تجھے بڑا شوق ہو رہا ہے سہرا لادنے کا۔ امی پہلے اس کی کرتے ہیں۔" ہارون کو جان خلاصی کی ہلکی سی امید نظر آئی۔ وہ آنٹی کے سر ہونے لگا۔

"مجھے معاف کر۔" سنعان نے لال جھنڈی دکھائی تو وہ پھر سے منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"ہم لوگ اسے دیکھنے جا رہے ہیں۔" صوفیہ آنٹی بڑے پیار سے تصویر دیکھتے ہوئے بتانے لگیں۔ "تمہارے انکل کے بچپن کے دوست ہیں۔ اے ایس پی ہیں۔ ان کی بیٹی ہے۔ چونکہ تمہارے دوست کی بات چلے گی۔ اس لیے تم بھی ساتھ چلو۔"

"امی مجھ نہیں رہیں۔ تمہیں ساتھ لے جانا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہو گا۔" ہارون نے بڑی تشویش سے کہا تھا۔ صوفیہ نے توجہ ہی نہ دی۔

"صحیح کہہ رہا ہے۔ میرا وہاں کیا کام ہو گا؟" سنعان کو آکورڈ لگا خود کا جانا۔

"تو میرا سہارا بنے گا پیارے۔"

"کیوں تو نے آج ہی آج دولہا بننا ہے کیا؟" اس نے بھی پھلجھڑی چھوڑی تھی۔

"یار بڑی اولاد ہونا بھی سراسر نقصان ہے۔ قربانی کا بکرا اسی کو بننا پڑتا ہے۔" ہارون نے ایک اور غم رویا۔

"آنٹی میرا جانا ایسا ضروری ہے کیا؟ ویسے بھی اس نے مجھے بتایا ہی نہیں۔"

"میں بتا کر بلاتا اور تو اسی حساب سے تیار ہو کر آتا اور لڑکی میری موجودگی میں تجھے پسند کر ڈالتی' میرا چانس وہیں ختم۔" ہارون نے آنکھیں نچا کر کہا تھا۔

"یہ تیار ہوئے تو بنا بھی جائے تو بھی کم نہیں لگے گا۔" آنٹی کی آنکھوں اور لہجے میں ستائش تھی۔

"اور نہیں تو کیا' قیامت ڈھاتا ہے' کہیں کا یوسف ثانی۔"

"پھر اچھا ہے نا۔ میں نہ آؤں۔" سنعان نے موقع غنیمت جانا تھا۔

"نہیں بھائی' ایک تیرے نہ آنے سے فرق نہیں پڑے گا۔ پانچ میرے اپنے بھائی' دو اماں' ابا' آٹھواں تو اور نواں میں خود۔ زیادہ تو نہیں ہیں۔ چلے چلیں گے۔" سنعان اور صوفیہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

"آنٹی یہ زیادہ نہیں ہو گئے۔" یونہی ہنستے ہنستے سنعان نے کہا تھا۔

"میں کیا کروں۔ شہربانو کے پیرنٹس خود اصرار کر کے سب گھر والوں کو بلا رہے ہیں۔"

"مجھے تو لڑکی میں کوئی فالٹ لگتا ہے۔" ہارون نے اس کے کان میں منہ گھسیڑا تھا۔ "گھر والے زبردستی دینے پر تلے ہیں۔"

"شٹ اپ۔" اس نے دبی زبان سے گھر کا۔

"تھینک گاڈ۔ تم فائزہ آنٹی کو نہیں لے جا رہے۔ شہربانو صاحبہ کے پیرنٹس اتنا ہجوم دیکھ کر نکاح پلس رخصتی کی بھی فرمائش کر ڈالتے' کچھ ایسے ہی مہربان ہو رہے ہیں وہ۔"

"سنعان تم کیسے برداشت کرتے ہو اس کی بکواس؟" اب کے صوفیہ واقعی طیش میں آگئیں۔ سنعان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہارون کو کنٹرول میں رہنے کا کہا۔ اس نے منہ پر انگلی رکھ لی۔

"ایک نمبر کا مسخرہ ہے۔ پتا نہیں شہربانو کو کیسے پسند آئے گا۔"

"بس۔" ہارون انگلی ہٹا کر تڑپا۔ "بتا دیکھے مجھے پاس کر دیا آپ کی شہربانو اور اس کے گھر والوں نے اور بات کر رہی ہیں شہربانو صاحبہ کے پسند کرنے کی۔ اتنا تو پسند آیا ہوں کہ فارملٹیز میں پڑے بغیر دعوت پر آ گئے حالانکہ میں اتنی جلدی تو کیا شادی کرنے کے حق میں ہی نہیں تھا۔ پوچھ لیں سنعان سے۔ ہم دونوں نے عہد کیا تھا جب تک سنعان شادی نہیں کرے گا میں نہیں کروں گا۔"

"عہد۔" سنعان کے لفظ گلے میں پھنس گیا۔ "ہم دونوں نے؟" اسے یاد نہیں آیا کب۔

"آپ کی دیہہ سے مجھے عہد سے پھرنا پڑا۔" اس نے ماں کو یوں دیکھا جیسے وہ بہت بڑے قصور کی مرتکب ہوئی ہوں۔

"اچھی بات ہے تو عہد سے پھر گیا ورنہ کنوارا ہی رہتا۔ کیونکہ میں نے زندگی بھر شادی نہیں کرنی۔" سنعان نے اطمینان سے کہا۔ ہارون کے چہرے پر مصنوعی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"قسم کھاؤ واقعی۔"

"بدتمیز" اب کی بار صوفیہ نے تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ عجیب سا سمجھ میں آنے والی بونگیاں مار رہا تھا۔

"اچھا بتاؤ سن۔ کیا لاؤں کافی یا۔"

"کافی ٹھیک رہے گی۔" اس نے کسی بھی تکلف میں پڑے بغیر کہا تو آنٹی سرہلا کر جانے لگیں۔ کچھ سوچ کر پھر سے مڑیں۔

"ویسے تو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔ میں پہلے کھانا لگوا آتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔" سنعان نے فوراً منع کیا۔ "کافی ہی ٹھیک رہے گی۔ کھانا میں رات میں مما کے ساتھ کھاؤں گا۔" آنٹی "ٹھیک ہے" کہتی باہر چلی گئیں تو ہارون بھویں اچکا کر شرارت سے اسے دیکھنے لگا۔

"اچھا۔" اس نے اچھا کو خوب لمبا کیا۔ "تبدیلیاں۔" اس کا اشارہ مما کے ساتھ کھانا کھانے والی بات کی طرف تھا۔ سنعان نے جان بوجھ کر توجہ نہیں دی۔ بغور تصویریں دیکھتا رہا۔

"روز ایک ایک قدم آگے بڑھتا ہوں۔ امید ہے فاصلے جلد ختم ہو جائیں گے۔" پھر جب محسوس کیا ہارون ابھی بھی جواب کا منتظر ہے تو آہستگی سے کہہ کر پھر سے تصویروں میں گم ہو گیا۔ ہارون کے چہرے پر نرم مسکراہٹ دوڑی تھی۔

"اچھا بتا کیسی ہے۔" پھر بات پلٹ کر پرانی جون میں آیا۔ خود بھی ایک تصویر اٹھالی تھی۔

"مجھے لگتا ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں۔" اس کی شکل دیکھ کر سنعان نے پھر سے تصویر کا جائزہ لیا مگر وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

"سانولی بھی بہت ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے ناٹی بھی لگ رہی ہے۔" سنعان کو ہنسی آگئی۔

"لگتا ہے سارا دن تصویریں ہی دیکھتے رہے ہو۔" اس نے ازراہ شرارت کہا ہارون بغلیں جھانکنے لگا۔ واقعی آج کوئی کام کیا تھا۔ اور خاصا دل لگا کر کیا تھا۔

"بیٹا۔ ایک بار ہاں ہو لینے دے۔ یہ آگے کو دانت' سانولی اور ناٹی۔ سب بتاؤں گا بھابی کو۔"

"بھابی" ہارون کو بڑا ہی بھلا لگا سننے پر۔ "بیچو۔ تیرا بھی ٹائم آئے گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ پھیر کر باقاعدہ ڈرایا۔

"میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔" سنعان پرسکون رہا۔

"اچھا ذرا دکھا۔" ہارون نے کہا سنعان نے ہاتھ آگے کر دیا۔

"ابے تین تین ہیں۔" اس نے حلق پھاڑا تھا۔ سنعان نے تکیے کھینچ مارے۔

"تو بھلے نہ مان۔ لیکن اللہ نے تیرے جوڑ کی تیرے ہی جیسی کہیں ضرور بنائی ہو گی۔ بہت حسین' اور بہت خاص۔" سنعان نے کندھے اچکائے تھے۔

☆ ☆ ☆

صحن میں رکھی دو چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھی سحر نے ٹانگیں لٹکا رکھی تھیں۔ اس کے پاؤں پانی سے بھرے ٹب میں بھیگے تھے اور میکے میں کام کرنے والی شانو اس کے گورے پیروں کو صابن ملنے کے بعد اب جھانویں سے رگڑنے میں لگی تھی۔ سجاول قریب ہی خرگوشوں کے پیچھے بھاگتا پھدکتا خرگوش ہی نظر آ رہا تھا۔ سحر کی امی زرینہ دوسری چارپائی پر کسی صدمے کی زد میں آئی بیٹھی تھیں۔

"تمہارے سسر نے تمہارا ارتی برابر بھی لحاظ نہیں کیا؟" زرینہ بے یقینی سے قدرے چلا کر بولی تھیں۔

"کوئی نہیں۔" تین طرف دھیان دیتی سحر نے مسکین سے شکل بنالی۔ ماں کے ساتھ سسرالیوں کے بخیے ادھیڑنے کے علاوہ وہ سجاول کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ وہاں سے نظر ہٹاتی تو پھر پیروں کا جائزہ لینے لگتی۔

"نوکروں کے سامنے گھر کی عزت دو کوڑی کی کر دی۔" زرینہ کو نہ جانے یقین کرنا کیوں محال ہو رہا تھا۔ ناک پر انگلی رکھے کتنی دیر تک ساکت بیٹھی رہی تھیں۔

"بڈھے نے کیا پی رکھی تھی؟" پھر ہوش میں آئیں تو بنا لحاظ کیے بھڑک کر بولیں۔ چہیتی بیٹی کو سسر نے محتاج مفلوج کی وجہ سے بے عزت کر ڈالا تھا۔ معمولی بات نہیں تھی۔ ان کی بیٹی بھی جاگیرداروں کی بیٹی تھی۔ کسی اٹھائی گیرے کی نہیں۔ انہیں حق پہنچتا تھا اپنی بھڑاس نکالنے کا۔

"امی۔ چپ۔" سحر نے شانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دبی زبان میں کہا انہوں نے بمشکل باقی الفاظ حلق میں دبائے۔

"تم جاؤ۔" پاؤں دھل کر چاندی جیسے ہو گئے تھے۔ مساج سے سکون مل رہا تھا۔ لیکن ابھی امی کے ساتھ اپنی

بے عزتی کے مزید راز کھولنے تھے۔ سو سحر نے شانو کو چلتا کر دیا۔

"امی جلال ہمارے گھر کا بڑا سردار ہے تمہیں کیا معلوم۔؟"

"اللہ کی شان۔" زرینہ کے لیے اس بات کو ہضم کرنا کڑوی گولی کی طرح ہی تھا۔

"میرے سسر نے اس دن للکار کر کہا تھا۔ جس نے جلال کے ساتھ برا کیا اس نے میرے ساتھ برا کیا اور اپنے ساتھ برا کرنے والوں کو میں نے کبھی نہیں بخشا۔" بتاتے ہوئے سحر نے وہی بے عزتی محسوس کی۔ جو اس دن عالم صاحب کی ڈانٹ سننے کی وجہ سے محسوس ہو رہی تھی۔

"رسی جل گئی پر بل نہیں گئے۔" زرینہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

"تم نے طلال سے بات کرنی تھی۔"

"ارے وہ خود آ بیٹھے مجھ سے پوچھ کچھ کرنے۔" زرینہ کی انگلی پھر سے ناک پر جا ٹھہری۔ یعنی جو تعویذ مولوی کی بیوی نے دیے تھے۔ وہ بے اثر نکلے۔ طلال بھی بیوی کو آنکھیں دکھا تا تھا۔

"مولوی کی بیوی تو کہہ رہی تھی آزمودہ تعویذ ہیں۔ فوراً" اثر کرتے ہیں۔ شوہر بکری بن جاتا ہے پورا۔ حکم کا غلام۔ تو نے ٹھیک سے تو پلائے تھے نا؟"

"امی۔" سحر بے طرح جھنجلا گئی۔

"شوہر میرا میری مٹھی میں ہے۔ تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ اصل مردود یہ جلال ہے۔ میری تو ہڈیاں گھس گئی ہیں اس کی کرتے کرتے۔ کچی اس کو کچھ ہونا بھی نہیں ہے۔ اس دن میں نے صبح سے شام تک باندھے رکھا۔ مغرب ٹائم باپ نے کھلوایا۔ اتنی سردی تھی۔ پھر بھی اس کو چھینک تک نہیں آئی' مردود مشٹنڈا۔ اتنا جوان۔ کبھی کہاں' کبھی کہاں پڑا رہتا ہے۔ دیکھ کر شرم آتی ہے۔ قسم سے اس منحوس کی وجہ سے ڈانٹ پھٹکار ملی۔ کل کو مار بھی مل سکتی ہے۔ تم مولوی کی بیوی سے کہو۔ ایسا تعویذ لا دے جو اسے پلاؤں اور یہ منٹوں میں چٹ پٹ ہو جائے۔" زرینہ حقیقتاً" دہشت زدہ ہو گئیں۔ سحر کچھ زیادہ ہی بھری بیٹھی تھی۔

"میں تو حیران ہوں' لوگوں کے گھر ایسے بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور یہ اتنا پل گیا۔ کیا بڈھا ہو کر مرے گا۔"

"سحر تو نے بھی حد کی' نارتی پھکارتی تو ہے اسے۔ پر یوں باندھتی نا۔ باندھا بھی تھا تو سسر کے آنے سے پہلے کھول لیتی۔ اپنے ساتھ تو نے خود کی۔ اب آئندہ کے لیے محتاط رہ' نہیں تو عالم۔ واقعی گھنا بندہ ہے۔" زرینہ شاید عالم خان سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ تھیں۔ سحر کی دل جوئی کرنے کے بعد اب آخر میں وہی مشورہ دینے لگیں جو پہلے ہی دے دینا چاہتی تھیں۔

"غصے کو پینا سیکھ۔ تو اس گھر کے اکلوتے وارث کی ماں ہے۔ گھر کی مالکن ہے۔ اپنے مقام سے گرنے والی حرکتیں نہ کیا کر۔ باقی رہی جلال خان کی بات تو وہ بھی سدا نہیں رہنے والا۔ مجھے خود کو معلوم ہے ایسے زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہتے۔" سحر دانت بھینچے امی کی سنتی رہی۔ گفتگو کے دوران وہ اچانک ہی چپ کھا گئی تھیں۔ جیسے کہ ابھی پہلے ہی جی بھر کر اس کے سسر کو کوسا۔ آخر میں اس کے ساتھ بنا کر رکھنے کے مشورے بھی دے رہی تھیں۔

"میں دیکھتی ہوں تیری بھابیاں کیا پکا رہی ہیں۔ پکا بھی رہی ہیں یا خالی زبان چلا رہی ہیں۔" وہ گھٹنے پکڑتی کچن کی طرف ہولی تھیں۔ جہاں سحر کی بھابیاں اکلوتی نند کے آنے پر ہمیشہ کی طرح کچن چکر بننے پر کھول رہی تھیں۔ کیا ہی سحر نے طلال کو مٹھی میں کرنے کے لیے ان پر پھونکیں ماری ہوں گی۔ جو اس وقت دونوں بھابیاں کچن کی کھڑکی سے باری باری جھانکتی اس پر مار رہی تھیں۔ جل تو جلال تو کا ورد کرتیں۔ بے شک روٹیاں شانو پکایا کرتی تھی۔ لیکن باقی اہتمام ان دونوں کو خود کرنا پڑتا۔ اوپر سے سجاول کے لیے اس کی ماں کا فرمائشی پروگرام الگ۔ سو

بھابھیوں کے لیے سحری آمد شیطان کی آمد ہو جایا کرتی۔

✿ ✿ ✿

ان کا ڈیرہ کھیتوں کے بیچوں بیچ تھا۔ ایک زمانے میں یہاں کی رونق ہی اور ہوتی تھی۔ چوبیس گھنٹے آباد رہتا۔ دوست احباب' خدمت کے لیے ہمہ وقت موجود مزارعے کی کمین' کئی قسم کی محفلیں سجتیں۔ حویلی سے زیادہ ان کا یہی مسکن رہتا اور اب یہاں یہ شاذ ہی آبیٹھتے۔ اکثر برکت چاچا یہاں بیٹھا نظر آتا۔ کمروں اور احاطے کی صفائی ستھرائی' احاطے میں اگے پودوں کی دیکھ بھال وہ اپنے بچوں کی طرح کرتا۔ گاؤں کے آوارہ منش نوجوان اپنی عیاش سرگرمیوں کے لیے یہاں کا رخ کرتے تو ان کو بھگانا بھی برکت چاچا ہی کا کام ہوتا۔ حویلی کی بغلی بیٹھک کے ساتھ ساتھ اس ڈیرے پر زندگی بھی اس کے ہی دم سے تھی۔

عالم صاحب آج سرشام سے یہاں تھے۔ گیٹ کے آگے رکھی دو' چارپائیوں میں سے ایک پر تکیے سے ٹیک لگائے۔ کسی گہری سوچ میں غرق۔ تفکر کی لکیریں ان کے ماتھے پر صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ یہاں ان کی موجودگی کی وجہ سے مزارعے اور دیگر لوگ آ آ کر ملتے رہے تھے۔ شام جلدی گزر گئی تھی۔ رات کی تاریکی جیسے ہی ماحول پر قابض ہوئی' بجلی چلی گئی۔ جنریٹر خراب تھا ورنہ اس سے کام چلا لیا جاتا تھا۔ وہ بھی تب جب عالم صاحب خود یہاں موجود ہوتے۔ ورنہ برکت چاچا میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ جنریٹر کی رسی کھینچتا اور ڈیرے کو روشن کرتا۔ وہ چھوٹی سی چارجنگ لائٹ سے کام چلا لیا کرتا۔ جواب بھی دوسری چارپائی پر دھری تھی۔ جس کی روشنی گھپ تاریکی میں کسی مذاق کا باعث بنی ہوئی تھی۔ قریب ہی دتو دستی پنکھے کی مدد سے کوئلوں والی انگیٹھی دہکا رہا تھا۔ انگیٹھی سے بلند ہوتی چنگاریاں' چارجنگ لائٹ کی روشنی کا ساتھ دینے کی ناکام کوششوں میں تھیں۔ رات کی سیاہی میں دمکتی ان چنگاریوں کو اس محویت سے تکنا کہ گویا ہی کسی بچے نے آسمان پر چمکتے' بجھتے آتش بازی کے شراروں کو دیکھا ہوگا۔ گویا اس وقت کا کار ضروری ہی یہی تھا۔ بس۔

"خان جی۔" تب ہی احاطے کے گیٹ سے کھوں۔ کھوں کرتا برکت چاچا برآمد ہوا تھا۔

"یہاں بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ اندر کمروں میں چلتے ہیں۔" عالم صاحب برابر چنگاریوں کے جلنے بجھنے کا کھیل دیکھتے رہے۔

"کتنا ٹائم ہو گیا منشی۔" ان کا انداز کھویا کھویا تھا۔

برکت چاچا نے جیبیں ٹٹول کر موبائل ڈھونڈنا چاہا۔ جیبیں خالی تھیں۔ پھر تہبند کی اڑسی ہوئی جگہ پر ہاتھ مارا۔ موبائل فون وہیں اڑس رکھا تھا۔ نکال کر نزدیک سے دیکھا نو بج رہے تھے اور گاؤں ——— میں ہو کا عالم طاری تھا جیسے آدھی رات ہو چلی ہو۔

"نو ہیں خان۔" عالم خان کی آنکھیں ایک جگہ ٹکے رہنے کی وجہ سے پانی پانی ہونے لگیں۔ برکت چاچا کو لگا شاید رو رہے ہیں۔ وہ ٹھنڈ کو بھول کر فی الحال دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا کہ خان حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے۔

"میں ان ماہ و سال کی بات کر رہا ہوں' جو میں نے گزار دیے۔" وہ "یا ماضی عذاب ہے یا رب۔" والے فیز میں تھے۔ چنگاریاں یکدم آنکھوں میں چبھنے لگیں تو انہوں نے کس کر میچ لیں۔

"خان اندر چل کر بات کرتے ہیں۔" خان یاسیت کا شکار ہو رہے تھے۔ برکت چاچا جانتا تھا۔ یہ نشست لمبی ہونی ہے۔ اتنی دیر باہر ٹھنڈ میں اس کی کمزور ہڈیوں نے سن ہو جانا تھا۔ تب ہی کمزور سی آواز میں کہا مگر عالم سن ہی کہاں رہے تھے۔

"یوں لگتا ہے جیسے آنکھ جھپکی اور زندگی یہاں تک آ گئی۔ لیکن اصل میں تو جو گزارتے ہیں وہی جانتے ہیں۔

زندگی بعض اوقات دشمنی پر اتر آتی ہے۔ گزرنے پر نہیں آتی۔" برکت چاچا نے پہلے سے بندھی پگڑی کو کھول کر پھر سے باندھا اور عالم صاحب کے پیروں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ان کے پاؤں داب کر سکون کی ہلکی ڈوز دینی تھی۔ جو کبھی کام آجاتی' کبھی نہیں۔

"خان۔ وقت کا تو کام ہی گزرنا ہے' جو کل تھا' وہ آج نہیں۔ جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔" یہ بات ہر ایک پر لاگو ہوتی تھی۔ چاہے معزز روح تھا' چاہے بے روح۔ اور یہی بات خوف زدہ کر رہی تھی۔

"چاچا۔" دتو کی انگیٹھی دہک گئی تھی۔ وہ اسے اندر رکھے یا یہیں چھوڑ دے' پوچھنے کے لیے چاچا سے مخاطب ہوا تھا۔

"اندر لے جا۔ دروازے' کھڑکیاں بند کر لینا میں آکر کھول لوں گا۔" دتو سرہلاتا انگیٹھی اندر لے جانے لگا۔

برکت چاچا پھر سے عالم خان کی طرف متوجہ ہوا۔

"منشی اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو۔ تو جلال کا خیال رکھے گا۔ وہ بے زبان بہت سوں کے سر پر سوار ہے۔ اس کے دن مجھ سے زیادہ ہیں تو تو اس کی حفاظت کرے گا۔ خود سے بڑھ کر اس کی خبرگیری کرے گا۔"

"خان آپ سلامت رہیں۔ آپ خود اس کے سر پر چھت بنے رہیں گے' لیکن آپ کا کہا سر آنکھوں پہ۔ میں اپنی جان سے بڑھ کر اس کا خیال رکھوں گا۔" منشی کو وہ یہ ہدایت نہ بھی دیتے تو بھی اس کا سب کچھ ان پر قربان ہی ہوتا۔ وہ نمک خواری کا حق ادا کرنے والوں میں سے تھا۔ عالم خان نے شاید ایک اسی بات کے لیے باقی ساری باتوں کی تمہید باندھی تھی۔ کہہ چکنے کے بعد انہوں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ جلال کے پاس وہ خود سوتے تھے اور اب کافی ٹائم ہو رہا تھا۔ اس کے جاگنے سے پہلے انہوں نے حویلی پہنچنا تھا۔ دتو اپنے سیل فون کی لائٹ جلائے ان کے ہمراہ ہوا۔ چارجنگ لائٹ وہیں ڈیرے پر برکت چاچا کے کام آنی تھی۔ جو چند قدم آگے تک خان کو الوداع کہنے آیا تھا۔

✿ ✿ ✿

جمیلہ کے ساتھ مل کر انہوں نے عقیدت کے صبح کالج پہنے جانے والے کپڑے منتخب کیے۔ جب تک وہ استری کرتی' وہیں وہاں کے ساتھ ساتھ موجود رہیں۔ عقیدت کے جوتے' بیگ' شال سب ریڈی تھا۔ وہ دونوں ایسے پرجوش ہو رہی تھیں جیسے مائیں اپنے بچوں کو پہلے دن اسکول بھیجتے پر ہوتی ہیں۔

"باجی۔ عقیدت سے زیادہ تو آپ گھبرا رہی ہیں۔" جمیلہ کا تجزیہ غلط نہیں تھا۔ ان پر واقعی گھبراہٹ سوار تھی۔ گویا کہ انہوں نے خود کالج پڑھنے جانا ہو۔

"ظاہر ہے۔ پہلی بار ہو رہا ہے۔ عقیدت میرے بغیر کوئی کام کرے گی۔ ہمیشہ اس کی انگلی پکڑے میں اس کے ساتھ موجود رہی ہوں۔ اب سے وقت بدلنے جا رہا ہے۔ اس کے صحیح معنوں میں بڑا ہونے کا ٹائم آگیا ہے۔ پہلی بار وہ اتنی بھیڑ کا سامنا کرے گی۔ اس کی سمجھداری اور بہادری کا امتحان ہے۔ میڈیکل کا نہیں۔"

"باجی پہلی نے داخلہ تو لیا تھا نا ایف ایس سی میں۔ جاتی تو رہی ہے وہ کالج۔ تجربہ ہے اس کو مشکل نہیں ہوگی۔" عقیدت کا اپنے شہر کے ڈگری کالج میں داخلہ ہوا تھا۔ جمیلہ اسی کا حوالہ دے رہی تھی۔

"ہاں لیکن خاص خاص دنوں میں۔ وہاں کالج میں حاضری ایسا خاص مسئلہ نہیں تھی۔ اس لیے عقیدت بہت کم جاتی تھی۔ بلکہ عقیدت کیا وہاں ایف۔ ایس سی کی سب لڑکیاں ایسا کرتی تھیں۔ کالج کم جاتیں اور اکیڈمی باقاعدگی سے جاتیں۔"

"پہلی کی طرح۔" جمیلہ نے مسکرا کر لقمہ دیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن جمیلہ ماحول کا بھی فرق ہوتا ہے۔ وہاں کی چھوٹی سی اکیڈمی کی اکثر لڑکیاں عقیدت جیسی ہی تھیں۔ بزدل نہ سہی مگر سادہ سی اور یہاں اتنا بڑا کالج۔۔۔ قسم قسم کے اسٹوڈنٹس۔۔۔ میرا خود کا دل دھڑک جاتا ہے۔" وہ بار بار انگلیاں موڑ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوگا باجی! دل کو سنبھالیں۔ عقیدت بہت سمجھ دار ہے ' دیکھنا رچ بس جائے گی۔" انہوں نے منہ ہی منہ میں ان شاء اللہ کہا اور اپنے بیڈروم میں آگئیں۔ عقیدت آج جلدی سو گئی تھی۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

"مجھے یقین ہے میری بچی بہت آگے جائے گی۔ بہت کامیاب انسان بنے گی۔ دنیا والوں کے لیے مثال ثابت ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔۔۔ اور میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ تمہاری ہمت بڑھاتی۔ اللہ تمہیں نظربد سے بچائے۔ ڈھیروں خوشیاں دے۔ جو نہیں ملا وہ سب میسر آئے۔ آمین۔" انہوں نے نرمی سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا تھا۔ وہ ہلکا سا کسمسا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

مائدہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے رجا کی ٹانگیں اکڑ گئیں۔

"کیا مصیبت ہے' کہا بھی تھا یہیں کوریڈور میں رہنا' میں بس ابھی آئی۔" وہ کوئی تین چکر تو کینٹین کے بھی لگا آئی۔

"مائدہ بیٹی یہاں تو نہیں آئی۔" انکل نے جمایا تھا۔ وہ جلتی بھنتی دوبارہ گراؤنڈ میں آگئی۔ سر حامد کا لیکچر ختم ہونے کی وجہ سے فرسٹ پروف کے لڑکے لڑکیاں گراؤنڈ میں تتر بتر ہو رہے تھے اور مائدہ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

"کہیں ہاسٹل تو نہیں چلی گئی۔" اس خیال نے خون میں اضافی کھولن پیدا کر دی۔ سیل نکال کر اسے کال کرنے ہی لگی تھی کہ وہ دور کوریڈور میں رابعہ وقار کے ساتھ نظر آگئی۔

"ابھی پوچھتی ہوں۔" دانت پیستی خطرناک ارادے کی پکی پکی تکمیل کے لیے وہ اس کی طرف ایسے جانے لگی کہ بس آستینیں چڑھانا باقی تھیں۔ جب کسی نے اچانک ہی۔۔۔ ناگہانی آفت کی طرح اس کا بازو دبوچ کر اسے رکنے پر مجبور کیا۔ وہ حیرت و غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ بازو پکڑنے والے کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بات سنیں۔۔۔ آپ کا نام کیا ہے؟" وہ کوئی خاتون تھیں اور انتہائی شائستگی سے مخاطب تھیں۔

"رجا۔" باوجود اس کے کہ انہوں نے بالکل غلط طریقے سے اسے روکا تھا۔ وہ بنا جھنجلاہٹ کے نام بتا گئی کہ وہ خاتون اتنی حسین اور دلکش تھیں کہ رجا جیسے ٹرانس میں آگئی۔

"رجا۔ آپ کا کون سا سال ہے؟" وہ نہ جانے کیوں پوچھ رہی تھیں۔

"فرسٹ ایئر۔" رجا کچھ متعجب ہوئی۔

"رجا بیٹا۔ میری بیٹی کا بھی فرسٹ ایئر ہے۔ آپ پلیز اس کی دوست بن جائیں۔" مارے حیرت کے رجا سے ہاں۔۔۔ نا کچھ بولا ہی نہ گیا۔ اس نے گفتگو کے دوران پہلی بار خاتون کی بیٹی کی طرف نظر اٹھائی تھی اور اسے ششدر ہونا پڑا۔

(باقی آئندہ)

"کبھی آپ نے گنایا ہوا چاند دیکھا ہے"
یہ سوال اس کے ذہن میں کئی برسوں سے کلبلا رہا تھا۔
"مگر گنایا ہوا چاند اتنا خود سر اور ضدی نہیں ہوتا۔"
اجمل سعدی نے اپنے سوالوں کو تھپک کر سلانا چاہا تھا۔
وہ کبھی کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا اور کبھی کتاب کے صفحے میں گم ہو جاتا۔ اور پھر اس عام سی شہزادی کو نیچا دکھانے کے منصوبے بنانے لگتا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔
"محبت انتقام بھی ہے۔ شہزادی تمہیں زیر کر کے رہوں گا اور تمہارے بے زبان جذبوں کو زبان دوں گا۔"
اس نے فیصلہ کیا اور اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل پر آگیا۔

محبت سب سے بہتر ہے
کوئی بھی دل ربائی کب بھلا اس کے برابر ہے
یہی اک بات تھی اس میں
یہی اک بات تھی اس میں کہ میں ہر شام
اسی ویران کینٹے کے اس خاموش گوشے میں
اسی کا منتظر رہتا
وہ ورنہ عام سی لڑکی
نہ اس کی آنکھ میں جادو
نہ اس کی زلف میں خوشبو
نہ اس کی ناک میں ہیرا
نہ اس کے کان میں موتی
نہ اس کے لب میں شیرینی
نہ اس کی چائے میں چینی

جلیل ہاشمی کی یہ نظم اس نے اخبار کے ادبی صفحے سے رقم کر کے شہزادی عامر کے آفس کے پتے پر پوسٹ کر دی تھی۔ یہ نظم اس کی شخصیت کی کتنی صحیح عکاسی کر رہی تھی۔ یوں لگا جیسے اس کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو مسلکتے دل کو قرار آگیا ہو۔ احساسات کو زبان مل گئی ہو۔ وہ گزشتہ چار سال سے اس بے حس لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔

مگر وہ پتھر موم ہی نہ ہوتا تھا۔
اسے یعنی اجمل سعدی کو کبھی کبھی خود پہ بہت حیرت ہوتی۔ وہ بچپن سے ہی حسن پرست رہا تھا۔ وہ ہر چیز پر خوب صورتی کو ترجیح دیتا۔ اس کے بچپن کے کھلونوں میں باہر کی نایاب چیزیں ہوتیں۔ جن میں نمایاں خوب صورت گھر، حسین ترین گڑیا، خوب صورت موٹی بلیاں اور فطرت کے بے شمار ایسے حسین ترین مناظر جن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔
اور جس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ وہ بھی جدی پشتی نواب تھے۔ پہننے اوڑھنے سے لے کر رکھ رکھاؤ تک ہر چیز میں ایک حسن تھا۔ نزاکت تھی۔ دنیا بھر کے نایاب و خوب صورت پودے لیے چوڑے لان میں ایستادہ تھے۔ خوش نما پھول جابجا کھلائی دیتے تھے اس گھر میں دل سے لے کر دماغ تک ہر چیز میں ایک نوابی شان، تمکنت اور غرور تھا۔
یہی غرور اجمل سعدی کے وجود میں رچ گیا تھا۔ نزل احمد سعدی کی پانچویں اولاد تھا۔ یعنی تین بہنوں اور ایک بھائی کے بعد اس کی آمد دنیا میں ہوئی تھی۔ سب بہن بھائی شکل و صورت میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ علم و ہنر میں یکتا تھے اعلا تعلیم کے حصول کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔
دو بھائیوں نے وہیں اپنی دنیا بسالی تھی۔ مگر کاروبار یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ ہر ایک کی جڑیں ایک دوسرے کے ساتھ دلوں تک گہری تھیں۔ اجمل سعدی کے سوا سب بہن بھائیوں کی شادیاں اعلا خاندانوں میں ہو چکی تھیں۔ سب اپنی دنیا میں مگن اور خوش تھے۔ ان سب کا معاشرے میں ایک مقام تھا پہچان تھی۔
پہچان تو خیر اجمل سعدی کی بھی تھی۔ وہ اپنے دوستوں میں ہر دل عزیز تھا۔ دل نواز تھا مگر دل پھینک نہ تھا، اپنی باوقار شخصیت میں ایک مثال تھا۔ اس کے احباب میں ایک سے ایک دوست اس کی شرافت کو توڑنے کے درپے رہتے۔ مگر وہ اس معاملے میں بالکل پھسلتا نہ تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی حسن کا دیوانہ تھا۔ آسلا

سے کسی شے پہ راضی نہ ہوتا۔ اس کے خاندان اور خاندان سے باہر کی کتنی ہی لڑکیاں اس کی طلب گار تھیں۔ اشاروں کنایوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھیں۔ کئی گھرانے شادی کے لیے پیغام بھیج چکے تھے۔ مگر وہ ابھی راضی نہ تھا۔ اس کے والدین نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان کا لخت جگر اور آخری نور نظر تھا۔
اجمل سعدی کی بے چین فطرت کچھ تو اس کو ملکوں ملکوں لیے پھرتی کچھ وہ سیمابی طبیعت کا مالک بھی تھا۔ جانے کتنی ہی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ انٹرنیٹ پہ چیٹنگ کر کر کے اس کی طبیعت اوب سی گئی تھی۔ اچانک اس کو اپنے آپ سے، ماحول سے، اردگرد سے وحشت ہونے لگی۔ اس کو اپنی ہی دنیا مصنوعی لگنے لگی۔ شاید آسائشات کی زیادتی نے اسے بیمار کر دیا تھا۔ وہ فرار چاہتا تھا اور فرار ہو ہی گیا۔ بغیر کسی کو بتائے خوشی سے وہ اسلام آباد سے اچانک کراچی آگیا۔
کراچی کے ایک رہائشی علاقے میں ان کا اپنا ایک اپارٹمنٹ تھا جو مدتوں سے خالی تھا۔ شاید کبھی کرائے پر دیا گیا ہو لیکن اب خالی تھا اور اس خالی گھر میں اس نے اپنی دنیا بسالی تھی۔ زندگی کی تمام سہولیات اس گھر میں بھی میسر تھیں۔ پھر یہ کہ یہاں اسے سکون تھا دل کو چین اور قرار تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے دوسرے اپارٹمنٹ کا منظر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ یہاں بیس اکیس فیملیز آباد تھیں۔ بالکونی سے وہ دور تک ہرے بھرے مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس علاقے کے ہر گھر میں گملوں اور پودوں کی بہتات تھی۔ سب کا حسن ذوق اور سلیقہ نظر آتا تھا۔ بوگن ویلیا اور منی پلانٹ کی بیل خوش رنگ انداز میں پھیلی ہوئی تھی۔
اس اپارٹمنٹ کی دنیا میں رہتے ہوئے اسے ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ کرمو ان کا پرانا ملازم تھا، جو کراچی میں رہتا تھا وہ اکثر دوپہر اور رات کا کھانا تیار کر دیتا تھا۔ وہ اتوار کی صبح ہی آکر دوپہر اور رات کا کھانا بنا کر جا چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے ضروری کام سے حیدر آباد جانا ہے، وہ رات تک لوٹ آئے گا۔
اجمل سعدی کو کوئی اعتراض نہ تھا، وہ اب اس زندگی کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ پورا دن اس نے سو کر، اخبار کی خبریں پڑھ کر، بالکونی میں کھڑے ہو کر گزار دیا۔ آٹھ بجے کے بعد کرمو کا بنایا ہوا کھانا گرم کر کے کھایا اور پھر ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز کو دھیان و بے دھیانی کے ساتھ بدلتا رہا۔
کتنی ہی دیر گزر گئی، نہ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں تھا کہ اپارٹمنٹ کے دروازے کی مخصوص بیل ڈور نے اسے نیند سے چونکا دیا، وہ حیران تھا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے کرمو کی طرف دھیان گیا، مگر ابھی اس کی واپسی میں شاید دیر تھی۔ دروازہ کھلا تو اجمل نے اپنے خیالات کی نفی کی، سامنے واقعی کرمو کھڑا تھا۔
"تم اتنی جلدی، میرا خیال تھا کہ تمہیں آنے میں مزید دو گھنٹے اور لگیں گے۔ خیر سفر کیسا گزرا اور کیا تمہارا کام ہو گیا؟" وہ اپنی دھن میں بولتا ہوا لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔
"وہ صاحب جی!" کرمو نے اسے آواز دی۔
"ہاں بولو؟" وہ ریموٹ لے کر پھر چینل بدلنے ہی والا تھا کہ کرمو دوبارہ بول پڑا۔
"وہ جی۔ میرے ساتھ یہ بی بی جی بھی ہیں۔ بڑی افرا پڑ گئی تھی جی۔ بڑا ہی رولا پڑا تھا، یقین ہی نہیں آتا، یہ اپنا شہر ہے۔ اپنے لوگ ہیں، پھر یہ بی بی جی بڑی مصیبت میں تھی، افراتفری مچی تھی۔ میں ان کو لے آیا جی! آئیں بی بی جی، آگے آجائیں۔ ہمارے صاحب بہت اچھے ہیں۔"
کرمو کی اچھی خاصی داستان سن کر وہ مڑا اور سامنے متوجہ ہو گیا۔ جہاں بلیو جینز کے ساتھ اجرک کے کرتے میں حجاب پہنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ جو کہیں سے بھی کسی مصیبت میں گھری نظر نہیں آرہی تھی۔ کم از کم اس کم عمری کی زندگی میں کسی کو پرکھنے کا اتنا تجربہ اسے ضرور تھا۔
وہ سوالیہ انداز میں اس لڑکی کو دیکھنے لگا تو وہ اپنا

تعارف کرواتے ہوئے بولی۔

میرا نام شہزادی عامر ہے۔ میں میڈیا وژن سے وابستہ ہوں۔ ہماری ٹیم کلفٹن کے علاقے میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں "ملنگ نما خواتین" پر ڈاکومنٹری بنا رہی تھی تو وہیں اس سے ملحقہ سڑک پر ایک ناخوشگوار اور اذیت ناک حادثہ پیش آگیا اس لیے پوری ٹیم بکھر گئی۔ ہمارا کیمرہ مین زخمی ہو گیا۔ بس کچھ سمجھ میں نہیں آیا اسی افراتفری میں آپ کے کرمو بابا رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تو مجھے ان کے ساتھ آنا پڑا۔ اتنی رات کو تکلیف کی معذرت چاہتی ہوں۔" اس نے مختصراً" بتایا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ یہاں سے اپنے گھر اطلاع کر سکتی ہیں۔ آپ کے گھر والے آپ کو یہاں سے لے جائیں گے۔ کرمو بابا! آپ ان کے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔ تب تک آپ فریش ہو جایئے۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

"مگر ایک بات کی وضاحت کروں گی۔" اس نے فوراً" کہا۔

"جی کہیے۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرے گھر والے اس شہر میں نہیں رہتے' میں اسلام آباد میں رہتی ہوں۔ وہیں میرا آفس ہے' میرا وہاں سے یہاں آنا ہوا ہے۔ اسی لیے اس اجنبی شہر میں کسی سے شناسائی نہیں ہے۔ ہم لوگ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اچانک یہ ناخوشگوار حادثہ پیش آگیا' اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا' سب بکھر گئے۔ ہم آٹھ افراد ہیں' تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔ افراتفری اور اندھیرے میں کسی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس لیے میں یہاں آپ کے سامنے۔" اس نے آخری گفتگو رک رک کر کی۔

اجمل کو یہ سن کر انجانی خوشی ہوئی کہ وہ اسلام آباد میں رہتی ہے' اسی کے شہر میں۔

"پھر بھی کوئی بات نہیں۔ آپ گھبرایئے نہیں' آپ کے جو ساتھی جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں' وہ یقیناً" کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچیں گے وہاں کا ٹیلی فون نمبر مجھے دیجیے میں رابطہ کرتا ہوں۔" اس نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

اتنا کہہ کر وہ لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اپنے بیگ سے کارڈ نکال کر اس کے قریب آئی تو اس نے کارڈ تھام لیا۔

فائیو اسٹار ہوٹل کا نمبر ڈائل کیا تو تھوڑی سی جدوجہد کے بعد مطلوبہ نمبر مل گیا۔ آپریٹر لائن پر تھا۔ اس نے میڈیا وژن سے آئی ہوئی ٹیم کے بارے میں دریافت کیا تو آپریٹر نے کہا کہ وہ ٹیم کسی کوریج کے سلسلے میں باہر ہے۔ ابھی کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ اوکے کہہ کر اس نے فون رکھ دیا' وہ اس کی بات کی منتظر تھی۔

"آپ کی ٹیم کا کوئی فرد ابھی تک ہوٹل نہیں پہنچا ہے۔ میرا خیال ہے' آدھے گھنٹے بعد فون کرتے ہیں۔ جب تک آپ فریش ہو جائیں۔" اس نے نہایت شائستگی سے کہا اور کرمو بابا کو اشارہ کیا کہ وہ بی بی کو اندر لے جائیں۔

وہ دھیمے قدموں سے کرمو بابا کے ساتھ اندر کے حصے میں چلی گئی۔

اور وہ اس لڑکی پر پڑنے والی افتاد پر غور کرنے لگا' سونا تو اب بے کار تھا۔ یوں ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھے میگزین اٹھا کر ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اجنبی لڑکی اس کے قریب آگئی۔

"پلیز۔ دوبارہ فون کرلیں۔" اس کے چہرے پر فکر مندی و پریشانی کے گہرے آثار تھے۔

"اوکے۔" اس نے میگزین ٹیبل پر رکھا۔ اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹیلی فون نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مسلسل بیل ہو رہی تھی' شاید آپریٹر سو گیا تھا' تیسری دفعہ ڈائل کرنے کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا اور آپریٹر نے جو بات بتائی' اسے سن کر وہ عجیب سا ہو گیا اور دل ایک دم کٹ کر رہ گیا' یوں بھی ہو سکتا ہے۔ ساری معلومات حاصل کرکے اس نے بمشکل فون رکھ دیا۔

وہ اجنبی لڑکی اس کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پر

پریشانی ہویدا تھی۔

"آپ کو ابھی میرے ساتھ اسپتال چلنا ہو گا۔ آپ کی دو ساتھی وہاں زخمی حالت میں ایڈمٹ ہیں۔"

"جی۔" اس نے دھڑکتے دل کو تھام کر اپنے حواس کو بحال کرتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟"

"وہاں چل کر دیکھ لیتے ہیں میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔"

شہزادی کی ذہنی حالت مخدوش سی تھی۔ جب تک وہ گاڑی کی چابی لے کر نہ آگیا۔ وہ یوں ہی بت کی طرح ساکت کھڑی رہی۔

اس کی آواز پر وہ چونک کے خالی الذہن سی بوجھل قدموں کے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑی۔ کراچی کے مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی اجمل کی گاڑی اسپتال کے سامنے جا کر رکی۔

ایمرجنسی وارڈ کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے ہی لابی میں پہنچے پورا گروپ تو نہیں مگر دو تین کے علاوہ سب بے چینی سے کھڑے تھے۔

شہزادی تیزی سے ان کی طرف بڑھی تو یکایک اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔

"شکر ہے۔ شہزادی کہاں تھیں تم' کتنا ڈھونڈا تمہیں؟"

"او خدایا!"

"پاگل ہو گئے ہم تو۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

اس کے ساتھیوں کی مختلف آوازیں اور گفتگو اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور ان کی پریشانیوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تب ہی وہ بھی آگے بڑھا' اپنا تعارف کروایا۔

ان سب نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ان سب کے لیے اپنی خدمات حاضر کیں تو وہ بولے۔

"خدارا۔ ہمیں پولیس اور اخبارات کے چکروں سے بچالیں۔ ہم ویسے ہی پریشان ہیں۔ ہماری دو کولیگز زخمی حالت میں اندر بے ہوش ہیں اور یہ لوگ ہمیں گھیرے ہوئے ہیں۔"

"اوکے۔ آپ اطمینان رکھیے' میں ان لوگوں سے نبٹتا ہوں۔"

وہ اپنے تعلقات استعمال کرکے پولیس اور صحافیوں کو وہاں سے فی الوقت ہٹانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ گو کہ پولیس بضد تھی کہ وہ لڑکیاں ہوش میں آجائیں تو ان کا بیان ریکارڈ کرلے۔ مگر موقع کی نزاکت کا احساس دلا کر ان کو راضی کر ہی لیا گیا۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ اس طرف جہاں اریبہ کے ساتھی کھڑے تھے۔ خود بھی ان ہی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اجنبی شہر میں کس پریشانی میں گھر گئے تھے یہ لوگ۔ یوں ہی اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ایمرجنسی وارڈ کی طرف سے ڈاکٹرز آتے دکھائی دیے' سب بے قراری سے ان کی طرف بڑھے تو ڈاکٹرز نے بتایا۔

"ایک لڑکی ابھی بے ہوش ہے۔ اس کے سر میں شدید گہری چوٹ ہے۔ خون اس قدر تیزی سے بہہ رہا ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا' بہر حال اللہ مالک ہے۔"

جبکہ دوسری لڑکی کو شدید چوٹیں آئی تھیں اور پسلی کی ہڈی بھی متاثر تھی۔ اس کی بینڈیج وغیرہ کر دی گئی۔ ان شاء اللہ اسے دو تین گھنٹے میں ہوش آجائے گا۔ آپ لوگ دعا کیجیے۔ ڈاکٹرز یہ کہہ کر آگے بڑھ چکے تھے۔

"نزل کے سر میں چوٹ ہے یا اللہ اسے بچالے اور ان ظالم لوگوں کو تو نہ چھوڑنا۔" شہزادی کی دوست ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔

"مصباح بھی ہوش میں نہیں ہے۔"

"ہم ان لوگوں کو بغیر سزا کے نہیں چھوڑیں گے۔" وہ سب آپس میں روتے' سسکتے ہوئے بات کر رہے تھے۔

وہ کون لوگ تھے' کیسے لوگ تھے جنہیں اپنی بہنوں' بیٹیوں کی عزت کا پاس نہیں ہے۔

کیا وہ انسان نہیں تھے؟

کیا انہوں نے انسانی معاشرے میں آنکھ نہیں کھولی۔

کیسے بے درد تھے، کمزور عورت کو مسل ڈالا۔

تف ہے ایسے مردوں پہ۔ جس نے عورت کے بطن سے جنم لیا اسی کے احترام اور عزت کو پامال کیا۔

اللہ۔ کیسی اندھیر نگری ہے۔ یا اللہ ان کے ذہنوں کو اجال دے۔ ان کا میلا پن دور کردے۔ ان سب کے دلوں سے زخمی آہیں نکل رہی تھیں۔

اجمل ان کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا، محسوس کررہا تھا مگر اس کا دماغ بھی کام نہیں کررہا تھا۔

وہ پوری رات یوں ہی تمام ہوگئی تھی۔ شہزادی اپنی دوست کے کندھے سے لگی ہوئی چپ بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھیں پتھر کی طرح ساکت تھیں۔

"یا اللہ۔ ان لڑکیوں کو ہوش آجائے۔ ورنہ۔۔۔؟"

ایک خدشہ دل میں ابھرا تو اس نے فوراً" اپنے خیالات کی نفی کی۔

انسان بھی کتنا مجبور ہے۔ اپنی سوچوں کے پنجرے سے باہر نہیں آسکتا۔ جو خدشے اس کے دل میں پرورش پارہے ہوں۔ قدرت اسے سچ کردیتی ہے۔

وہ معصوم لڑکی نرمل، جو میڈیا وینسں سے وابستہ ہوکر زندگی کے حقائق کو دستاویزی شکل میں سامنے لاتی تھی۔ سر کی گہری چوٹ کو اندر ہی اندر برداشت کرکے زندگی سے ناتا توڑ بیٹھی اور بے چاری مصباح کو ان ظالموں نے اس قدر چوٹیں پہنچائی تھیں کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ پسلی کی ہڈی جڑنے کے بعد بھی کتنے دن زندگی کی رنگینیوں سے دور رہے گی اور پھر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اخبارات نے اس ہولناک حادثے کی کور اسٹوری شائع کی تھی۔ پولیس نے اس کیس کی تفتیش پہ کتنے ہی لوگوں کا گھیراؤ کیا۔ کتنے بے گناہوں کو جیل میں بند کردیا۔ مگر سب بے کار۔

جو ہونا تھا، وہ تو ہوچکا تھا۔ ایسے نقصان کبھی پورے نہیں ہوتے۔

اجنبی شہر کے اجنبی راستوں میں بہت قیمتی لوگ کھوگئے تھے۔ شہزادی عامر اس حادثے کو سہہ کر بہت خاموش ہوگئی تھی۔ اجمل تقریباً" روز ہی ان سب سے ملنے ہوٹل آجاتا اور ایک طویل وقت ان کے ساتھ گزارتا۔

یوں ہی بہت سے اداس دنوں کی ایک شام شہزادی نے بتایا۔

"وہ لوگ واپس اسلام آباد جارہے ہیں۔ اب مصباح تھوڑی بہتر ہے آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارا بڑا ساتھ دیا۔" اس نے رسمی سے انداز میں کہا۔

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ میرے شہر کی ہیں۔ آپ سب کے دکھ میرے دکھ ہیں۔ اتنے فارمل انداز کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں پھر بھی۔ اگر اس رات آپ کے گھر پناہ نہ ملتی تو۔ یہ بات تو یاد رکھنے کی ہے۔"

"خیر۔ یاد رکھنا اچھی بات ہے، مگر اسے اس طرح لیجیے کہ اللہ کو آپ کو بچانا مقصود تھا۔ اس لیے اس نے آپ کو میرے گھر بھیج دیا۔"

"اجمل صاحب! اس شہر نے بے امان کردیا ہے ہمیں۔ ہم اپنے ہی شہر کے اپنے لوگوں میں لٹ گئے۔ جانے یہ حادثہ ہمارے ذہنوں سے کب نکلے گا۔ آپ کو نہیں پتا، میرے وجود میں کیسی نفرت بھر گئی ہے۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔"

وقت رخصت وہ بہت سے لفظ لفظ جوڑ جوڑ کے اس کی بکھری شخصیت کو سکون دینا چاہتا تھا۔ مگر کبھی کبھی کچھ بھی نہیں کیا جاتا۔ وہ یوں ہی بے ربط باتیں کرکے اپنے اسی مخصوص حلیے میں اپنے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

اس المناک حادثے کے بعد اجمل سعدی بھی کراچی میں نہ رہ سکا۔ واپس اسلام آباد آگیا۔

☆ ☆ ☆

اکثر رات کے کسی پہر بلیو جینز اور اجرک کے کرتے میں ملبوس وہ لڑکی اس کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ پریشان اور الجھی الجھی سی یہ تصویر اس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی اور یوں ہی اسے سوچتے اور کاروبار زندگی میں مصروف ہوتے ہوئے کتنی ہی گھڑیاں بیت گئیں۔

وہ عام دنوں میں سے ایک عام سا ہی دن تھا۔ اخبارات کی ورق گردانی اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے دوسرا صفحہ پلٹا تو حقوق نسواں کے نمایاں پیج پر اس کی نظر ٹھہری گئی۔

"حقوق نسواں" اس عنوان کے تحت "خواتین کے حقوق کی پامالی" پر سیمینار میں مختلف این جی اوز کے عہدے داران کے ساتھ نمایاں تصویر تھی۔

اس کی تصویر دیکھ کر دل کو ایک انجانی سی خوشی ہوئی اور اس سے ملنے کو دل چاہنے لگا۔

اور پھر ایک دن وہ میڈیا وژن کے دفتر پہنچ گیا۔ دوسرے فلور پر اس کا کمرہ تھا۔ اس سے ملنے سے پہلے اس کے کولیگز اسے پہچان گئے اور خاصی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ شہزادی آج کل ہیومن رائٹس کے ساتھ خواتین کے ساتھ ظلم و تشدد پر کام کررہی ہے۔ ان کے تعاون سے سارے حقائق کو سامنے لاتی ہے۔ ثبوت کے لیے اسے دور دراز کے گاؤں، وکیلوں کی گواہیاں چاہیے ہوتی ہیں۔ جس کے لیے وہ دن رات کام کررہی ہے۔ اس کے آنے میں کم از کم دو گھنٹے ہیں۔ وہ اس کا انتظار کرلیتا، مگر وہ تھکی ہوئی آئے گی۔ یہی سوچ کر وہ اٹھ گیا اور پھر کسی روز آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

وہ بہت خطرناک موضوع پر کام کررہی تھی۔ اسے فکر سی ہونے لگی، وہ اس کی دستاویزی فلمیں بڑے غور سے پڑھتا بھی تھا اور دیکھتا بھی تھا۔ سچ کہنا کتنا آسان ہوتا ہے، مگر سچ کا سامنا کرنا سب سے مشکل۔ وہ اس سے مل کر یہ سب کہنا چاہتا تھا۔

ایک روز آفس سے واپسی پر اس کی گاڑی "میڈیا وژن" کی طرف مڑ گئی۔

"شاید وہ ہو۔" امید کی کرن کے ساتھ وہ اس کے روم کی طرف آگیا۔ وہ اپنی کرسی پر براجمان تھی۔ اس کی سائیڈ ٹیبل پہ کمپیوٹر تھا، وہ کسی کور اسٹوری پر کام کررہی تھی۔

اس کی آمد پر وہ چونکی اور ایک شناسا مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔

"مجھے معلوم تھا آپ آئیں گے۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"کیسے؟" وہ حیران ہوا۔

"اس لیے کہ جب آپ مجھ سے ملنے آئے تھے، اس وقت آپ کی اور میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"اوہ!" اس کی حیرانی دور ہوئی۔

انٹرکام پر اس نے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کے لیے کہا اور اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ پہلے دن والی پریشان لڑکی کتنی بدلی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ وہی ڈھیلا ڈھالا سا کرتا، جینز اور گلے میں اسکارف پہنے، سادہ سی لڑکی اپنے انداز میں یکتا تھی۔ نہ غیر معمولی حسن، نہ نقش و نگار، بس عام سی لڑکی جو اپنے کردار اور گفتار میں خاص تھی۔ کیا بات تھی اس میں؟ کیا بے پناہ کشش تھی؟ اس کا چہرہ کتنا معصوم اور پرکشش ہے۔ اس کے سراپے میں سلونی ہے، وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ گیا۔

"کن سوچوں میں گم ہیں؟" وہ کمپیوٹر آف کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔ بتائیں آپ کیسی ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، بری طرح مصروف رہتی ہوں۔ شاید یہی زندگی ہے۔"

"زندگی تو بہت خوب صورت ہے شہزادی بی بی، آپ تو اپنی دنیا میں گم رہتی ہیں۔ کبھی اس سے باہر نکل کر دیکھیے، پھر آپ کو اندازہ ہوگا۔" اس نے جیسے اسے احساس دلایا۔

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے اور بہت احساس ہے کہ زندگی کتنی خوب صورت ہے۔" وہ تلخی اور گہرے دکھ سے بولی۔

"لیکن اس خوب صورت زندگی کو بد صورت بنانے والے بے حس لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"تو شہزادی! آپ ابھی تک اسی حصار میں ہیں۔ بھولنے کی کوشش کیجیے ' خدارا اسے 'جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔"

"صحیح کہا آپ نے جو ہونا تھا ہوچکا۔" وہ طنزیہ ہنسی ہنس کر بولی۔

"مسٹر' میرے ساتھ میرے کولیگز کے ساتھ جو کچھ پیش آیا' کیا میں اسے بھول سکتی ہوں۔ کبھی نہیں میں کبھی معاف نہیں کرسکتی' ان سفاک لوگوں کو جن کے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔" وہ بہت سرد لہجے میں کہہ رہی تھی۔

اس ایک لمحے میں اجمل سعدی نے محسوس کیا کہ اس کو سمجھانا اس وقت مناسب نہیں۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔

"آپ کیا کرسکتی ہیں ایسے لوگوں کے لیے۔" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"میں کیا کرسکتی ہوں' نہیں' بلکہ جو کچھ کررہی ہوں' اسی میں بہت کچھ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس راہ میں پتھر بہت ہیں اور گہری کھائیاں بھی ہیں۔ خیر اب تو میں عادی ہوگئی ہوں۔"

اسی گفتگو کے دوران میں چائے آگئی تھی۔ چائے کا گرم سپ لے کر اس نے اس کی بہت سی تلخ باتیں برداشت کیں اور بولا۔

"بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ یہ میری آپ سے آخری ملاقات نہ ہو' اس لیے تھوڑی سی خوشگوار باتیں کرلینے میں کیا حرج ہے۔"

"اوہ۔ سوری!" اس کی بات سمجھ کر اسے اندازہ ہوا کہ واقعی اس کی باتوں میں کتنی کڑواہٹ ہے اور وہ ایک دم مسکرادی تو اس کے چہرے پر کھنچا تناؤ پل بھر میں غائب ہوگیا۔

"ایک بات ہے' آپ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔ اپنی عمر سے بڑی مت بنیں۔ کچھ آنے والی عمر کے لیے بھی چھوڑدیں۔ ورنہ خرانٹ مشہور ہوجائیں گی۔"

"کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ ہم عقربی (Scorpio) لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ باتوں میں زہر ہوتا ہے اور زبردست کٹ ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ اسے ساتھ لے کر چلتے ہیں' رسک لینا ان کی ہابی ہے اور سب سے بڑھ کر تنک مزاج ہوتے ہیں اور۔"

"بس۔ بس۔" اجمل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی خوبیوں سے انکار نہیں' ایسے افراد کو لبرا ہی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے لبرا اور اسکارپیو کی دوستی بہت کامیاب رہتی ہے۔"

"آپ نے سچ کہا۔" وہ ایک دم بولی۔

"مگر لبرا تھوڑے بے پروا اور فلرٹ ہوتے ہیں۔"

"اب کیا کریں۔ ان کی پرسنالٹی ہی ایسی ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو دیوانی ہوتی ہیں۔" وہ بہت شوخی سے اترا کر بولا۔

"اتنا زعم ٹھیک نہیں ہوتا۔ لڑکیاں تو معصوم اور نادان ہوتی ہیں' مرد تو انہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔" وہ فوراً بولی۔

"وہ بہت۔ خیر۔" وہ نجانے کیا بولنا چاہ رہا تھا کہ رک گیا۔

"اب اس بحث کو رہنے دیں' ورنہ بات بہت آگے تک جائے گی۔"

"اوکے!" اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

یوں ہی بہت ساری باتوں میں وقت گزر گیا لو پتا ہی نہیں چلا کہ ان کے درمیان خاصے تکلف کے پردے ختم ہوچکے ہیں۔ اگلی دفعہ ملنے کا کہہ کر وہ رخصت ہوگیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا۔

محبت اک سفر کا سلسلہ ہے
بچھڑ کر کون کس کو سوچتا ہے

مگر اجمل سعدی کی جب بھی ملاقات شہزادی عامر سے ہوتی' وہ اگلی ملاقات کے لیے پھر سے بے چین ہوجاتا۔ وہ عام لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی۔ اس کی سوچ' اس کی شخصیت اجمل سعدی کے حلقہ احباب سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔

ایک سے ایک خوب صورت ناز و ادا کی لڑکیاں اس کی دوست تھیں۔ مگر ان میں شہزادی کا وجود سب سے جدا تھا۔ اس کے خیالات کی پختگی' زندگی کا حقیقی انداز' دکھ کو محسوس کرنا' مردانہ وار حالات کا مقابلہ۔ یہ سب کچھ کوئی غیر معمولی لڑکی ہی کرسکتی ہے۔

اس غیر معمولی لڑکی کا معمولی حسن اسے دیوانہ بنا گیا تھا۔ وہ ہفتے میں کئی کئی دفعہ اس کے آفس کے چکر لگاتا۔ اس کی ایک جھلک کے لیے ہر لمحہ بے قرار رہتا۔

"کیا ہوگا میرا۔" وہ بے بس ہوکر سوچتا۔

"یہ کہاں دل ہار گیا ہوں میں۔"

"وہ تو بالکل پتھر ہے' دوسروں کے جذبات سے عاری۔ اسے دل کی باتیں کہاں آتی ہیں۔"

شہزادی عامر اور اس کے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوچکی تھی۔ وہ ہر موضوع پر اس سے بہت اچھے انداز میں ڈسکس کرتی۔ اس جذبے کو ایک خوب صورت نام دے سکتے ہیں۔ جسے عرف عام میں دوستی کہتے ہیں۔

لیکن اجمل دوستی کے دائرے سے باہر نکل کر اسے اپنے ساتھ لے کر چلنا چاہتا تھا۔ جبکہ وہ اکیلی اپنی ہی دھن میں چلتی رہی۔

اجمل اس کی ممی سے ملا تھا۔ وہ بہت نفیس خاتون تھیں۔ ایک مونٹیسوری اسکول چلا رہی تھیں۔ شہزادی سے بڑی زینا کی شادی ہوچکی تھی۔ اب شہزادی ہی ان کا سب کچھ تھی' والد دو سال پہلے کار ایکسیڈنٹ میں وفات پاچکے تھے۔ وہ اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ مگر شہزادی شاید اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ اپنی جاب کے سلسلے میں بے انتہا مصروف رہتی۔ کتنے ہی پرپوزل ٹھکرا چکی تھی۔ شہزادی کی ممی اجمل کی آنکھوں میں پسندیدگی کا عنصر دیکھ چکی تھیں اور وہ بھی چاہتی تھیں کہ شہزادی' اجمل کا ہاتھ تھام لے۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز' موسموں کی پروا کیے بغیر اپنے پروجیکٹ پر کام کرتی رہتی۔

اس روز بھی صبح سے آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

اس تیز برستی بارش میں۔ وہ اندرون شہر ایک ایسی عورت پر ڈاکومنٹری کے لیے گئی تھی۔ جس کی جوان بیٹی کو اس کے بھائیوں نے شک کی بنیاد پر یا لڑکے کے ساتھ دیکھ لیے جانے پر کلہاڑی سے بے دردی سے قتل کردیا تھا۔ اسی پر بس نہیں' بلکہ لڑکی کی ماں پر بھی تشدد کیا تھا کہ اس نے بیٹی کو اتنی آزادی کیوں دی۔ اس سائنسی دور میں جبکہ انسان تسخیر قمر کا دعوے دار ہے۔ کائنات کے بہت سے رازوں کو منکشف کررہا ہے۔ اس دور میں ایسی باتیں' ایسے واقعات بہت عجیب لگتے ہیں۔

ایک کمزور سی عورت کے ساتھ کتنا کچھ ہوجاتا ہے۔ مگر شہزادی عامر ایک ایسی شعلہ صفت مجاہدہ تھی جو تن تنہا اس محاذ پر ڈٹی تھی۔ اس نے شاید یہ طے کرلیا تھا کہ وہ مردوں کے اس منفی اور گھناؤنے کردار کو عیاں کرکے رہے گی۔

انسانی حقوق کمیشن کے ساتھ مل کر وہ آگے سے آگے جارہی تھی۔ رات گئے گھر لوٹنا' صبح ہوتے ہی اپنے مقصد کے لیے نکل جانا۔ اس کی زندگی یہی تھی۔

"بات سنو۔" ایک روز وہ اس سے فون پر بہت کچھ کہنے کے موڈ میں تھا۔ بہت سارے شکوے اس کے دل میں جمع ہوگئے تھے۔

"تم کچھ وقت اپنے پیاروں کو نہیں دے سکتیں۔" اس نے فون پر شکوہ کیا۔

"کیوں ایسی کیا بات ہوگئی۔" وہ شاید سوکر اٹھی تھی علیحدہ دیر تک سوکر اٹھنے کی چغلی کھا رہا تھا۔

"مجھے تو خیر چھوڑو' اپنی ممی کو دیکھا ہے۔ ان کی صحت کی پروا ہے تمہیں؟"

"کیوں ممی نے کچھ کہا ہے تم سے۔" وہ یکدم تیزی سے بولی۔

"ریلیکس۔ وہ بھلا کیا کہیں گی۔ کیا ان کی خاموشی کچھ نہیں بتاتی' تمہارا آنا' تمہارا جانا اور وہ سارا دن تنہا۔ گزار دیتی ہیں۔"

شہزادی وقت اور حالات ایک جیسے نہیں رہتے' تم روز بروز اپنے کام میں اتنی منہمک ہوتی جارہی ہو کہ خود تمہارے اردگرد تمہارے لوگ کیسے ہیں' تمہیں

احساس تک نہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ میں بے حس ہو گئی ہوں۔" وہ درمیان سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"یہ میں نے نہیں کہا۔" وہ نرمی سے بولا۔

"بس جو محسوس کیا وہ کہہ دیا۔"

"تمہیں تو موسموں کے حسن کی بھی پروا نہیں۔ تمہیں تو اتنا بھی خیال نہیں کہ نظریں اٹھا کر اپنے آس پاس کھلے خوب صورت پھول دیکھ لو۔ تمہیں تو میرا دل کیا 'میرا وجود بھی نظر نہیں آتا۔ نہ جانے کیوں یہ محبت کی آگ میرے دل میں جل اٹھی ہے۔" وہ چپ چاپ سوچے گیا۔

"کیا ہوا 'ہیلو۔" اس کی طرف سے خاموشی پا کر وہ چونکی۔

"آں ہاں۔ کچھ بھی نہیں۔ چلو ٹھیک ہے 'پھر بات ہوگی تم مصروف ہو۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے فون رکھ دیجیے۔ مگر شام کو گھر پہ آپ کا انتظار کروں گی۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے۔"

"کیا۔" اس ایک لمحے میں وہ کچھ حیران' کچھ پریشان ہوا۔ کیا اس نے ابھی جو بات کی ہے 'واقعی اسی نے کی ہے؟

"کیا آپ کو یقین نہیں آرہا کہ میں آپ سے ایسی کوئی بات کہہ سکتی ہوں۔ آپ شام کو آرہے ہیں 'ہم منتظر ہیں اللہ حافظ۔"

اللہ حافظ کہہ کر وہ فون کریڈل پر رکھ چکی تھی اور اجمل سعدی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔

شام کو وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ اس کے گھر پر موجود تھا۔ فیروزی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں وہ نکھری نکھری سی تھی اور عام دنوں سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

وہ بالکل عام سی لڑکی تھی 'لیکن اس کے چہرے پر ایک عجیب کشش تھی اور خاص طور پر جب وہ مقابل کے ساتھ گفتگو کر رہی ہوتی تو سامنے والا اسے ہی دیکھے جاتا اور اس وقت بھی وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور محو گفتگو تھی۔

"ایک بات کہوں؟" اس کے فریش موڈ کو دیکھ کر وہ بولا۔

"ہاں کہیے۔" وہ تھوڑا حیران ہوئی۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو 'عام دنوں سے ہٹ کر۔"

"اچھا شکریہ!" وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے اور اب یہ مت کہنا کہ کیا مطلب؟" اس نے شہزادی کے جواب دینے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔

"اگر آپ اس زندگی کی بات کر رہے ہیں 'جس کے معنی شادی ہوتے ہیں تو اب اس پر بات کرنا بے کار ہے۔ وہ اس لیے کہ پہلے تو میری زندگی ہر لحاظ سے نارمل تھی۔ مگر اب نارمل نہیں ہے۔"

اس کا مرہم کہیں نہیں لگتا
سو دکانیں ہزار کھلے ہیں

"کیوں 'نارمل کیوں نہیں ہے؟" اس نے اچنبھے سے کہا۔

"کیونکہ جب سے وہ حادثہ ہوا ہے اور میری کولیگ کو جس بے دردی سے ان شیطان صفت لوگوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے 'میرا دل مردوں کی طرف سے بہت خراب ہو گیا ہے۔ ایک نفرت سی ہو گئی ہے۔ بس میرا دل اور دماغ نہیں مانتا۔" وہ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

"میرا مطلب۔ تمہارے زخموں کو نئے سرے سے جگانا نہیں تھا۔ مگر جن درندوں کی تم بات کر رہی ہو تو معاف کیجیے گا۔ ان کا شمار معاشرے کے افراد میں نہیں ہوگا۔ تم نے سب کو ان کے ساتھ شامل کر لیا۔ یہ انصاف نہیں۔ تمہارے والد بھی ایک مرد تھے۔ تمہارا بہنوئی جو تمہارے سامنے ہے 'وہ بھی ایک مرد ہے اور جن ساتھیوں کے ساتھ تم کام کرتی ہو 'وہ بھی بیشتر مرد ہیں۔ اپنے دل و دماغ سے ذرا سوچو۔" وہ بہت تحمل اور برداشت سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"مگر اجمل صاحب! اس واقعے کے بعد میں نے زندگی کو صحیح انداز سے دیکھا ہے۔ آپ میرے ساتھ

چل کر ان دکھی عورتوں کو دیکھیے جو دور دور کے گاؤں میں کیسی پس ماندہ زندگی گزار رہی ہیں۔ بارہ سالہ لڑکی کی شادی پچاس سالہ آدمی سے کرنا کہاں کی دانش مندی ہے 'یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ پیسے کے لیے بچی کو بیچ دیا۔ اس کے خواب جلا دیے۔ جائیداد کے چکر میں قرآن سے شادی 'کاروکاری 'یہ سب کیا ہے؟ اندھا قانون اور ان سب کے پیچھے مردوں کی خود غرضی۔

لو نہ۔ مرد سے شادی کر کے سمجھتی ہیں 'عورتیں پناہ میں آگئیں۔ اگر وہی مرد طلاق دے دے تو کہاں ہے اس کے لیے پناہ۔ ایسی کتنی ہی عورتوں کی آنکھوں میں 'میں نے دکھ دیکھا ہے 'جن کے شوہروں نے دوسری شادیاں کر کے پہلی بیوی کو بغیر نان نفقے کے بے آسرا کر دیا ہے 'تو اجمل صاحب 'ایسی ہی کم عقل عورتوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تنہا رہ جاؤ گی۔" وہ صرف اتنا ہی بول سکا 'اس کی تقریر کے جواب میں۔

"میں تنہا نہیں ہوں 'میرے ساتھ بہت لوگ ہیں۔" وہ بڑے زعم سے بولی۔

"ارے بیٹا۔ یہ تو اسی بحث میں الجھی رہے گی اور کھانا بھی ٹھنڈا کر دے گی۔"

آنٹی نے مداخلت کی تو اندازہ ہوا کہ وہ دونوں کتنی ہی دیر سے بات چیت کر رہے ہیں۔

"کھانا بہت لذیذ تھا۔ اس نے تعریف کی۔

"تمہیں پتا ہے بیٹا۔ آج کا کھانا شہزادی نے تیار کیا ہے۔"

"اچھا۔" اسے واقعی بڑی حیرانی ہوئی۔ "ان کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔"

"ارے بیٹا۔ اب یہ کم کھانا بناتی ہے۔ ورنہ گھر کے کام کاج میں اسے سب سے زیادہ شوق کوکنگ کا ہے۔" آنٹی نے بہت محبت سے کہا۔

"چکن جل فریزی اور نرگسی کوفتے بہت اچھے لگے۔" اجمل نے شہزادی سے کہا۔

"آپ کو اچھے لگے 'اس کے لیے شکریہ۔ آپ کو پھر بلائیں گے اور اس سے بھی اچھی ڈشز کے ذائقے چکھائیں گے۔"

"جانے وہ دن کب آئے گا؟" اجمل نے بہت حسرت سے کہا تو سب ہنسنے لگے۔ یوں ایک خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں چائے لے کر باہر لان میں آبیٹھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت سکون دے رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم جیسی ضدی لڑکی موم کی گڑیا کی طرح میرے ساتھ بیٹھی ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ جو ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔

"اگر میری محنت 'میرے کام کو آپ ضد سمجھتے ہیں تو یہی سہی۔" وہ ترسان سے بولی۔

"تمہیں پتا ہے شہزادی 'میری امی مجھ سے سخت خفا ہیں 'صرف اس لیے کہ وہ کتنی ہی لڑکیاں شادی کے لیے دکھا چکی ہیں۔ میری پسند پوچھ چکی ہیں۔ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ جو میری پسند ہے 'وہ کسی طور پر راضی نہیں ہے۔"

اس کی بات سن کر وہ چونکی مگر بولی کچھ نہیں۔

"سنو شہزادی میری طرف دیکھو۔" وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتا ہوا بولا۔ تو شہزادی نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے 'تمہیں احساس ہے نا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے اور یہ جذبہ مجھ جیسے بندے کے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔ جو زندگی میں بہت حسن پرست رہا ہو اور کسی ایک جگہ قناعت نہ کی ہو۔ مگر تم میں ایسی کیا بات ہے 'کیا معصومیت ہے کہ تمہارے آگے سب لڑکیاں ہیچ لگتی ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں ضرور سوچو اور کسی فیصلے پر پہنچو۔ میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

اس دوران میں اس نے بہت ساری باتیں شہزادی سے کیں۔ وہ ہوں ہاں کرتی رہی اور بہت سارے لمحے آگے سرک گئے۔ جانے کتنی خواہش اور امیدیں لے کر وہ اس کے گھر سے رخصت ہو گیا اور کتنے ہی دن

اس کی اور شہزادی کی بات نہ ہوئی۔

وہ سوچتا شاید وہ بہت کچھ سوچ رہی ہو کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو "آنٹی بھی تو یہی چاہتی ہیں کہ شہزادی کی شادی میرے ساتھ ہو جائے۔ خدا کرے کسی مثبت فیصلے کی نوید ہو۔

مگر وہ کسی مثبت فیصلے پر پہنچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب ہی تو دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔

اجمل سعدی نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی سے مات نہیں کھائی تھی اور یہ لڑکی۔

"آخر اس میں ہے کیا۔" وہ پھر سوچنے لگا۔

"کس بات کا غرور ہے معمولی سے خدوخال کی لڑکی۔"

مگر وہ غیر معمولی لڑکی رفتہ رفتہ اس کے لیے چیلنج بنتی جا رہی تھی۔ ایک روز نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے گھر پہنچ گیا۔

اجمل کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اچھا ہوا" آپ آگئے میں آپ کو فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔"

اس کے اطراف خوشی رقص کرنے لگی۔ اس نے وہی سنا جو اس نے کہا تھا۔

"ایسی کیا بات تھی کہ تمہیں اپنی مصروفیت میں بھی مجھے فون کرنے کا خیال آگیا۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ جسے شہزادی نے محسوس کیا مگر مسکراتے ہوئے بولی۔

"شاید آپ اخبار نہیں پڑھتے ورنہ آپ خود مجھے فون کرتے۔" اس نے بہت مان سے کہا۔

"چلو تم ہی بتا دو۔ میں اخبار سے دور ہو گیا ہوں تو کیا ہوا؟ تم سے دور تو نہیں۔" آخری جملہ اس نے ذرا آہستہ کہا۔

"ہاں یہ تو ہے آخر آپ میرے سامنے ہیں۔" اس نے بھی فوراً جواب دیا۔

" Quranic Concept of Womens In Islam

اس موضوع پر میں نے ڈاکومنٹری تیار کی تھی۔ شب و روز کی کاوش سے اور اس کاوش کو منسٹری آف کلچر نے اقوام متحدہ میں بھیجا تھا اور میری ڈاکومنٹری کو نوبل پرائز ملے گا اکتوبر میں" اس کی آنکھوں میں جگنوؤں سی روشنی تھی۔

"زبردست۔ یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔ اپنی کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں ورنہ مجھ سے زیادہ تمہاری خوشی اور کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کو نہیں پتا میرا کتنا بڑا خواب ہے۔" وہ اپنی دھن میں بولی۔

"عورت کے وجود کو منوانا اس کی عزت اور احترام کے لیے مذہب نے کتنے پیارے اصول وضع کیے ہیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ نچلے طبقے کی عورت کے دکھ ان کے مسائل کو سامنے لانا ان کے مسائل کو حل کرنا میرا مقصد ہے دعا کیجیے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔" وہ بہت ضبط کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

"اس لڑکی کی تو راہ ہی کچھ اور ہے شاید۔ میں ہی اس کے راستے میں آگیا۔ میں اسے اپنا بنا کے شاید غلطی کر رہا ہوں۔ اس کے کچھ خواب ہیں اور یہ اپنے خوابوں کی منزل پانا چاہتی ہے۔"

شہزادی کی آواز پر وہ فوراً سوچ کی وادی سے باہر نکل آیا۔

"نہیں۔ آپ میری کامیابی پر زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ اتنی خاص خوشی ملی ہے اور آپ۔"

"یہ بات نہیں ہے شہزادی۔ تم واقعی خاص ہو۔ عام لوگوں سے ہٹ کر ہو۔ تمہاری کاوش نے تمہیں اس عظیم کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ البتہ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ میں تو صرف تھوڑی دیر کے لیے اس لیے خاموش ہو گیا تھا اور یہ بھی سوچ رہا تھا کہ تم اور کتنا آگے جاؤ گی اور تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟ اور یہ کہ کیا کسی کی کہی گئی بات

تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتی ہے یا نہیں؟"

اس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ شہزادی نے یکدم اس کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اجمل نے روک دیا۔

"اس وقت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تمہارے پاس وقت ہو گا تو جواب دے دینا۔ میں تمہیں کسی اذیت میں ڈالنا نہیں چاہتا لیکن تمہارا ساتھ بہرحال چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس نے کوریر سروس کے ذریعے شہزادی کے لیے ٹی روز اور گلاب کے پھولوں کا بکے اور کارڈز بھجوایا تھا۔ کتنا دل چاہ رہا تھا خود جا کر دینے کو مگر بہرحال وہ مرد تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ جب وہ اس کے روبرو ہو تو صرف وہ اس کے بارے میں باتیں کرے مگر اس کے پاس ادھر ادھر کے مسائل کا ڈھیر تھا۔ اس کے جذبات کی قدر کہاں تھی؟ رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ شہزادی عامر کے پاس دل تو نہیں پتھر ہے جذبات نام کی کوئی چیز اس کے اندر نہیں۔

میڈیا کوریج کے لیے وہ دور دراز کے گاؤں کا سفر کرتی دشواریوں کا سفر طے کرتی ثبوت اکٹھے کرتی مظلوم عورتوں کو انصاف دلواتی ان کو روزگار دلواتی باعزت جگہ کے لیے کوشش کرتی۔

ایک عجیب مشن پر وہ روانہ ہو چکی تھی۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اس نے شاید دل کا چین پا لیا تھا۔ مگر کسی کے دل کا چین لوٹ لیا تھا۔

اس نے اجمل سعدی سے واضح الفاظ میں کہا تھا۔

"میں شادی جیسے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتی۔ میں عام لڑکیوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے مجھے میرے راستے سے مت بھٹکائیے۔"

مگر اجمل سعدی نے اس کی باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا اور ہار نہیں مانی تھی۔ اس سے یہ ضرور کہا۔

"جو لوگ فطرت کے خلاف چلتے ہیں اللہ بھی ان

www.paksociety.com

کو پسند نہیں کرتا۔ تم کب تک اکیلے 'تن تنہا ایک غرور کے ساتھ چلوگی۔ تمہیں میری ضرورت ہر طرح محسوس ہوگی۔"

٭ ٭ ٭

یہ سب سے بڑی حقیقت ہے کہ عورت اس معاشرے میں یعنی مردوں کے معاشرے میں تنہا زندگی کہیں گزار سکتی۔ خواہ وہ کتنا ہی دعوا کیوں نہ کرے۔

اور آج چھ سال بعد اجمل سعدی کی بہت سی باتیں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ مردوں کے حقوق کے لیے جنگ لڑتے ہوئے شہزادی۔ کو ایک دم اپنے حقوق کا احساس ستانے لگا کہ خود اس نے اپنی ذات پر کتنے ظلم سہے ہیں اور جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہونا چاہتا تھا۔ اس کو بھی شہزادی نے اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔

ہر عورت کا اپنا ایک گھر ہوتا ہے 'گھرانہ ہوتا ہے' ٹھیک ہے مردوں کے اس معاشرے میں ہمیشہ مردوں کی بالادستی قائم رہتی ہے۔

ایک مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو پناہ دیتا ہے 'تحفظ دیتا ہے' چار دیواری دیتا ہے 'ایک مرد وہ بھی ہوتا ہے جو عورت کے سر سے چادر چھین لیتا ہے 'گھر سے بے گھر کر دیتا ہے۔ عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ اس کی دھجیاں سر بازار بکھیر دیتا ہے۔

شہزادی کے دل و دماغ میں مرد کا یہی منفی انداز بس گیا تھا۔ جس کے سبب اس نے اپنی زندگی کے کئی سال کٹھنائیوں میں بسر کیے۔ جب ہی تو اجمل سعدی کی محبت اس کے دل تک نہ پہنچ سکی۔

مگر شاید وقت بہت ساری تبدیلیاں لاتا ہے۔ بہت سارے فیصلے محفوظ کر لیتا ہے اور اس وقت وہ فیصلے سامنے آتے ہیں۔ جب ان کی واقعی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے اندر کی عام سی لڑکی جاگ گئی تھی۔ بہت سی خواہشیں اس کے من میں بس گئی تھیں۔ اجمل سعدی کی محبت رنگ لے آئی تھی وہ خاص لڑکی ایک عام سی لڑکی تھی۔ جس کا دل ہمیشہ گھر' دریچے اور معصوم سے بچوں کی تمنا کرتا ہے۔

مگر ہر عام لڑکی یہ ضرور چاہتی ہے 'اس معاشرے میں اس کی چادر کی حفاظت کی جائے 'اس کی عزت کی جائے' کیونکہ وہ عام سی لڑکی ماں کے درجہ پر بھی فائز ہوتی ہے۔

٭ ٭ ٭

"سنو۔ درد کے آخری قطرے کو اب رخصت کردو۔" وہ اس کے سامنے تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی اداسی کو اپنے لہجے کی محبت میں سمیٹ کر بولا۔

"کیسے۔" وہ آنکھوں سے گرتے اشک کو ابھی ٹشو میں جذب کر رہی کہ اجمل نے کہا۔

"ایسے؟" وہ اس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی پوروں سے صاف کر چکا تھا۔ شہزادی نے گھبرا کر اس کے ہاتھوں کے لمس پہ سر اٹھایا۔

"یہ میں ہوں' تمہارا شہزادہ۔ تم نے بن باس کاٹ لیا ہے۔ اور اب۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"نہیں چاہتا ہوں میری شہزادی اب کبھی اداس نہ رہے۔ پیچھے مڑ کر اداس راہوں کو نہ دیکھے۔"

"مسز اجمل شہزادی' تمہارا شہزادہ تمہاری روح کے سارے زخموں پہ مرہم رکھنا چاہتا ہے۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"یہ چاند بڑا ضدی ہے میڈم۔ سویرا کا ندھا حاضر ہے۔ زندگی بھر کے لیے۔" وہ بڑے اسٹائل سے اس کے آگے جھکا۔

اور شہزادی نے محبت کے ساتھ اس کی محبت کی شدت کو محسوس کیا اور سکون سے اس کے ہاتھ کو تھاما اور مسکراتے ہوئے اس کے ہم قدم ہوگئی۔

دور کہیں صبح کے میلے میں زندگی جھوم رہی تھی۔

٭ ٭

مکمل ناول

ساتھ والے چلے

سحرش بانو
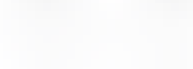
دوسری اور آخری قسط

کالج گیٹ پر رش نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنی گاڑی بہت آرام سے وہاں سے نکالی تھی۔ یہ سیکنڈ ہینڈ نسان اس نے پچھلے سال ہی خریدی تھی اور اس گاڑی کی بدولت اس کی زندگی میں موجود پریشانیوں میں سے چند ایک تو ضرور کم ہوئی تھیں۔ گاڑی مین سڑک پر لا کر اس نے ایک تشکر آمیز سانس ہوا کے سپرد کیا تھا۔

زندگی کو ایک مخصوص ڈگر پر لانے کے لیے بہت صبر اور ہمت کی ضرورت تھی اور آج سے چند سال پہلے تک تو اس کا تصور بھی محال تھا مگر یہ اس کی ماں تھی جس کی وجہ سے آج وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کو کافی بہتر حالت میں گزارنے کی پوزیشن میں آچکی تھی۔

اس کا تعلق لوئر کلاس سے تھا۔ اس کا باپ ایک دو ڈھائی سو روزانہ کمانے والا مزدور تھا اور اس کی پیدائش سے تین ماہ پہلے ہی ایک زیر تعمیر عمارت گرنے سے اس دنیا سے اُس دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی ماں ایک سادہ مزاج اور صابر عورت تھی جو پہلے اس کے باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے سلائی کڑھائی کے علاوہ لوگوں کے گھروں تک میں کام کرتی تھی۔ وہ رزق حلال کے حصول کے لیے کسی بھی قسم کا کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتی تھی اس کے باپ کے جانے کے بعد وہ یہی کام اور زیادہ محنت اور لگن سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالنے کے لیے کرنے لگی تھی۔ اس کی ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی محنت کرنے والے ہاتھوں میں ایک خوبی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ ہاتھ کبھی کسی کے آگے پھیلائے نہیں جاتے۔ اس کی ماں ایک محنتی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھے اخلاق و کردار کی بھی عورت تھی اس نے اپنی بیٹی کی بہت اچھی پرورش کرنے کے ساتھ اسے اچھی تربیت دینے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ عزت سے جینے کے گر سکھاتی رہتی تھی۔

اس کی ماں صابر تھی اس نے اسے صبر کرنا سکھایا اس کی ماں شاکر تھی اس نے اسے شکر کرنے کا طریقہ بتایا اور یہ اس کی ماں کی ہمت اور حوصلہ تھا جس کے باعث وہ مزدور کرم حسین کی بیٹی اس بہت اچھی ریپوٹیشن والے شہر کے بہترین کالج میں لیکچرار تھی۔

اس نے گاڑی کیمسٹ کی دکان کے سامنے روکی تھی۔ اسے اپنی ماں کی شوگر اور بلڈ پریشر کی دوائیاں لینی تھیں۔ گاڑی سے نکلتے ہوئے اس کی نظر اس بھاگتی عورت پر پڑی تھی۔ وہ عورت بھاگ رہی تھی بے تحاشا اور بنا آگے پیچھے کی پروا کیے وہ الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھاگتے بھاگتے یک دم ٹھوکر کھا کر گری تھی اور گرتے ہی ایک طرف کو لڑھکتی ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتی چلی گئی تھی۔

☆ ☆

اس کی آنکھ جب دوبارہ کھلی تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں دیوار کے ساتھ رکھی چارپائی پر لیٹے پایا تھا وہ بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں سٹی سفید دیواروں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا وہ کہاں ہے اور جہاں ہے وہاں کیوں ہے؟ چند لمحے ہی گزرے تھے جب دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا۔

"شکر ہے آپ کو ہوش تو آیا۔" اندر آنے والی عورت تھی جس نے اسے اپنی طرف کھلی آنکھوں سے دیکھتے پا کر مسکرا کر کہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی نظر آئی تھی اور اس نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

"لیٹی رہیں۔ ڈاکٹر نے زیادہ حرکت کرنے سے منع کیا ہے۔" اس عورت نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اٹھنے کی کوشش کرنے سے روکا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں موجود الجھن اور سوال دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"میں خدیجہ ہوں۔ خدیجہ کرم حسین۔"

وہ دیوار کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی کمر میں شدید قسم کے درد کی وجہ سے وہ بنا سہارے کے نہ تو اٹھ بیٹھ سکتی تھی نہ چل پھر سکتی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی ابھی اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے روانی سے گرتے آنسوؤں نے اس کا گریبان تر کر دیا تھا۔

"آپ کو مجھے نہیں بچانا چاہیے تھا۔ آپ نے مجھے کیوں بچایا؟" اس کے شکوے بھرے انداز میں کہنے پر وہ حلاوت سے مسکرائی تھیں۔

"تمہیں کس نے کہا کہ تمہیں ہم نے بچایا ہے۔" رشیدہ کے کہنے پر اس نے بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"تمہیں اس نے بچایا ہے جسے تمہاری مزید زندگی مطلوب تھی۔ ہمیں تو اس نے بس وسیلہ بنایا ہے۔"

اس نے رشیدہ کی اگلی بات پر نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں میں اس قابل نہیں ہوں کہ وہ میرے لیے وسیلے بنا کر بھیجے' اس روئے زمین پر موجود اس کے سب سے زیادہ گناہ گار ترین بندوں میں سے ایک میں ہوں۔ میں اس کے نافرمان اور ان بندوں میں شامل ہوں جو اس کی بنائی ساری حدیں توڑ دیتے ہیں۔ وہ مجھے کیوں بچانا چاہے گا کس لیے بچانا چاہے گا؟؟"

"ہو سکتا ہے وہ تمہیں توبہ کی مہلت دینا چاہتا ہو عشاء عذیر احمد۔" خدیجہ کے اچانک کہنے پر اس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اپنی اب تک کی زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا عمل یاد نہیں جو میں نے خالصتاً" اس کے لیے کیا ہو' میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں فقط گنتی کی چند نمازیں پڑھی ہیں اور وہ چند ایک بھی صرف اسے اپنے لیے مانگنے کے لیے۔

میں نے اس کے سامنے سجدے میں سر بھی جھکایا تو بس اپنے فائدے کے لیے۔ میرا شمار اس کے ان بندوں میں ہوتا ہے جو ہمیشہ اس کے سامنے صرف مانگنے کے لیے جاتے ہیں مل جائے تو ٹھیک ورنہ پھر اس کی دی نعمتوں کو بھلائے شکوے شکایتوں پر اتر آتے ہیں' میں اس کی بنائی مخلوق میں سے انتہائی ناشکرے' احسان فراموش اور نافرمان لوگوں کی کیٹگری میں آتی ہوں اور آپ کہتی ہیں وہ مجھے توبہ کی مہلت دینا چاہتا ہے؟" اس نے طنز سے سر جھٹکا تھا۔

"ہاں میں نے کہا ہے۔" رشیدہ نے اس کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھتے سر ہلایا تھا۔

"کیوں کہ انسان کو جب اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو اس کی غلطی پھر غلطی نہیں رہتی معافی اور معرفت کا ایک ذریعہ بن جایا کرتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

رشیدہ نے اسے سہارا دے کر بٹھایا تھا پھر دودھ کا گلاس اور ٹیبلٹس اس کی طرف بڑھائیں۔ اس نے بہت خاموشی سے ان کے ہاتھ سے ٹیبلٹس لے کر منہ میں رکھیں اور دودھ کا گلاس پکڑا تھا۔ ٹیبلٹس نگل کر اس نے دودھ کا گلاس واپس ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"یہ سارا ختم کرو بیٹا۔" رشیدہ نے گلاس میں موجود دودھ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ہمیشہ دل کی نہیں مانتے۔" رشیدہ کی بات پر اس نے واپس گلاس پکڑ لیا تھا۔

"تم دودھ ختم کرو' میں ذرا سالن دیکھ کر آتی ہوں۔" ان کے کہنے پر اس نے سر ہلایا تھا۔ وہ دونوں ماں بیٹی ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہی تھیں بنا کچھ پوچھے بنا کریدے بنا سوال جواب کیے' تجسس ظاہر کیے۔ وہ ہر وقت اسے تسلیاں اور دلاسے دیتی رہتی تھیں۔ اسے ان دونوں پر حیرت ہوتی تھی۔ کیا وہ واقعی اسی دنیا کی مخلوق تھیں؟

کالج سے واپسی پر خدیجہ سب سے پہلے اس کے پاس اس کی طبیعت پوچھنے آئی تھی۔ اس کی توجہ پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"میں اس قابل نہیں ہوں مجھے اتنی توجہ دی جائے اور میرا اتنا خیال رکھا جائے۔" اس نے شرمندگی سے کہتے سر جھکایا تھا اس کی آواز نم تھی۔

اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں بیٹا کہ کون کس قابل ہے اور کون نہیں۔ انسان کو جج کرنے کا یا کیٹگرائز کرنے کا اختیار ہمارے پاس نہیں ہے اور پھر فرشتہ تو کوئی بھی نہیں ہوتا کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ہم میں سے ہر کوئی غلط ہوتا ہے۔ غلطیاں سب کرتے ہیں ہاں اپنی غلطیوں کا اعتراف سب نہیں کرتے۔ وہ چند ایک ہوتے ہیں جنہیں جب اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے تو وہ ان کا اعتراف کر لیتے ہیں' ان پر شرمندہ ہوتے ہیں اور انہیں سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور مجھے لگتا ہے تمہارا شمار بھی ان چند ایک میں ہوتا ہے۔" اس کے پاس ہی بیٹھی رشیدہ نے کہتے ہوئے اپنا کندمی ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا۔ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"آپ نہیں جانتیں میں کون ہوں اس لیے آپ ایسا کہہ رہی ہیں۔ میں عشاء عذیر احمد ہوں اس کی سب سے زیادہ گناہ گار' ناشکری اور بے صبری بندی۔ میں نے اس کے بنائے قانون توڑے ہیں۔ حدیں پھلانگی ہیں۔ اس کی نافرمانی کی ہے۔ اپنے ماں باپ کا دل دکھایا ہے۔ ان کی عزت ان کے مان ان کے بھروسے کو خاک میں ملایا ہے' میری ماں ساری زندگی مجھ پر اپنا پیار اپنی محبت اپنی شفقت لٹاتی اور میں لیتی رہی اور آخر میں میں نے اس کی جان بھی لے لی۔ اور آپ کہتی ہیں میں معافی کے قابل ہوں۔ میں معافی کے قابل کیسے ہو سکتی ہوں؟"

اس نے اپنی زندگی کی کتاب کا ہر ایک باب ان کے سامنے کھول دیا تھا۔ زندگی کے سارے جھے سارے قصے۔ وہ بہت سکون سے اسے سنتی رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی اسے ٹوکا نہیں تھا۔ روکا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

"چیزیں ازل سے طے ہوتی ہیں انہیں ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔" ٹھنڈی سیاہ رات میں وہ تینوں چھوٹے سے صحن میں چارپائیاں ڈالے بیٹھی تھیں اور رشیدہ کی پرسکون آواز ٹھہر ٹھہر کر گونج رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنی انگلی میں موجود اکلوتی انگوٹھی کے ڈیزائن پر نگاہ جمائے انہیں سن رہی تھی۔

"اور پھر ہم آدم میں سے ہیں۔ ہم فرشتے نہیں ہیں' غلطیاں ہماری سرشت کا حصہ ہیں' لیکن غلطیوں پر جس طرح اکڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح اپنی غلطیوں کو لے کر خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی جائز نہیں ہے۔ غلطی نہ کرنا بڑی بات نہیں ہوتی۔ غلطی کر کے اسے سدھارنا بڑی بات ہوتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر نیچے جنبش دی تھی۔

"مگر میرا گناہ بہت بڑا ہے۔" اس کا انداز مایوس کن تھا۔

"گناہ دھل بھی سکتے ہیں عشاء! انہیں توبہ کے آنسوؤں سے دھویا جا سکتا ہے۔" خدیجہ کا انداز تسلی بھرا تھا۔

"ہاں دھویا جا سکتا ہے خدیجہ' مگر بے خبری میں کیے گئے گناہ آسانی سے معاف ہو جایا کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر کیے گئے گناہوں کی معافی آسانی سے نہیں ملا کرتی۔"

☼ ☼ ☼

نماز پڑھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے تھے۔ اس نے اپنی ماں کے لیے مغفرت کی دعا کی' اس نے اپنے باپ کے لیے سکون صحت اور عافیت مانگی تھی۔ پھر سجدے میں گر کر اس نے اللہ سے اپنے لیے معافی طلب کی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اپنے اللہ سے اپنے کیے کی معافی مانگ رہی تھی۔

"دعا ہمیشہ یقین صبر اور بھروسے کے ساتھ مانگی

چاہیے۔ خدیجہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے اس نے بہت آہستگی سے کہنا شروع کیا تھا۔

"یہ بات مجھے میرے استاد نے کہی تھی تب مجھے سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب آگئی ہے۔"

"دعا میں نے تب بھی مانگی تھی پر بھروسہ نہیں رکھ پائی تھی۔ صبر نہیں کرپائی تھی تب میں بے صبری بن گئی تھی' میں نے ایک ہی چیز کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا تھا۔ مجھے باقی ہر شے نظر آنا بند ہوگئی تھی۔ میں نے ایک بندے کی طلب میں اسے پانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ مجھے لگتا تھا ایک یہ بندہ مجھے مل جائے تو ساری خدائی مجھے مل جائے۔ ساری کائنات میرے نام ہوجائے اور جب وہ مجھے مل گیا تو میں نے جانا کہ ایک اس بندے کو پانے کے لیے میں نے کیا کیا نہیں گنوایا۔ ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے پر کچھ چیزوں کی قیمت انسان کی ساری زندگی کی کمائی سارے رشتے سارے ناتے ہوتے ہیں۔" اس نے انگلی کی پور سے آنکھ کا آنسو جھٹکا تھا۔

"میں تمہیں بتاؤں انسان بہت عجیب ہے جب کسی چیز کو پانے پر آتا ہے تو ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ کیا کیا کوشش نہیں کرتا حیلے وسیلے ڈالتا ہے دعائیں مانگتا ہے۔ منتیں مانتا ہے اور جب وہ چیز مل جاتی ہے تو پھر کھڑا ہوجاتا ہے حساب کتاب کرنے اسے پانے کے لیے وہ گنوایا یہ لٹایا زندگی کے ترازو میں خسارے اور فائدے تولنے لگتا ہے حسابی کتابی بن جاتا ہے۔ انسان ساری زندگی شکر کرنا نہیں سیکھ پاتا عشاء اور نہ ہی جان پاتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے وہ نہیں ملتا جو ملتا ہے اس کے لیے وہی بہتر ہوتا ہے۔"

✲ ✲ ✲

اسے خدیجہ اور اس کی ماں رشیدہ کے ساتھ ان کے اس چھوٹے سے گھر میں رہتے دو ماہ ہوچکے تھے اور ان گزرے دو ماہ میں اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا وہ دونوں ماں بیٹی جو بہت صابر تھیں۔ بہت شاکر تھیں اور جو ہر طرح کے حالات میں پرسکون اور پر امید رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اچھے کی توقع رکھنے والی عورتیں تھیں۔ عشاء کو وہ "چنے ہوئے لوگوں" میں سے لگتی تھیں اور اسے ان پر رشک آتا تھا۔

"زندگی میں جب کچھ بھی نہیں بچتا تب بھی ایک چیز ہمیشہ باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے "امید" خدیجہ نے سرخ رنگ کے پلاسٹک کے ٹب میں سرف کا جھاگ بنا کر کپڑے بھگوتے ہوئے کہا تو وہ یاسیت سے مسکرائی تھی۔

"آزمائشوں پر مشکلوں پر گھبرا کر امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔" اس نے بھگوئے ہوئے کپڑوں کو ہاتھوں سے رگڑتے اپنی بات جاری رکھی ہوئی تھی۔

"کیوں کہ آزمائش ہماری اللہ سے محبت کو ناپنے والا پیمانہ ہوتی ہے اور مشکل ہماری ہمت اور حوصلے کو جانچنے والا آلہ۔" خدیجہ نے کہتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" اس نے آہستگی سے کہتے گردن اثبات میں ہلائی تھی۔

"میرے استاد کہتے ہیں انسان کہیں پر بھی ہو' کیسا بھی ہو آزمایا ضرور جاتا ہے پر خود پر آنے والی آزمائش کو سمجھنے کی صلاحیت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ مجھ میں بھی نہیں تھی' میں اسے اپنی محبت کی آزمائش سمجھی تھی وہ میرے ایمان کی آزمائش تھی۔ میں آزمائش میں کھری نہیں اتر سکی۔" اس نے کہتے ہوئے تاسف اور بے بسی سے سر جھٹکا۔

"اور جو آزمائش میں کھرے نہیں اترتے ان کے لیے امید ختم ہوجایا کرتی ہے۔ میرے لیے بھی ختم ہوچکی ہے۔ میرے لیے زندگی ختم ہوچکی ہے۔ زندگی میں باقی رہ جانے والی خواہشیں اور تمنائیں ختم ہوچکی ہیں۔ مجھے اپنا آپ اس جواری جیسا لگتا ہے جو جوئے میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہو جس کے پاس مزید ہارنے کے لیے کچھ نہ بچا ہو اور ستم تو یہ کہ اس کے اندر سے مزید پانے کی خواہش بھی ختم ہوچکی ہو۔"

✲ ✲ ✲

رشیدہ تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں اور وہ ان کے پاس ہی موجود دھلے ہوئے کپڑے تہ کرتی جارہی تھی۔ رشیدہ اس کے دل بہلانے کو ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ خدیجہ کے جانے کے بعد گھر میں وہ دونوں ہی رہ جاتی تھیں۔ رشیدہ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹاتے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتی رہتی تھیں تاکہ اس کا دھیان بٹا رہے وہ ان کی باتیں سنتی ہوں ہاں کرتی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی جو رشیدہ اکثر ناکام بنا دیتی تھیں۔

"یہ مت سمجھنا کہ مہمان سمجھ کر تمہیں کام سے منع کرتی ہوں تمہاری حالت کے پیش نظر مجھے اچھا نہیں لگتا بیٹا کہ تم کوئی بھی کام کرو۔ ہاں جب تم خیریت سے فارغ ہوجاؤ گی تب ہم کام بانٹ لیا کریں گے اور دیکھو میں پھر بہت تھوڑا کام کیا کروں گی۔" آخر میں ان کا لہجہ شرارتی ہوجاتا اور اس کی آنکھیں نم اور وہ خاموشی سے سر ہلا جاتی۔

رشیدہ نے اپنے آس پڑوس اور جاننے والوں میں اسے اپنی بھانجی کہہ کر متعارف کروایا تھا جو اپنے شوہر کی اچانک کام کے سلسلے میں بیرون ملک روانگی کی وجہ سے ان کے گھر رہنے آگئی تھی کیوں کہ اس شہر میں ان کے علاوہ اس کا دوسرا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ میکے اور سسرال کے نام پر کوئی تھا نہیں۔ اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ لے کر آگئی تھیں۔

✲ ✲ ✲

اس دن وہ دونوں ماں بیٹی بازار گئی ہوئی تھیں اور ان دونوں کی واپسی بہت خوش گوار موڈ کے ساتھ ہوئی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر شاپنگ بیگز اٹھائے وہ گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے آتے ہی اسے آوازیں دینی شروع کردی تھیں وہ سالن کے نیچے آگ دھیمی کرکے گلاس اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر کمرے میں لائی تھی جہاں وہ دونوں سارے بیگز اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ اسے ایک ایک چیز بہت شوق سے دکھا رہی تھیں۔ عشاء کے لیے کپڑے' جوتے ضرورت کا کچھ دوسرا سامان۔

"اور یہ دیکھو۔" اس نے مزید کچھ چیز اس کے سامنے کی تھیں۔

"یہ آنے والے ننھے مہمان کے لیے کپڑے فیڈر۔ ایک چھوٹا کمبل' چھوٹا سا تکیہ اور الابلا۔" وہ چہکتے چہرے کے ساتھ بتا رہی تھی۔ دکھا رہی تھی۔ رشیدہ بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ تھیں۔ عشاء کچھ کہہ کر اس کا دل خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں مگر اپنے آنسو چھپانے کے لیے اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔

✲ ✲ ✲

"تمہیں کیا لگتا ہے عشاء؟" خدیجہ نے سیاہ آسمان سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اس نے تمہیں تلاش کیا ہوگا؟" وہ جو آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی اس کی آنکھیں پٹ سے کھلی تھیں۔ کتنے دنوں بعد کسی نے اس کے سامنے اس شخص کا تذکرہ کیا تھا جس کا ذکر وہ اب کبھی بھی کسی سے بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔

"مجھے ایک فیصد کے دسویں حصے جتنی امید بھی نہیں ہے کہ اس نے مجھے کبھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہوگی۔"

"مگر اسے تمہیں ڈھونڈنا چاہیے تھا۔" خدیجہ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے زور دے کر کہا تھا۔

"آخر کو تم اس کی بیوی ہو۔" خدیجہ نے یہ کہتے ہوئے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"وہ مجھے کیوں ڈھونڈے گا خدیجہ۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔

"مجھے وہ چاہیے تھا اسے میں نہیں چاہیے تھی اسے میری محبت نہیں چاہیے تھی۔ وہ مجھے مانگنے نہیں آیا تھا' میں اسے مانگنے گئی تھی' اپنا آپ پیش کرنے گئی تھی۔ اس نے تو بس سودا طے کیا تھا اور عجب کیا تھا کہ اس سودے میں قیمت بھی میں نے چکائی ہے' خسارہ بھی میں نے اٹھایا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ بہت عجیب دن تھے اداس شامیں طویل راتیں۔ اور وہ سرد اور طویل راتیں بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں کاٹ دیتی تھی۔ نیند سے اس کی آنکھوں کا ربط تب سے ٹوٹا تھا جب سے اس نے پہلی بار داور ابراہیم نامی شخص کو دیکھا تھا اور اپنے سارے رابطے بس اسی سے جوڑنے شروع کردیے تھے۔ اس نے داور ابراہیم کو دیکھا اور اس کے بعد پھر اور کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سوچا اس کی ساری دنیا ایک شخص کے گرد گھومنے لگی تھی۔ ایک شخص اس کی ساری کائنات ہو گیا تھا۔ محبت محبت محبت۔ اس نے ایک اس لفظ کی گردان شروع کردی تھی اور اسے باقی ہر لفظ بھول گیا تھا وہ داور ابراہیم سے محبت کرتی ہے یہ اعتراف نہیں تھا حقیقت تھی اور یہی حقیقت بتانے وہ اس کے پاس گئی تھی اور وہ پوچھتا ہے کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟ اسے حساب چاہیے تھا اور یہ تو وہ جانتی تھی کہ اس دنیا میں ابھی کوئی ایسا پیمانہ نہیں بنا تھا جس سے وہ اپنی محبت کا حساب کرکے بتاتی کہ اتنی محبت کرتی ہوں "میں" تم سے۔ اور داور ابراہیم کو ثبوت چاہیے تھا۔ وہ ثبوت مانگنے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ ثبوت دینے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ثبوت کے طور پر اس کی جان مانگتا وہ کھڑے کھڑے دے دیتی، مگر اسے اس کی جان نہیں چاہیے تھی۔ وہ کچھ اور تھا جو اسے چاہیے تھا۔ اس کی پانچ سالہ محبت کی سچائی کو ناپنے کے لیے جاننے کے لیے اسے کچھ اور چاہیے تھا۔ اس نے جو چاہیے تھا وہ مانگ لیا تھا اور اس نے دینے میں ایک منٹ نہیں لگایا تھا یہ جانے بغیر کہ جو وہ مانگ رہا ہے وہ دے کر تو وہ خالی ہاتھ رہ جائے گی اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ وہ تہی دست ہو کر نہ اس دنیا کی رہے گی نہ اس دنیا کی رہے گی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات بہت طویل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کبھی ختم نہ ہوگی اور اسی سیاہ طویل رات میں درد سے بے حال ہوتے اس نے بمشکل رشیدہ کو پکارا تھا۔ اس رات درد سے بے حال ہوتے اسے مال شدت سے یاد آئی تھی۔ اسے اللہ شدت سے یاد آیا تھا۔ درد اس کی رگوں کو چیر رہا تھا اور زندگی موت کی باہوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ ساری رات اس نے خود کو کانٹوں پہ گھسیٹتے محسوس کیا تھا۔ کئی گھنٹے جان لیوا درد کو جھیلتے صبح صادق کو نیم بے ہوش ہوتی وہ ایک نئی زندگی کو جنم دے چکی تھی۔

زندگی اور موت کی جنگ میں جب اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں موندی تھیں اسی وقت عمر ابراہیم نے اس کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ماں کتنا پیارا ہے یہ۔" خدیجہ کی چہکتی آواز پر اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو بمشکل حرکت دی تھی۔ خدیجہ ہلکے آسمانی رنگ کے کمبل میں ننھے منے سے وجود کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ پاس بیٹھی رشیدہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ لپک کر اس کے قریب آئی تھیں۔ اس کی لبالب بھری آنکھوں سے آنسو قطار در قطار اس کی کنپٹی پہ بہہ رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر رشیدہ کی اپنی آنکھیں بھی نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں اور انہوں نے جھک کر محبت بھرا بوسہ اس کی پیشانی پر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماں ہم اس کا نام عمر رکھیں گے عمر ابراہیم۔"

"کیوں عشاء؟" خدیجہ نے مسکراتی نظریں بچے پر سے ہٹا کر اس پر ڈالی تھیں۔

"یہ گناہ کی پیداوار ہے خدیجہ اس کا نام اتنی پاک ہستیوں کے نام پر کیسے رکھا جا سکتا ہے۔" اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ خدیجہ نے انتہائی متاسف نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری اولاد ہے عشاء"

"یہ میرا گناہ بھی ہے خدیجہ۔" اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے نم ہو گئی تھی۔ رشیدہ نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"جو گزر گیا ہے اس پر کب تک رویا جا سکتا ہے بچے۔ غلطیاں ہو جائیں تو ان پر شرمندہ بھی ہونا چاہیے اور ان کی معافی بھی مانگنی چاہیے، مگر انہیں لے کر ساری زندگی ایک ہی جگہ پر تو کھڑا نہیں رہا جا سکتا۔ اسے دیکھو جیسے بھی سہی مگر یہ تمہارا بیٹا ہے تمہاری اولاد ہے اور شاید تمہارے جینے کی امید بھی۔ سہارا اور آسرا تو بس اللہ ہی کا ہوتا ہے، مگر زندگی پوری کرنے کے لیے بھی انسان کو کچھ نہ کچھ سہارے کے طور پر چاہیے ہوتا ہے اور تمہارے پاس اب زندگی گزارنے کے لیے تمہارے بیٹے کا سہارا ہوگا۔ عمر ابراہیم کا سہارا ہوگا۔"

برتھ سرٹیفکیٹ پر باپ کے نام والے خانے میں موجود داور ابراہیم کے نام نے ایک بار پھر اس کے سارے زخموں کو ادھیڑ دیا تھا۔ ایک بار پھر وہ اذیت کے تپتے صحرا میں آکھڑی ہوئی تھی اور یہ اذیت اس کی برداشت سے باہر تھی اور خدیجہ کہتی تھی۔

"حوالے اللہ بناتا ہے۔ انہیں ہم چھین نہیں سکتے۔ تبدیل نہیں کر سکتے۔ داور ابراہیم اس بچے کا باپ ہے اور اس حقیقت کو خود داور ابراہیم کے ساتھ ساتھ اس دنیا کا کوئی بھی شخص تبدیل نہیں کر سکتا۔"

☼ ☼ ☼

وہ دیوار سے کمر ٹکائے بیٹھی تھی اور اس کی نظریں گلابی کمبل میں لپٹے بچے پر جمی تھیں۔ وہ رو رہا تھا۔ پہلے آہستہ آہستہ اب شدت سے رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میچی ہوئی تھیں دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیے وہ دونوں ٹانگوں کو زور زور سے چلا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے رونے میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اس زور زور سے روتے بچے کو دیکھ رہی تھی اور اس کی اپنی آنکھوں سے بھی بہت تیزی سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ نجانے کتنی دیر گزری تھی جب بچہ روتے روتے تھک کر خود ہی خاموش ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنی فریاد اسے سناتے سناتے تھک گیا تھا۔ یا شاید مایوس ہو گیا تھا، مگر اب وہ نڈھال سا چپ پڑا تھا اور اسے نجانے کیا ہوا تھا اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائے بچے کو اس نے اپنے چہرے کے روبرو کیا تھا۔ چند لمحے وہ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی پھر اپنے لب ہولے سے اس کی پیشانی پر دھر دیے تھے۔ گلابی کمبل میں لپٹے اس دو ماہ کے بچے کو وہ آج پہلی بار اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی ہاں یہ سچ تھا کہ وہ اس کا عمر ابراہیم تھا اور وہ اسے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔

☼ ☼ ☼

عمر چھ ماہ کا ہو گیا تھا جب اس نے رشیدہ اور خدیجہ سے اپنے کام کرنے کی بات کی تھی۔

"میں اب اپنے لیے کوئی کام تلاش کرنا چاہتی ہوں۔" سوئے ہوئے عمر کو احتیاط سے بستر پر رکھ کر اس نے چادر اوڑھائی تھی اور پھر خدیجہ کے سامنے بیٹھ کر کہا تھا۔ فائل پر سے نظر ہٹا کر اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"کیوں۔" فائل بند کرتے اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"اور کتنا عرصہ بوجھ بنوں تم پر۔" پاس رکھے کپڑوں کو تہ کرتے اس نے کہا تھا۔

"کوئی بوجھ ووجھ نہیں ہو تم اور پلیز آئندہ ایسی بات مت کرنا۔" خدیجہ نے برا مانتے کہا تو وہ اداسی سے مسکرائی تھی۔

"تمہارے بہت احسان ہیں مجھ پر مجھے اور زیر بار مت کرو۔"

"کوئی احسان نہیں کیا ہم نے تم پر، ہم نے تو اپنے لیے آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔" خدیجہ کے ہاتھ ہلا کر کہنے پر وہ کئی لمحے اسے دیکھے گئی تھی۔ وہ واقعی چنے ہوئے لوگوں میں سے تھی۔

"میں اب اکیلی نہیں ہوں خدیجہ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی ہے۔ جس کی پرورش کرنا میری ذمہ داری ہے۔" اس کی بات پر خدیجہ کچھ لمحوں کے لیے چپ رہ گئی

تھی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے خوشی ہے بیٹا کہ تم نے اپنے ماضی سے نکل کر حال میں جینے اور مستقبل کو دیکھنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔" رشیدہ نے اس کے فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے تن دہی سے جاب کی تلاش شروع کر دی تھی اور دو ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ اپنی اس تلاش میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی ہر روز وہ صبح ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلتی تھی اور ہر روز شام کو ٹوٹے بکھرے حوصلوں اور مایوسیوں سے جکڑے قدموں کے ساتھ لوٹتی تھی۔ رشیدہ ہر بار اس کی نئے سرے سے ہمت بندھاتی تھیں۔

"ناکامی کے خوف سے کوشش نہ کرنا بھی تو ناکامی کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے۔" وہ نرم لہجے میں کہتیں وہ ان کی طرف دیکھتی اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیتی تھی۔

✡ ✡ ✡

اور اسے کام مل گیا تھا۔ اسی محلے جہاں وہ رشیدہ اور خدیجہ کے ساتھ رہتی تھی' میں رہائش پذیر انعام بوا نامی بیوہ خاتون اس علاقے میں ایک اچھی شہرت رکھنے والا اسکول میں کنٹین چلاتی تھیں اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی تھی اور اس نے خوشی خوشی قبول کر لی تھی۔

"تم یونیورسٹی کی ڈگری ہولڈر اور یہ جاب کرو گی؟" خدیجہ نے انتہائی صدمے سے اسے دیکھا تھا۔

"میرے پاس اپنے ڈگری یافتہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور بنا ثبوت کے مجھے کوئی جاب دینے کو تیار نہیں' میرا راستہ یہی نکلتا ہے۔" اس نے عمر کو فیڈ کرواتے انتہائی سکون بھرے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"مگر پھر بھی۔" خدیجہ نے متامل ہوتے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

"میں نے کتنی جگہ کوشش کی' مگر ناکامی ہوئی کیوں؟ کیوں کہ اللہ نے میرا رزق اس جگہ پر لکھا ہوا تھا اور میں نے اب اللہ کے لکھے کو جاننا اور ماننا شروع کر دیا ہے۔"

✡ ✡ ✡

مشکلیں حل ہو جایا کرتی ہیں۔ راستے نکل بھی آتے ہیں۔ بس انسان کا یقین مضبوط ہونا چاہیے۔ انسان کو یہ اعتماد اور بھروسہ ضرور ہونا چاہیے کہ اللہ ہے اور اس کے ساتھ ہے مشکلیں وہی حل کرے گا۔ راستے وہی بنائے گا۔ وہاں جہاں انسان خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہاں کوئی اور ہے۔ جو اس کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ کوئی اور اللہ ہے وہ اللہ جو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کبھی آپ کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ کبھی آپ کو بھولتا نہیں۔ وہ آپ کے ساتھ رہتا ہے ہمیشہ آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ دیتا ہے۔ دیتا ہے بے شمار۔ بے حساب۔ آپ کے ناشکرے پن کے باوجود بھی دیتا رہتا ہے وہ گنتا نہیں۔ احسان نہیں جتاتا ہاں پر آزماتا ضرور ہے اور اس کی بھیجی ہوئی آزمائشوں میں کھرا اترنا آسان نہیں ہوتا پر یقین مضبوط ہو تو۔ اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا۔

اسے انعام بوا کے ساتھ کینٹین سنبھالتے ایک ماہ ہو گیا تھا۔ کام اچھا خاصا تھا اور وہ دونوں سارا دن مصروف رہتی تھیں۔ وہ صبح نو ساڑھے نو بجے عمر کو ساتھ لیے گھر سے نکل آتی تھی اور ساڑھے تین چار بجے واپسی ہوتی تھی۔ رشیدہ اسے عمر کو گھر پر ہی چھوڑنے کا کہتی تھیں' مگر وہ اب مزید ان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ عمر اس کا بیٹا تھا اس کی ذمہ داری تھا اور اپنی ذمہ داری اسے خود ہی اٹھانا تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ جنوری کا ایک انتہائی ٹھنڈا دن تھا' یخ بستہ ہوائیں اور دھند سردی کی شدت میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ وہ گرم کپڑوں اور کمبل میں لپٹے عمر کو کندھے سے لگائے دوسرے ہاتھ میں مختلف چیزوں سے بھری ٹوکری اٹھائے تیز تیز چل رہی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی اور چہرہ

بالکل برف۔ گرم شال اوڑھنے کے باوجود اسے سردی اپنی ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تجھے آج عمر کو ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا۔" انعام بوا نے گھر کے سامنے کھڑے ہوتے اس نے خود کلامی کی تھی۔ بعد میں یہ بات انعام بوا نے بھی کہی تھی۔

"بیٹا بچوں کو سردی گرمی جلدی لگ جایا کرتی ہے۔ بچے بہت نازک ہوتے ہیں اور ان پر موسم جلدی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" اس نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اسے شرمندگی ہوئی' مگر اسے خبر نہیں تھی اس کی غلطی اس کے لیے ایک پچھتاوا بن جائے گی۔

✡ ✡ ✡

وہ ٹھنڈے کوریڈور میں اس سردی کے عالم میں بھی سلیپرز پہنے اور ہلکا سا دوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بہہ بہہ کر اب خشک ہو چکی تھیں اور لب اندر آنے جانے والوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کل رات سے وہ یہاں بیٹھی تھی اور اسی عالم میں بیٹھی تھی۔ وہ کل سے کچھ بھی کھائے پیے بنا آنکھ جھپکے یہاں بیٹھی تھی۔ اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی اسے پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ اسے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی بھوک پیاس ہر احساس اندر I.C.U میں موجود اپنے بیٹے سے بندھا تھا۔ وہ ماں تھی اور ماں تو ایسی ہی ہوتی ہے۔

ایک بار اس کی ماں نے کہا تھا عورت تب تک ہی عورت رہتی ہے جب تک ماں نہیں بنتی جب ماں بن جاتی ہے تو پھر اپنی زندگی ختم کر کے اولاد کی زندگی جینے لگتی ہے۔ اولاد کی خوشی' اولاد کا غم' اس کی ساری زندگی انہی دو چیزوں کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ عورت' عورت نہیں رہتی ماں بن جاتی ہے۔"

تب اسے بڑا عجیب لگا تھا۔ یہ کیا بات ہوئی؟ انسان اپنی زندگی چھوڑ کے کسی اور کی زندگی کیسے جی سکتا ہے؟ اسے اختلاف ہوا تھا اور ماں مسکرائی تھی۔

"انسان نہیں جی سکتا ماں جی سکتی ہے اور یہ بات تمہیں تب سمجھ آئے گی جب تم خود ماں بنو گی۔"

ماں نے ٹھیک کہا تھا۔ ماں ہمیشہ ٹھیک کہتی ہے بس اولاد کو سمجھنے میں دیر لگتی ہے' اسے بھی سمجھنے میں دیر لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

صبح کے چھ بجے تھے جب ڈاکٹر مبشر نے اسے روم میں بلایا تھا۔ نرس پیغام دے کر جا چکی تھی۔ وہ بمشکل ہمت سے اٹھی تھی۔ اسے خبر نہیں تھی ڈاکٹر مبشر کے پاس اسے بتانے کے لیے کیا ہے ہاں مگر اسے پتا تھا ڈاکٹر مبشر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ وہ چلی تو اس کے قدموں کی لغزش واضح تھی۔

نماز ادا کر کے اٹھتی خدیجہ لپک کر اس کے نزدیک آئی تھی اور اس نے اسے تھاما تھا اور ڈاکٹر مبشر کے کمرے تک لائی تھی۔ وہ ڈاکٹر مبشر کے کمرے میں ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ سفید لٹھے کی مانند ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے اور اس کی نظریں ڈاکٹر مبشر کے چہرے پر جمی تھیں۔ بنا پلک جھپکے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنسو قطار در قطار اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اس کے بیٹے کو ڈبل نمونیا ہو گیا تھا وہ انڈر آبزرویشن تھا اور ڈاکٹر مبشر کے مطابق اس کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔

ایک اور آزمائش' ایک اور امتحان؟ عمر ابراہیم اس کے پاس جینے کا واحد سہارا تھا۔ اس کی آخری آس تھا اور اگر آخری آس بھی ختم ہو گئی تو؟ نہیں' نہیں۔ وہ اپنی آخری آس نہیں ٹوٹنے دے گی۔ وہ اللہ سے عمر ابراہیم کی زندگی مانگ لے گی۔ وہ عشاء عزیر بن کر دعا نہیں مانگے گی وہ ایک ماں بن کر دعا مانگے گی ماں کی دعا کیسے رد ہو سکتی ہے۔

✡ ✡ ✡

اس کے گلے میں موجود سونے کی چین اس کے پاس اس کی ماں کی آخری نشانی تھی اور کانوں میں موجود ٹاپس اس کے باپ نے اسے یونیورسٹی سے پاس آوٹ ہونے پر دیے تھے اور انگلی میں موجود انگوٹھی۔ وہ داور ابراہیم اس کے لیے لایا تھا۔ اس نے اسے دی نہیں تھی بتایا تھا کہ وہ اس کے لیے ایک رنگ خرید کر لایا ہے اور وہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہے وہ دیکھ لے۔ اٹھالے اور اگر دل چاہے تو پہن بھی لے۔ اس نے یہ تینوں کام کرلیے تھے آخر کو وہ داور ابراہیم اس کے لیے لایا تھا اور اب وہی انگوٹھی ٹاپس اور چین کے ساتھ اتار کر رکھی تھی۔

"نہیں ابھی ان کی ضرورت نہیں۔" خدیجہ نے ہاتھ پیچھے کرنا چاہا تھا۔

"ابھی ہی تو ان کی ضرورت ہے میرا بیٹا اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور میں زیور سنبھالتی پھروں۔" خدیجہ نے وہ چیزیں بادل ناخواستہ لے لی تھیں۔ اسے خبر نہیں تھی۔ خدیجہ نے انہیں کب کہاں کیسے بیچا تھا۔ ساری دوڑ دھوپ خدیجہ ہی کر رہی تھی۔ رشیدہ سارا وقت اس کے ساتھ اسپتال میں موجود رہیں۔ وہ دونوں اس کے لیے سگے رشتوں سے بڑھ کر ثابت ہوئی تھیں اور وہ کبھی ان کے احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی تھی۔

وہ ایک بار پھر ڈاکٹر مبشر کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کھنڈی تھی اور اس کی آنکھیں خود میں امید سموئے ڈاکٹر مبشر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔ میرا عمر ٹھیک تو ہو جائے گا نا۔۔۔" کہتے وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔ ڈاکٹر مبشر تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ رشیدہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"حوصلہ رکھیے ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ہم دوا کرتے ہیں آپ دعا کیجیے۔" ڈاکٹر مبشر کے پاس اس کے لیے وہی دو جملے تھے جو انہوں نے ادا کیے تھے۔

تین دن اور چار راتیں۔۔۔ اس نے بہت پریشانی میں گزاری تھیں اس کا دھیان اس کا خیال اس کی ہر ایک سوچ اپنے بیٹے پر آکر رک گئی تھی۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تب اسے ایک سال یاد رہ گئی تھی باقی ہر شے بھول گئی تھی۔ آج پھر ہر چیز اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اسے ایک اپنا بیٹا یاد رہ گیا تھا۔ ساس مرگئی اس نے برداشت کرلیا تھا۔ بیٹا مرگیا تو کیا وہ برداشت کر پائے گی؟؟ اس سوچ کے آتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھاتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو آپ کا بیٹا اب خطرے سے باہر ہے۔" ڈاکٹر مبشر کے منہ سے یہ دس الفاظ نہیں نکلے تھے اس کے لیے زندگی کا مژدہ جاری ہوا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر بے یقین نظروں سے ڈاکٹر مبشر کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔ مجبوراً انہیں اپنے الفاظ دہرانے پڑے تھے۔ تب بے اختیار ہوتے وہ سجدے میں گرتی چلی گئی تھی۔

تو اس کی دعا رد نہیں ہوئی تھی اسے قبول کرلیا گیا تھا۔ اب کی بار اسے مایوس نہیں لوٹایا گیا تھا تو واقعی دعائیں قبول بھی ہوتی ہیں۔ وہ سنی بھی جاتی ہیں۔ کیا پتا کبھی اس کے گناہ بھی معاف ہو جائیں۔ پہلی بار اس کے دل میں امید بندھی تھی۔

پچھلے پانچ دن سے وہ اپنے بیٹے کو شیشے کے اس پار سے دیکھتی رہی تھی۔ پانچ دن بعد وہ اسے روبرو دیکھ رہی تھی اور اسے اپنی آنکھوں کی خوش بختی پر یقین نہیں آرہا تھا۔۔۔ وہ بار بار اپنی آنکھوں میں آیا نمکین پانی پونچھتی اور بہت آہستگی سے اس کے لب لخت بیٹے کی پیشانی کو چھو آتے۔ رشیدہ اور خدیجہ بھی نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

انہیں اسپتال سے واپس آئے چار دن ہو چکے تھے اور ان چار دنوں میں کوئی ایک بھی لمحہ ایسا نہیں تھا جب اس نے اپنے بیٹے کو خود سے جدا کیا ہو۔ وہ سارا دن اسے گود میں لیے بیٹھی رہتی اور ساری رات وہ اس کے سرہانے جاگتی اس پر نظریں جمائے بیٹھی رہتی۔ وہ اس کا عمر ابراہیم تھا اور اس کی عزیز ترین متاع تھا۔ وہ اسے کھونے سے ڈرتی تھی۔

اس نے عمر کو نہلا کر تولیے سے خشک کرکے کپڑے پہنائے اور اسے رشیدہ کے پاس تخت پر بٹھا کر اس کے اتارے کپڑے دھونے لگی تھی۔ جب تک اس نے عمر کے کپڑے دھو کر تار پر پھیلائے تب تک رشیدہ عمر کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں کنگھی کرکے اس کی بھوری آنکھوں میں سرمہ ڈال چکی تھیں۔ اور اب اس کی توتلی زبان سے نکلتے چھوٹے چھوٹے جملوں پر مسکرا رہی تھیں۔ وہ ہاتھ خشک کرتی ان کی طرف ہی آئی تھی رشیدہ انگلیوں پر حساب لگا رہی تھیں۔

"عشاء عمر اگلے ماہ پورے اڑھائی سال کا ہو جائے گا نا؟" ان کے سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ماشاء اللہ اللہ لمبی عمر دے۔" رشیدہ کی بات پر اس نے دل ہی دل میں آمین کہا تھا۔ اور کچن کی طرف چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آج فرزانہ خالہ آئی تھیں اپنے پوتوں کے لیے ٹیوشن کی بات کرنے۔" خدیجہ نے کھانا کھاتے ہوئے بتایا تھا۔

"تو پھر؟" وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"تو پھر یہ کہ میں نے کہا بسم اللہ۔ گھر آئے رزق کو کون انکار کرتا ہے۔" اس نے گھونٹ گھونٹ پانی پیتے آرام سے کندھے اچکائے تھے۔

"لیکن خدیجہ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے۔"

"بس ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" اس نے آرام سے کہہ کر پاس کھیلتے عمر کو اٹھالیا تھا۔

گھر کی بیٹھک میں ان دونوں نے مل کر آج سے ڈیڑھ سال پہلے ٹیوشن سینٹر کھولا تھا جہاں شروع میں بچوں کی تعداد خاصی کم تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ تعداد خاصی بڑھ رہی تھی اور یہ بات ان دونوں کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ انعام بوا کے ساتھ اس نے تقریباً ایک سال تک کام کیا تھا پھر انعام بوا کراچی میں مقیم اپنی بڑی بیٹی کے پاس چلی گئیں تو اس کے لیے بھی کیٹرنگ کا کام کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اور کچھ خدیجہ کا بھی اصرار تھا۔ سو اس نے اس کے ساتھ مل کر ٹیوشن سینٹر کھول لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھانے کھاتے ہی رشیدہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ یہ چیز ان کے روز کے معمول سے ہٹ کر تھی ایک تو خلاف معمول وہ آج صبح سے ہی خاصی خاموش تھیں اور ان کی اس خلاف معمول چپ کی وجہ وہ دونوں ہی جانتی تھیں اس لیے کرید بے معنی تھی۔ وہ عمر کو سلا کر باہر آئی تھی جہاں خدیجہ ایک کونے میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ گہری سانس لیتی اس کی طرف بڑھی تھی۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا؟" اس کے سوال پر خدیجہ نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ الٹا اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ظاہری بات ہے تمہیں ہاں کردینی چاہیے۔"

"مگر میں نے نہ کردی ہے۔" خدیجہ نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا تھا۔

"کردی ہے مگر کیوں؟" اس نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔

"کیونکہ میری زندگی میں کسی نئے رشتے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"گنجائش نہیں ہے۔" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"رشتے گنجائش دیکھ کر نہیں بنائے جاتے خدیجہ۔ رشتے انسان کی طاقت ہوتے ہیں۔ انسان کی مضبوطی اور ضرورت ہوتے ہیں۔ رشتے ڈھال ہوتے ہیں ایسی ڈھال جس کے آسرے انسان بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اور نہ ہوں تو انسان کی حیثیت

تنکے جیسی ہوجایا کرتی ہے' مجھے دیکھو میرے پاس رشتے تھے مجھے ان کی قدر نہیں تھی مگر میں تمہیں بتاؤں انہیں کھو کر میں نے صرف خسارہ کمایا ہے۔ وہ محبت نہیں ہوتی جس کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی وہ اپنے ہوتے ہیں اور اپنوں سے جڑے مضبوط اور خالص رشتے ہوتے ہیں جن کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی۔ زندگی میں انسان کے پاس اور کچھ ہو نہ ہو ایک ایسا مضبوط اور خالص رشتہ ضرور ہونا چاہیے جس کے سہارے انسان کڑی دھوپ کا سفر آسانی سے طے کرسکے اور مجھے لگتا ہے محسن فاروق تمہارے لیے ان شاء اللہ ایک ایسا ہی رشتہ ثابت ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

"میرا دل امی کو چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا۔" خدیجہ نے جب وہ صبح ناشتا بنا رہی تھی اس کے پاس بیٹھتے کہا تھا پیڑا بناتے اس نے غور سے اس کی شکل دیکھی تھی۔

"یہ جو ماں باپ ہوتے ہیں ان کے بہت احسان ہوتے ہیں ہم پر۔ ہم ان احسانوں کا بدلہ نہیں دے سکتے مگر کوشش ضرور کرسکتے ہیں انہیں خوش رکھنے کی ان کے حکم ماننے کی' یہ ہمارا فرض ہوتا ہے۔ جو ہمیں نبھانا ہوتا ہے یہ فرض میں نہیں نباہ سکی مگر تم ضرور نبھانا خدیجہ۔" اس کی بات پر خدیجہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

جس دن خدیجہ محسن فاروق کے ساتھ رخصت ہوئی تھی اس دن اس نے رشیدہ کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان دیکھا تھا جو آج سے پہلے اس نے کبھی ان کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔

"بیٹیاں بہت پیاری ہوتی ہیں اور جب وہ ماں باپ کی عزت سنبھالے عزت سے رخصت ہوتی ہیں تو اور بھی پیاری لگتی ہیں۔ مبارک ہو رشیدہ آج تمہاری بیٹی عزت سے اپنے گھر کی ہوگئی۔"

رشیدہ سے ان کی کسی رشتہ دار خاتون نے کہا تھا۔ خدیجہ کی شادی بہت سادگی سے کی گئی تھی۔

رشیدہ نے چند ایک گنے چنے رشتے دار ہی مدعو کیے تھے ان میں سے بھی زیادہ تر واپس چلے گئے تھے اب چند ایک ہی رہ گئے تھے جو جانے کو پر تول رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

خدیجہ رخصت ہو کر پہلے لاہور پھر وہاں سے جدہ چلی گئی تھی اب وہاں ہی ہوتی تھی اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ۔ وہ خوش تھی مطمئن تھی۔ رشیدہ اب گھر میں ہی رہتی تھیں۔ وہ پہلے کے مقابلے میں اب خاصی کمزور ہوچکی تھیں۔ کہیں آتی جاتی نہیں تھیں۔

خود اس کی زندگی کا محور اب عمر ابراہیم کی ذات بن چکی تھی۔ وہ جب تک گھر رہتا وہ اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی جب باہر جاتا تو اس کے لیے دعائیں مانگتے وہ محو انتظار رہتی۔ عمر' عمر اس کے لبوں پر ہر وقت یہ ہی تسبیح رہتی ہے۔ اس کی کائنات داور ابراہیم سے شروع ہو کر اس پر ختم ہوجاتی تھی اب اس کی کائنات عمر ابراہیم سے شروع ہو کر عمر ابراہیم پر ختم ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

عمر شروع سے ہی اس کے لیے ایک آسان قسم کا بچہ ثابت ہوا تھا۔ وہ پندرہ سال کا ہو رہا تھا اور آج تک اسے یاد نہیں تھا کہ کبھی آس پڑوس کے اسکول سے اس کی کوئی شکایت آئی ہو۔ وہ مودب' تمیزدار اور سمجھ دار قسم کا بچہ تھا۔ صبح وہ اس کی پہلی آواز پر ہی اٹھ جاتا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ اپنی دلکش آواز میں سورہ الرحمٰن کی تلاوت کرتا وہ بھیگتی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے سنتی رہتی۔ پھر وہ چھت پر پرندوں کو باجرہ ڈالنے چلا جاتا وہ ناشتا بنانے باورچی خانے میں۔ جب وہ اسکول کے لیے تیار ہو کر آتا تب تک وہ رشیدہ کو ناشتا دے کر فارغ ہوچکی ہوتی۔ دونوں ناشتا ساتھ کرتے' پھر وہ اسکول چلا جاتا وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹانے لگتی ساتھ ساتھ گھڑی دیکھ کر حساب بھی لگائی جاتی۔

"دس بج گئے عمر کے آنے میں چار گھنٹے رہ گئے تھے۔ بارہ بجیں یعنی عمر کے آنے میں ایک گھنٹہ چالیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

کھانا بنانے کے بعد رشیدہ کے پاس آ بیٹھتی تھی۔ ان سے خدیجہ کی اس کے بچوں کی آس پاس کی باتیں کرتے بھی اس کی نظریں بار بار دروازے کی سمت اٹھتی رہتی تھیں۔ عمر کے آنے کے بعد وہ اکٹھے کھانا کھاتے' نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کرتے۔ شام کو وہ آنے والے بچوں کو ٹیوشن دیتی تو عمر اپنا بیگ کھولے وہیں آجاتا۔ پھر وہ کھانا بنانے لگتی اور وہ کرکٹ کھیلنے محلے کے گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ رات کا کھانا کھا کر نماز پڑھ کر رشیدہ جلدی سو جاتی تھیں۔ وہ دونوں ماں' بیٹا باتیں کرتے رہتے عمر اپنے پورے دن کی روداد اسے سناتا وہ مکمل خاموشی اور بھرپور دلچسپی سے سنتی کبھی ٹی وی لگا کر ڈراما دیکھا جاتا یا عمر کے فیورٹ کارٹون۔ اور دس بجے وہ سونے لیٹ جاتے۔

یہ تھی ان کی زندگی کی روٹین۔ جس سے وہ خوش تھے مطمئن تھے۔

☼ ☼ ☼

بہت پہلے سے اس کا معمول تھا کہ وہ تہجد کے وقت اٹھ جاتی تھی۔ تہجد کی نماز ادا کرکے وہ کتنی کتنی دیر تک سجدے میں سر گرائے رکھتی تھی۔ ندامت کے اور توبہ کے آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے تھے اور وہ آج بھی اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتی تھی۔

وہ محسوس کررہی تھی عمر پچھلے چند دنوں سے بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ وہ پہلے کی طرح اپنی ہر چھوٹی بڑی بات اسے نہیں بتاتا تھا بلکہ گم سم سی کیفیت میں رہنے لگا تھا یہ وہ چیز تھی جو اسے کھٹک رہی تھی وہ اس سے ایک دوبار استفسار بھی کرچکی تھی۔ "کچھ نہیں امی آپ کا وہم ہے۔" جیسے جواب اسے ملے تھے۔ وہ آج واپس آیا تو اس کا چہرہ معمول سے ہٹ کر سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی شرٹ کے اگلے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے وہ اچھا خاصا گھبرا گئی تھی۔

"عمر' عمر کیا ہوا بیٹا۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں امی۔" وہ جواب دے کر بیگ میز پر رکھ رہا تھا۔

"تو پھر تمہارا چہرہ کیوں سرخ ہو رہا ہے اور یہ تمہاری شرٹ کے بٹن کیسے ٹوٹے؟"

"میری لڑائی ہوگئی تھی کلاس فیلوز کے ساتھ۔"

"مگر کیوں؟" وہ جانتی تھی وہ ایک صلح جو قسم کا بچہ تھا پھر یوں اچانک لڑائی کیسے ہوگئی تھی عمر نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا تھا۔ اسے اپنا سوال دوہرانا پڑا تھا۔

"لڑائی کیوں ہوئی عمر؟" وہ اس کے نزدیک چلی آئی تھی۔

"امی میرے ابو کہاں ہیں؟" عمر نے اس کے سوال کے بدلے سوال کیا تھا اور وہ کیا تھا جو اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنے کو کافی تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ انتہائی بے یقین نظروں سے عمر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ عمر نے اپنے باپ کے متعلق سوال پوچھا تھا۔ وہ یہ سوال پہلے بھی کئی بار پوچھ چکا تھا۔ ہر عید' شب برات پر' اسکول میں ہونے والے پیرنٹس ڈے کے حوالے سے فنکشن پر اور سالانہ رزلٹ پر جب اس کے دوستوں اس کے کلاس فیلوز کے ماں' باپ اپنے بچوں کا رزلٹ کارڈ لینے آتے تھے۔ وہ کئی بار یہ سوال کرچکا تھا۔ مسئلہ اس کا سوال نہیں تھا۔ مسئلہ اس کا لہجہ تھا۔ اس نے جس لہجے میں سوال کیا تھا۔ وہ لہجہ اس کے لیے غیر متوقع تھا اور ایسا تھا کہ جس نے اسے بالکل خاموش کردیا تھا۔

وہ گم چپ کی کیفیت میں کھڑی عمر کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"امی میرے ابو کہاں ہیں؟" عمر نے اپنا سوال دہرایا تھا اور سابقہ لہجے میں دہرایا تھا۔

"تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو عمر۔" اس نے

لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا تھا تو اس کا بیٹا اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ وہ اسے کٹہرے میں کھڑا کرتے سوال کرنے لگا تھا۔

"یہ بات اہم نہیں ہے امی۔ اہم یہ ہے کہ میرے ابو کہاں ہیں اور جہاں ہیں وہاں کیوں ہیں' وہ یہاں ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟" وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور اپنی بات پر زور دے کر پوچھ رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا' وہ ایک دن اپنے باپ کے متعلق ضرور پوچھے گا اور تب اسے اس کے سوالوں کے جواب دینے پڑیں گے۔ مگر وہ ایک دن اتنی جلدی آجائے گا یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ ایک گہری سانس بھر کے اس نے عمر کو دیکھا' جس کا چہرا انتہائی سرخ ہو رہا تھا۔

"ہم اس پر بعد میں بات کریں گے تم پہلے کھانا کھالو۔"

"ہم اس پر ابھی بات کریں گے امی اور میں آپ کو بتا چکا ہوں مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ پندرہ سالوں میں پہلی بار تھا جب اس کے بیٹے نے ضد کی تھی اور پہلی بار تھا جب اس نے اس کی بات رد کی تھی۔ اس نے اب کی بار غور سے اپنے بیٹے کی شکل دیکھی اور وہ چیز کھوجنے کی کوشش کی جس کے باعث وہ یوں اچانک ایکدم سے اپنے باپ کے متعلق جاننے پر بضد ہو رہا تھا۔ عمر نے چند لمحے انتظار کیا۔ پھر وہ اس کی خاموشی پر پھٹ پڑا تھا۔

"آپ کو معلوم ہے میں جب بھی باہر جاتا ہوں تو ہر کوئی میرے سامنے ایک ہی سوال لیے کھڑا ہوتا ہے۔ میرے دوست' ان کی مائیں' یہ محلے کے لوگ' میرے کلاس فیلوز۔ وہ سب جاننا چاہتے ہیں میرے ابو کہاں ہیں۔ وہ کہاں ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ وہ ہم سے ملنے کیوں نہیں آتے؟ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہر بار سالانہ رزلٹ پر سب کے ساتھ امی' ابو آتے ہیں۔ میرے ساتھ صرف امی کیوں آتی ہیں؟ میرے کلاس فیلوز میرا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ انہیں ان کے سوالوں کے جواب چاہیے ہوتے ہیں اور جب میں وہ جواب نہیں دے پاتا تو وہ کہتے ہیں وہ مجھے۔" وہ بولتے بولتے یکدم سے خاموش ہوا تھا۔

"کیا کہتے ہیں؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا تھا۔ اس کے بیٹے نے جواب دینے کے بجائے غصے سے سر جھٹکا تھا۔

"بتاؤ عمر وہ سب کیا کہتے ہیں؟" اس نے خالی خالی آواز میں پوچھا تھا۔

"آپ جانتی ہیں میری آج اپنے کلاس فیلوز سے کیوں لڑائی ہوئی کیونکہ وہ آپ کے متعلق غلط باتیں کر رہے تھے۔ وہ آپ کے بارے میں برے الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر پایا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرے ضبط سے پرے کی چیز ہے۔" وہ نم لہجے میں کہتا بیٹھ گیا تھا اور اب بے بسی سے اپنے سر کو جکڑے ہوئے تھا۔ وہ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر وہ لوگ تمہارا مذاق اڑائیں۔" بمشکل اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتی وہ اس کے قریب آبیٹھی تھی اور اسے دلاسا دے رہی تھی۔

"میں کل ہی تمہارے اسکول آؤں گی اور پرنسپل سے ان بدتمیز بچوں کی شکایت کروں گی۔" وہ بہت نرم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"پلیز امی آپ کس کس کی شکایت کریں گی اور کس کس سے کریں گی اور کیا کہیں گی آپ پرنسپل صاحب سے جا کر کہ عمر کے کلاس فیلوز اس سے اس کے باپ کے متعلق پوچھتے ہیں۔ اس کے پاس ان کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس لیے آپ ان بچوں کو منع کر دیں۔ وہ اس سے کم از کم اس کے باپ کے حوالے سے کوئی سوال نہ کریں۔" وہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

بہت عرصے بعد اس نے پرانے سے زنگ آلود لوہے کے صندوق کو کھول کر اس میں سے سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ باہر نکالا تھا۔ یہ وہ ہینڈ بیگ تھا جو وہ جب اپنے باپ کو دیکھنے ہسپتال گئی تھی اس نے اٹھایا ہوا تھا اور جب وہ بے ہوش ہو کے گری تھی' تب خدیجہ اٹھا کر لے آئی تھی۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی اور اندر موجود چیزوں میں سے اپنی مطلوبہ چیز نکالی۔

پندرہ سال اور چھ ماہ بعد وہ اس چیز کو ہاتھ لگا رہی تھی۔ اس نے پاس کھڑے عمر کے چہرے پر پھیلے اشتیاق کو دیکھا اور ہاتھ میں تھامی چیز بنا اک نظر ڈالے عمر کو تھما دی تھی اور خود باہر نکل گئی۔ وہ چیز جو اس نے عمر کو تھمائی تھی اور جسے وہ بہت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اور ابراہیم کی وہ تصویر تھی جو ہر وقت اس کے پاس موجود رہا کرتی تھی۔

اس نے اپنے بیٹے کو سامنے بٹھا کر انتہائی مناسب ترین لفظوں میں اس کے باپ کے متعلق جو وہ بتا سکتی تھی' بتا دیا تھا۔ اسے لگا تھا اب اس کا بیٹا مطمئن ہو گیا تھا اور اب مزید وہ اس سے کوئی سوال نہیں کرے گا۔ اسے غلط لگا تھا۔ کہانی سناتے ہوئے اس نے بہت سارے قصوں کو ادھورا چھوڑ دیا تھا اور عمر نے وہ سارے ادھورے چھوڑے قصے ڈھونڈ لیے تھے۔

"کیا انہوں نے آپ کو گھر سے نکال دیا تھا؟" رات وہ دونوں کھانا سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ جب عمر نے سوال کیا تھا۔ اس کا نوالہ لے کر منہ کی طرف جاتا ہاتھ ساکت ہوا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ واپس پلیٹ میں رکھا اور جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں میں نے اسے چھوڑا تھا۔" اس کی آواز پست تھی۔

"کیا میں وہ وجہ جان سکتا ہوں' جس کی بنا پر آپ نے انہیں چھوڑا؟" اس کے بیٹے نے دوسرا سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے کئی زخموں کے ٹانکے ادھیڑ دیے تھے۔

"تمہارے ابو مجھے وہ نہیں دے پائے تھے جو مجھے چاہیے تھا۔" اس نے عمر کے چہرے کو دیکھتے جواب دیا تھا۔

"کیا وہ بہت غریب تھے؟" عمر نے بھی اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے سوال کیا تھا۔

"دولت ہر کسی کا درد سر نہیں ہوتی۔ زندگی میں اور بھی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو لازمی ہوتی ہیں۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا تھا۔

"اور جن کے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔"

رات بستر پر لیٹتے عمر نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ وہ اپنے ماں' باپ کے پاس جانے کے بجائے یہاں رشیدہ کے پاس کیوں آگئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر عمر کے چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ جتنا اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے ہی اس کے سوال بڑھتے جا رہے تھے۔

"وہ مجھ سے ناراض تھے۔" یہ کہتے ہوئے اذیت کی نجانے کتنی لہریں تھیں جو اس کے اندر اٹھ رہی تھیں اور کیا کچھ نہیں تھا جو اسے یاد آگیا تھا۔ عمر نے چونک کر اسے دیکھتے اس کے سامنے "کیوں" رکھا تھا۔ عمر کے پاس کئی سوال تھے اور ہر سوال میں بہت سارے کیوں اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی وہ اس کے کس کس کیوں کا جواب دے گی۔

"کیونکہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔ میں نے ان کا دل دکھایا تھا اور ان کا اعتماد توڑا تھا۔" وہ سر جھکائے بول رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عمر اس کے چہرے پر پھیلی اذیت کو دیکھے۔ عمر نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے اسے کہا تھا کہ اسے اپنے ماں' باپ سے معافی مانگ لینی چاہیے تھی۔

"ہر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی عمر۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہتے آنکھیں موند لی تھیں۔

صبح عمر اسکول نہیں گیا تھا۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی' وہ ذہنی طور پر کچھ پرسکون ہو جائے۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر آیا تو اس نے اس کے سامنے اس کا پسندیدہ شکر والا پراٹھا رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"وہ اب بھی اسلام آباد میں رہتے ہیں۔" سر جھکائے بنا نام لیے عمر نے پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کس کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں نے بہت سال پہلے اسلام آباد چھوڑ دیا تھا اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔"

"آپ کو نہیں لگتا امی کہ آپ کو دیکھنا چاہیے تھا۔ اپنے لیے نہ سہی میرے لیے ہی سہی۔" عمر کی اگلی بات پر اس کے مٹر چھیلتے ہاتھ اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے تھے۔ اپنے پندرہ سالہ بیٹے کے مشورے پر وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

"بہت سارے گھروں میں میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ بہت سارے گھر ایسے ہیں جہاں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم گھر چھوڑ دیں یا پھر روپوش ہو جائیں۔ مسائل بھاگنے سے حل نہیں ہوتے۔ امی وہ مزید بڑھ جاتے ہیں۔" عمر اپنی بات مکمل کرکے اٹھ گیا تھا۔ وہ گم ہوتے حواس کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ پورا دن اس نے بہت خاموشی سے گزارا تھا اور پوری رات جاگ کر اور سوئے ہوئے عمر پر نگاہ جما کر گزاری تھی۔

"آپ کو دیکھنا چاہیے تھا امی اپنے لیے نہ سہی میرے لیے ہی سہی۔" پوری رات یہ الفاظ اس کی ذہن کی دیواروں سے ٹکراتے اور اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتے رہے تھے۔ اسے لگتا تھا اس کے لیے ایک عمر کافی ہے۔ اسے صحیح لگتا تھا۔ مگر کیا عمر کے لیے بھی ایک وہ کافی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے ساری رات اسے سونے نہیں دیا تھا۔ اس کا بیٹا اس سے کہتا ہے اسے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اسے اس کے باپ کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ وہ اسے غلط کہہ رہا تھا۔ اسے سارے لوگوں نے غلط کہا تھا اور آج ان بہت ساروں میں اس کا بیٹا بھی شامل ہو گیا تھا۔ اسے لگا آج اس کے پاس بولنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ اسے صحیح لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کوئی ایک، دو تین کا کھیل نہیں ہوتی جسے اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق کھیل سکیں۔ مگر میں اسے کھیل ہی سمجھتی رہی، کھیلتی رہی اور غلطیاں کر کر کے ہارتی رہی۔ غلطیوں پر رویا جاسکتا ہے۔ پچھتایا جاسکتا ہے۔ معافی مانگی جاسکتی ہے۔ کبھی کبھار مداوا بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر غلطیوں کو واپس موڑا نہیں جاسکتا۔ اپنے بازو گھٹنوں کے گرد باندھے اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ رشیدہ کو بے طرح اس پر ترس آیا۔

"میں نے داور ابراہیم سے محبت کی، یہ غلط نہیں تھا۔ آنکھیں بند کرکے کی، یہ غلط تھا۔ انسانوں سے آنکھیں بند کرکے محبت نہیں کرنی چاہیے۔ اسے پانے پر آئی تو سب کچھ لٹا کر پایا۔ اس کی محبت اس چیز سے ادا کی جس کا کوئی مول نہیں تھا جو خود انمول تھی اور جسے کبھی بھی کسی بھی شے کے برابر نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی وزن میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

میں وہ عورت ہوں جس نے ایک مرد کی محبت میں اپنی عزت، اپنا مان، غرور، انا، نسوانیت کا وقار سب داؤ پر لگایا اور پھر بھی خالی ہاتھ رہی۔ مجھے خالی ہاتھ ہی رہنا تھا، کیونکہ میں غلط تھی۔ میں کل بھی غلط تھی۔ میں آج بھی غلط ہوں، تب ہی تو میرا بیٹا مجھ سے کہتا ہے میں نے اس کے باپ کو چھوڑ کر غلط کیا۔ وہ صحیح کہتا ہے۔ کیونکہ میری غلطی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس کے پاس فخر کرنے کو باپ کا حوالہ نہیں ہے اور ایسی ماں کا حوالہ ہے، لوگ جس کے خاندان، آگے پیچھے اور کردار کے متعلق مشکوک ہیں اور یہ حوالہ اس کے لیے باعث فخر نہیں، باعث ندامت ہے۔ اس لیے ہی وہ کہتا ہے اس کی ماں غلط تھی۔ اس کی ماں غلط ہے اور مجھے سمجھ نہیں آتا میں آخر کب تک غلطیاں کرتی رہوں گی اور کب تک ان کی معافی مانگتی رہوں گی۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، میری غلطیوں کی بھی حد ہونی چاہیے۔" رشیدہ نے اس کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھا تھا۔ جواب خاموش ہو کر آنسو بہا رہی

تھی۔

عمر رشیدہ کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں اپنے باپ کی تصویر تھام رکھی تھی۔ وہ ساتھ والی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں۔

"بڑی اماں میرے ابو کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی ہے ناں، دیکھیں۔" عمر کی پرجوش سی آواز گونجی تھی۔

"اور جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو بالکل اپنے ابو جیسا لگنے لگوں گا۔ ہے ناں بڑی اماں؟"

وہ خوشی اور فخر سے بولتے ان سے تائید چاہ رہا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لہجے میں موجود فخر کو جانچا۔

وہ فخر کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ جیسا ہے اور اسے سمجھ نہیں آئی۔ اسے زیادہ تکلیف کس چیز سے ہو رہی تھی۔ عمر کے اپنے باپ سے ملتی جلتی شکل و صورت پر کرنے والے فخر اور خوشی سے یا اس کے بار بار میرے ابو کہنے پر۔ وہ جب جب میرے ابو کہتا تھا اسے لگتا تھا کوئی زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر آ مارتا تھا اور وہ اذیت سے سن ہو جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

عمر اگلے دو دن بھی اسکول نہیں گیا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی مگر تیسرے دن وہ چپ نہیں رہ پائی تھی۔

"تم اسکول کیوں نہیں جا رہے عمر؟" اس نے انتہائی تحمل سے پوچھا تھا۔ لیکن عمر کے جواب پر وہ اپنا لہجہ برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے عمر۔ تمہارے ایگزامز میں فقط دو ماہ بچے ہیں اور تم کہہ رہے ہو تمہارا اسکول جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔ اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔"

"میں اسکول نہیں جاؤں گا، نہ آج نہ کل اور اس اسکول میں تو ہرگز نہیں، آپ میرا ایڈمیشن کہیں اور کروا دیں۔" عمر کی اگلی بات پر وہ کئی لمحے اچنبھے سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ پھر طیش میں آکر وہ بولنے لگی

تھی۔ جب رشیدہ نے ہاتھ دبا کر منع کیا تھا۔

"زندگی میں سب ایسے نہیں ہوتا عمر۔" رشیدہ نے نرمی سے کہتے اسے پاس بٹھایا تھا۔

"آج اسکول چھوڑو گے کل محلہ، پرسوں گھر۔ زندگی کسی کمرے میں بند ہو کر گزارنے والی چیز نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز ہے کہ جسے ہم لوگوں کے ڈر سے گزارنا چھوڑ دیں۔ زندگی میں بہت ساری مشکلوں کا، لوگوں کا، ان کے برے رویوں کا، لہجوں کا، باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم لوگوں سے چھپ کر یا الگ ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہمیں ایسے لوگوں کے درمیان رہ کر اور ان کی بہت ساری ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرکے گزارنا ہوتا ہے۔ ڈر جانے والے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تم بھی ڈر جاؤ گے تو بہت پیچھے رہ جاؤ گے۔"

عمر نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ اس دن کے بعد اس نے پھر اپنے باپ کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ اس نے دوبارہ کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ وہ اسکول جاتا۔ واپس آتا۔ کھانا کھاتا۔ کتابیں لے کر بیٹھ جاتا، پھر باہر نکل جاتا۔ واپس آتا، کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ وہ ان دونوں سے اب کم بات کرنے لگا تھا۔ اسے اس کا رویہ کھٹکنے لگا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کے دل بہلانے کا سامان ڈھونڈتی اور عمر کی خاموش صورت دیکھ کر اس کا دل کٹ کٹ جاتا۔ اسے اپنا آپ عمر کا مجرم لگنے لگتا۔

خدیجہ پورے تین سال اور چار ماہ بعد واپس آئی تھی اور اس کے آنے سے وہ جو ان کی زندگیوں میں عجیب سا بوجھل پن آگیا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ رشیدہ اور وہ تو خدیجہ کے آنے کی وجہ سے خوش تھیں ہی عمر بھی خدیجہ کے بچوں کے ساتھ سارا دن خوشی خوشی لگا رہتا اور وہ اسے خوش دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔ رشیدہ ان سب کو دیکھ کر مسکراتی رہتیں، ان کی مسکراہٹ میں اب ایک اطمینان چھلکتا۔ خدیجہ کی آمد ان سب کے لیے ایک ایسی بہار تھی جس نے ان کی زندگی پر چھائی خزاں کو کہیں دور اڑا دیا تھا۔

خدیجہ ڈیڑھ ماہ رہی تھی اور یہ ڈیڑھ ماہ انہوں نے ایک ساتھ بہت ہنسی خوشی گزارا تھا۔ خدیجہ کی واپسی نے جہاں اسے اداس کیا تھا۔ وہیں ایک اطمینان بھی اس کے پاس تھا۔ وہ اطمینان عمر کے رویے میں در آنے والی عجیب سی خنکی اور بے گانگی کے خاتمے کا تھا۔

وہ اس دن اسکول سے لوٹا تو خاصا پرجوش تھا۔ اس کے امتحانات ختم ہو چکے تھے اور اب کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ وہ اسلام آباد جا رہا تھا۔ پندرہ اسکولوں کے درمیان ہونے والے کرکٹ کے مقابلے میں عمر کے اسکول کی بھی ٹیم شامل تھی اور وہ اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا بہت اچھا باؤلر ہی نہیں کیپٹن بھی تھا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا اور بے حد خوش تھا اور جس دن ان کی ٹیم اپنا پہلا میچ کھیلنے جا رہی تھی۔ عمر نے اس کے پاس کھڑے ہو کر کہا تھا کہ وہ ان کی ٹیم کے لیے دعا کرے۔ وہ اسے کہہ نہیں سکی۔ اب اس کی ساری دعائیں ایک اسی کے گرد ہی گھومتی ہیں۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور اس کی پیشانی چومی تھی۔

عمر نے اس سے کہا تھا وہ اس کے لیے دعا کرے۔ وہ پورا دن اس نے دعائیں کرتے گزارا تھا۔ وہ جب شام کو لوٹا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور اس کے جوش میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

عمر کی ٹیم تواتر سے جیت رہی تھی اور وہ لوگ فائنل میں پہنچ گئے تھے۔ جس دن عمر کی ٹیم فائنل کھیلنے گئی تھی۔ پورا دن اس نے جائے نماز پر بیٹھ کر دعائیں مانگتے گزارا تھا۔

عمر کی ٹیم فائنل جیت گئی تھی اور عمر کی جیت کی خوشی میں اس نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی۔ وہ تینوں اس دن بے حد خوش تھے۔ عمر بار بار ہنس رہا تھا اور اس کی ہنسی اس کی طمانیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس دن اس نے عمر کی پسند کا کھانا بنایا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلایا تھا۔ عمر اور رشید مل کر اسے چھیڑ رہے تھے۔ وہ بظاہر خفگی سجائے اندر سے مسکرا رہی تھی۔

عمر کی نئی کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ اور وہ بہت باقاعدگی سے اسکول جا رہا تھا۔ اس دن وہ اسکول سے لوٹا تو اتنا خوش تھا کہ وہ کئی لمحے اس کے معصوم چہرے پر پھیلی خوشی کو حیرت سے دیکھتی رہی تھی۔ اتنا خوش اس نے عمر کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایسی بے ساختہ خوشی تھی جو اس کے اندر سے امڈ رہی تھی اور اس کے سارے وجود سے چھلک رہی تھی۔

اس نے عمر سے اس کی بے تحاشا خوشی کی وجہ پوچھی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے آج ہوئے ٹیسٹ کی وجہ سے خوش ہے۔ کیونکہ اس کا ٹیسٹ اس کی توقع سے بھی زیادہ اچھا ہوا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

نماز پڑھ کے وہ کچن میں آئی تھی۔ عمر بھی اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔ اسے عمر کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ عموماً" وہ اتوار والے روز نماز پڑھ کر دوبارہ سو جاتا تھا اور خاصی دیر سے اٹھتا تھا۔

"کیا بات ہے ' تم آج جلدی اٹھ گئے۔" چولہے پر چائے کا پانی رکھتے اس نے پانی پیتے عمر کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"جی۔ مجھے دوستوں کے ساتھ جانا ہے۔" عمر نے سر جھکائے جواب دیا تھا۔ اس کی آواز خاصی مدھم تھی۔

"کہاں؟" اس کے فریج کھولتے ہاتھ ایک لمحے کو رکے تھے۔

"یوں ہی گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔ سب دوست مل کر راول ڈیم جا رہے ہیں۔" عمر کے جواب پر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ مگر اگلے آنے والے چند دنوں میں اس کا سارا اطمینان حباب بن کر اڑ گیا تھا۔ عمر کی روٹین میں اچانک سے آنے والا بدلاؤ اسے چونکا گیا تھا۔ وہ اسکول سے آتے ہی بہ عجلت منہ ہاتھ دھوتا یونیفارم تبدیل کرتا کھانا کھاتا اور باہر نکل جاتا۔ ایسا پچھلے ایک ہفتے سے ہو رہا تھا اور اس کے پوچھنے پر عمر نے بتایا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر یقین کر لیا تھا۔ مگر یہ عمر کا دوست جواد تھا۔ جس نے اس کے یقین میں پہلی دراڑ ڈالی تھی۔ وہ عمر کا پتا کرنے آیا تھا۔

"وہ تمہارے ساتھ نہیں ہوتا؟" اس نے حیرت بھرے انداز میں جواد سے پوچھا تھا۔

"نہیں' آنٹی وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے مجھے نہیں ملا۔"

"تو پھر وہ خیام کے ساتھ ہو گا۔" اس نے جواد کے ساتھ خود کو بھی تسلی دی تھی۔

"نہیں آنٹی میں خیام سے پتا کر کے آ رہا ہوں۔ وہ پچھلے ہفتے سے اسے بھی نہیں ملا۔" جواد کی اگلی بات نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ عمر نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔

پندرہ سالوں میں پہلی بار تھا جب عمر نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے دکھ نہ ہوتا' غصہ نہ آتا تو اور کیا ہوتا۔ وہ دروازے کے قریب کھڑی تھی اور عمر کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا۔ اس کا اشتعال بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب عمر نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ وہ دروازہ کھولنے کی آواز پر مڑی تھی اور اندر داخل ہوتے عمر کے منہ پر کھینچ کر دو تھپڑ مارے تھے۔ عمر گنگ کھڑا رہ گیا تھا۔

"اپنی ماں سے جھوٹ بولتے اور اسے دھوکا دیتے تمہیں شرم نہیں آئی۔ یہ میں جانتی ہوں' کیونکہ اگر آئی ہوتی تو تم ایسا کرتے ہی کیوں۔" اس کی بات پر عمر نے سر جھکا لیا تھا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گی کہ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا' مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آئندہ کہیں بھی جانا ہو تو کم از کم سچ بتا کر جانا۔ میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ نہ ہی روک سکتی ہوں۔ ہاں مگر جب کوئی تمہارا پوچھنے آئے تو اسے سچ بتا سکوں اور دوسری بات میں تمہیں لوگوں کے گھروں میں تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جاؤں گی۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ واپس مڑی تھی۔

"میں ابو سے ملنے جاتا ہوں۔" اس کے بڑھتے قدموں کو پیچھے سے آنے والی عمر کی آواز نے روکا تھا۔ وہ مڑی اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

یہ بات اسے اس دنیا کا کوئی بھی شخص آ کے بتاتا اسے یقین نہ آتا۔ یہ بات اسے خود عمر نے بتائی تھی۔ اسے تب بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت سموئے اسے دیکھ رہی تھی۔

"عمر۔" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔ وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آئی تھی۔

"تم نے کیا کہا عمر؟" وہ بنا پلک جھپکے سانس روکے عمر سے پوچھ رہی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں امی' میں واقعی ابو سے ملنے جاتا ہوں۔" عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر یقین دلایا تھا' مگر اتنی جلدی اسے یقین کیسے آ سکتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر عمر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی تھی۔ پھر تھک کر اس نے سر جھکا لیا تھا۔

"تو تم نے اسے ڈھونڈ لیا۔" اس کی آواز بھی تھکی تھکی تھی اور وہ ابھی تک خود کو یہ یقین دلانے میں ناکام تھی کہ اس کا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا تھا۔ وہ پچھلے پندرہ سالوں سے ایک بار بھی نظر نہ آنے والے باپ کو ڈھونڈ چکا تھا۔ عمر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں امی میں نے انہیں نہیں انہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔" عمر کی اگلی بات پر اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ نفی میں گردن گھمائی۔ اس بات پر تو وہ مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی تھی۔ عمر نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر بنا مزید کچھ کہے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلا پورا دن اس نے گہری چپ کے ساتھ گزارا تھا اور اس کی چپ عمر کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ مسلسل اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ وہ اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے ناکامی ہو رہی

تھی۔ اس سے اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا تھا۔ وہ رشیدہ اور عمر کی باتوں کے جواب فقط سر ہلا کر یا ہوں' ہاں کر کے دے رہی تھی اور اس کا یہ رویہ عمر کو عجیب سی بے چینی میں مبتلا کر رہا تھا اور وہ بے چینی اس کے پورے وجود سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر لاپروا نظر آ رہی تھی۔

"امی آپ ایک بار میری بات تو سنیں۔" رات اس نے عمر کے سامنے کھانا رکھا تھا۔ جب عمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا تھا' وہ بنا کچھ کہے اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

"میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہوں امی' میں نے یہ بات آپ سے چھپائی' لیکن۔۔۔"

"عمر۔" بہت سکون بھرے لہجے میں اس نے اپنے بیٹے کی بات کاٹتے اسے پکارا تھا۔ عمر سر اٹھا کر اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

"اگر تم واقعی چاہتے ہو میں تمہیں تمہارے جھوٹ کے لیے معاف کر دوں تو۔۔۔" اس نے عمر پر نگاہ جمائی۔

"تم آج کے بعد کبھی اپنے باپ سے نہیں ملو گے۔" اس نے بہت سکون سے عمر کے سر پر دھماکہ کیا تھا۔

"آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں امی؟" عمر نے بہت بے بس ہوتے کہا تھا۔ رشیدہ تڑپ سی گئی تھیں۔ وہ بہت سپاٹ انداز میں بیٹھی تھی۔ اس پر اپنے بیٹے کی التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر اپنے بیٹے کے آنسو بھی اثر انداز نہیں ہو پا رہے تھے۔

"باپ کا حوالہ انسان کا فخر اور اس کی پہچان ہوتی ہے اور خوش قسمتی سے تمہارے بیٹے کو یہ پہچان مل گئی ہے تو اسے چھینو مت۔" رشیدہ نے عمر کا سر اپنے کندھے سے لگاتے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"کچھ لوگوں کے نصیب میں یہ حوالہ نہیں ہوتا' عمر بھی سمجھ لے وہ ان ہی لوگوں میں سے ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہتے عمر کو دیکھا تھا۔

"میں یہ نہیں کر سکتا۔ امی کم از کم میں یہ نہیں کر سکتا' میں نے بہت سالوں بعد اپنے باپ کو پایا ہے۔ میں ایک بار پھر انہیں نہیں کھو سکتا۔" اس کے بیٹے نے روتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے گہری سانس بھری۔

"تو پھر تمہیں اپنی ماں کو چھوڑنا ہو گا عمر۔ کیونکہ تمہیں اپنی ماں اور باپ میں سے کسی ایک کو چننا ہے۔" اس کا انداز اتنا سکون بھرا تھا۔ عمر اور رشیدہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

عمر نے رو' رو کر اس سے التجا کی تھی وہ اس کے ساتھ ایسا نہ کرے مگر اس پر عمر کی کوئی بھی التجا اثر نہیں کر رہی تھی تب رشیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"وہ تمہارا بیٹا ہے اسے دور اپنے پر مت لاؤ۔ اس کے لیے چیزوں کو اتنا مشکل مت بناؤ زندگی میں سب لیے نہیں ہوتا عشاء۔ زندگی میں بہت ساری چیزوں کو چھوڑنا بھی پڑتا ہے انسانوں کو ان کی غلطیوں کے لیے معاف بھی کرنا پڑتا ہے۔" رشیدہ کے دھیمی آواز میں سمجھانے پر وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی وہ رشیدہ کے قریب چلی آئی تھی۔

"چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔ معاف کرنا آسان ہوتا ہے بھولنا آسان نہیں ہوتا۔ آپ جانتی ہیں اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا تھا اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندھے کنویں میں دھکا دے دیا تھا۔ میں نے اپنی باقی زندگی اس اندھے کنویں میں گزاری ہے اور زندگی کسی اندھے کنویں میں گزارنا آسان نہیں ہوتا۔ میں محبت کی قیمت چکاتی رہی وہ کس چیز کی قیمت وصول کرتا رہا؟ مجھے نہیں معلوم۔ آپ نہیں جانتیں اس نے میرے ساتھ کیا کیا کیا۔ میں جانتی ہوں اس نے میرے ساتھ کیا نہیں کیا۔ میرے پاس رشتے نہیں رہے۔ میرے پاس عزت نہیں رہی میرے پاس کوئی خوشی کوئی خواب کوئی امید نہیں رہی بلکہ میرے پاس تو زندگی ہی نہیں رہی۔ وہ بہت پہلے اس شخص نے چھین لی تھی۔ اس کے بعد میں جو بھی گزار رہی ہوں وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ زندگی نہیں تھی۔ آپ نہیں جانتیں میرے ساتھ کیا گزرتا رہا۔ ٹھنڈی میٹھی راتیں' گرم اور حبس بھری راتیں۔ سرد اور طویل راتیں۔۔۔ میں نے جاگ کر آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ سولہ سال سے میں معافی مانگ رہی ہوں۔ سولہ سال سے مجھے لگ رہا ہے میری غلطی قابل معافی نہیں۔۔۔ اور آپ کہتی ہیں میں سب بھول جاؤں۔۔۔ آپ بتائیں میں کیا کیا بھول جاؤں۔ میں کیسے بھول جاؤں اور کیا بھولنا آسان ہوتا ہے؟ میں یہ نہیں کر سکتی' یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ وہ بول رہی تھی' وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ وہ بولتے ہوئے رو رہی تھی۔ رشیدہ اسے تسلی دینے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح سے عمر کو دیکھ رہی تھی اور مختلف کام کرتے وہ اس کی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اندر جاتا۔ باہر نکلتا۔ بلاضرورت چیزیں اٹھاتا پھر رکھ دیتا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ جانتی تھی کیا کہنا چاہتا ہے' وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ خاموش تھی اور چاہتی تھی وہ خود آکر کہے جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ سوکھے ہوئے کپڑے تار سے اتارتے اس نے عمر کے چہرے پر پھیلی بے چینی کو دیکھا تھا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"امی۔۔۔" وہ اس کے پیچھے ہی آیا تھا۔ وہ کپڑے رکھ کر مڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

"امی۔۔۔" وہ انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

"بولو عمر۔" "امی وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔" جھجکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"اور تم نہیں جاؤ گے۔" سپاٹ سے انداز میں کہتے وہ ملے ہوئے کپڑے تہہ کرنے لگی تھی۔

"میں جاؤں گا امی' ورنہ وہ کیا سوچیں گے۔"

"تم نہیں جاؤ گے عمر تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے نہ آج نہ کل' نہ پرسوں۔۔۔ اور اگر جاؤ گے تو پھر واپسی کا سوچ کر مت جانا۔" سابقہ انداز میں کہتے وہ عمر کی طرف سے رخ موڑے کھڑی تھی۔

"ٹھیک ہے امی۔" اسے اپنے پیچھے سے عمر کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"گیا۔۔۔" وہ سب جملے سنتے ہی اس کے قدم زمین سے اکھڑنے لگے تھے۔ اسے لگ رہا تھا وہ مزید ایک سیکنڈ بھی اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ پائے گی۔ کیونکہ اب کی بار عمر داور ابراہیم اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔

سفید کلے گیٹ سے گاڑی اندر لا کر اس نے وہاں موجود گاڑیوں کی قطار کو دیکھا پھر کلائی موڑ کر وقت کا اندازہ لگانا چاہا۔ آٹھ بجنے میں چند منٹس باقی تھے۔ یعنی وہ وقت مقررہ پر وہاں موجود تھا۔ جس کی اسے خود بھی امید نہیں تھی۔ بھاری ہوتے سر اور بوجھل طبیعت کے ساتھ وہ وہاں موجود تھا تو اس کی وجہ ایک ہی تھی۔ وہ اپنے میزبانوں کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انہیں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اس پر بے شمار احسانات تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جن کی وہ دل سے عزت کرتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے وہ آج اس مقام پر تھا جہاں پہنچنے کا اس نے خود بھی کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے وہ آج اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ وہ ان لوگوں کا احسان مند اور شکر گزار نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہاتھ میں چند پیکٹس پکڑے وہ اندر داخل ہوا تھا جہاں اس کے میزبانوں کے چہروں پر اسے دیکھتے ہی پر خلوص سی خیر مقدمی مسکراہٹ آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مزمل حسین اس کے آفس میں ایک اہم پوسٹ پر خدمات سرانجام دیتا تھا۔ ان کے درمیان وہی تعلق تھا جو ایک مالک اور ملازم کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ مگر ایسا ایک سال پہلے تک تھا۔ ایک سال پہلے جب رات کے وقت گھر کی طرف محو سفر وہ اپنی تیز رفتاری، ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کے باعث اپنی گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا تھا۔ تب وہاں سے گزرتے مزمل حسین نے اس کی گاڑی پہچان لی تھی اور پہچان کر نہ صرف فوراً" وہ اپنی گاڑی روک کر اس کی طرف بھاگا تھا۔ بلکہ اس کے نیم بے ہوش وجود کو گاڑی میں ڈال کر اپنے گھر لے آیا تھا۔

اس کے والد صاحب ڈاکٹر تھے اور گھر کے ساتھ ہی ان کا اپنا کلینک تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی مرہم پٹی کی اصرار سے کھانا کھلایا۔ وہ اپلائی وہ گھر جانا چاہتا تھا مگر مزمل حسین اور اس کے والد صاحب نے اسے زبردستی اور اصرار کے ساتھ رات اپنے گھر ہی رکھا تھا۔ اسے مجبوراً" ان کی بات ماننی پڑی تھی۔ صبح ڈاکٹر صاحب نے اس کے زخموں کی پھر سے مرہم پٹی کی تھی۔ مزمل کی ماں اس کے لیے ناشتا لے آئی تھیں۔ اور اصرار سے کھلا رہی تھیں۔ وہ ان سب کے خلوص کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ناشتے کے بعد اسے کچھ پین کلر زدی تھیں۔ کچھ احتیاطیں بتائی تھیں اور مزمل اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔ یہ تھی وہ پہلی ملاقات جو اس کی مزمل حسین کے گھر والوں سے ہوئی تھی۔

اگلے دن وہ گھر پر ہی تھا۔ ابھی اسے چلنے پھرنے میں دشواری کا سامنا تھا اور گردن سے ذرا نیچے لگی چوٹ بھی تکلیف دیتی تھی۔ وہ ٹی وی آن کیے بے دلی سے چینل سرچنگ میں مصروف تھا جب ملازم نے ڈاکٹر صاحب اور مزمل حسین کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس کی عیادت کو آئے تھے۔ اس طرح کی رواداریاں اس نے پوری زندگی میں نہیں نبھائی تھیں اسے ان کے آنے پر حیرت بھی ہوئی شرمندگی بھی۔

"آپ لوگوں نے خوامخواہ زحمت کی۔" اس نے کہا تھا ڈاکٹر صاحب مسکرائے تھے۔

"عیادت کرنا تو نیکی کا کام ہے اور آپ کی وجہ سے یہ نیکی ہمارے نصیب میں آئی ہے۔" وہ مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔ وہ لوگ آدھا گھنٹہ بیٹھے تھے پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور ملازم کو انہیں گیٹ تک چھوڑنے کی ہدایت کی تھی۔

ایک دن بعد وہ ایک بار پھر اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ وہ ابھی تک بستر پر ہی تھا اور چلنے پھرنے سے قاصر۔ اب کی بار اسے ان کا آنا اچھا لگا تھا۔ شاید اکیلے بستر پر پڑے پڑے وہ تنگ آچکا تھا اس نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ آج وہ لوگ ایک گھنٹہ بیٹھے تھے۔ اس سے اگلے دن ڈاکٹر صاحب نے فون پر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔

دو دن بعد وہ ایک بار پھر اس کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ آج انہوں نے اس کے اصرار پر رات کا کھانا اس کے ساتھ کھایا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی کر رہے تھے اور اسے ان کی گفتگو سن کر اچھا لگ رہا تھا۔

چند دن بعد وہ ایک بار پھر ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا وہ ان کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔

"آپ کا شکریہ اس صورت قابل قبول ہوگا جب آپ دوبارہ آنے کا وعدہ کریں گے۔" ڈاکٹر صاحب نے شگفتہ سے انداز میں کہا تھا وہ ہنس پڑا تھا اور اس نے ہامی بھرلی تھی۔

☼ ☼ ☼

مزمل حسین کے گھر جاتے اسے چار ماہ ہو گئے تھے اور ان چار ماہ میں وہ ڈاکٹر صاحب کے کافی قریب آگیا تھا۔ وہ جب بھی فارغ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے آجاتا تھا۔ اسے ان سے مل کر ان کی گفتگو سن کر بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ان گزرے چار ماہ میں ہی اس نے جانا تھا وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والا اکیلا شخص نہیں تھا۔ ان کے پاس اس کے علاوہ بھی بہت سارے لوگ آتے تھے ان کا حلقہ احباب کافی وسیع تھا اور اس میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ پائے جاتے تھے۔

آج وہ آفس سے جلدی اٹھ گیا تھا۔ پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف نہیں جاپایا تھا آج اس کا ارادہ ان کی طرف جانے کا تھا گھر آکر اس نے لباس وغیرہ تبدیل کیا چائے پی اور ڈاکٹر صاحب کی طرف آگیا۔

وہ اس وقت اکیلے تھے۔ اور اسے دیکھ کر انہوں نے اچھی خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اس سے پچھلے ڈیڑھ ہفتے سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی تھی جواباً" وہ انہیں اپنی غیر حاضری کی وجہ بتانے لگا تھا۔ وہ سرہلاتے رہے تھے پھر وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے جب اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کا تذکرہ کیا تھا۔

"آپ نماز کی پابندی کیا کیجیے" کچھ دیر تک خاموشی سے اسے سننے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

"نماز صرف ایک فرض نہیں ہے۔ نماز آپ کی زندگی میں ترتیب سکون اور ٹھہراؤ لانے کا ذریعہ بھی ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا وہ ان لوگوں میں شامل تھا۔ جن کی آنکھوں کے آگے ہمیشہ دھند تنی رہتی ہے۔ یہ دھند بے خبری کی نہیں غفلت اور لاپروائی کی ہوتی ہے۔

"میں سچ بھی بولوں گا تو آپ کو یقین نہیں آئے گا بہتر ہوگا آپ چند روز ہی سہی مگر خود تجربہ کریں اور ایک بات اور یہ چند چیزیں تھیں جو میں نے گنوائی ہیں۔ آپ کسی اور سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو چند اور چیزیں بتائے گا جو اس کی زندگی میں نماز پڑھنے سے آگئی ہیں۔" وہ مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔ وہ مزید کچھ پوچھ نہیں پایا تھا وہ خاموشی سے وضو کر کے ان کے ساتھ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا تھا۔ نماز اسے بہت بچپن میں کبھی سکھائی گئی تھی اور اب وہ ذہن پر زور ڈال کر اور اٹک اٹک کر پڑھ رہا تھا۔ یہ تھی وہ پہلی نماز جو اس نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں کھڑے ہو کر ادا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے ڈاکٹر صاحب سے ملے چھ ماہ ہو گئے تھے اور ان چھ ماہ میں اس نے بہت ساری تبدیلیاں اپنے اندر آتی محسوس کی تھیں۔ نماز اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کی باتوں کی سچائی جانچنے کے لیے شروع کی تھی نماز اب اس کی زندگی اور روٹین کا لازمی جز ٹھہری تھی۔ جس ذہنی خلفشار، الجھن اور پریشانی میں وہ گھرا ہوا تھا۔ اس میں خاصی حد تک کمی آگئی تھی۔ وہ اب بھی بے فکر ہو کر یا پھر پوری رات کی سکون بھری نیند تو نہیں سوتا تھا ہاں مگر جو ایک دو گھنٹے وہ سوتا تھا اب

سلیپنگ پلز کے بغیر ہی نیند آجاتی تھی۔ پچھلے پانچ سال سے وہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اب اس نے باہر نکلنا اور لوگوں سے ملنا شروع کردیا تھا۔ اس کی ذات پر چھایا جمود آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے وقت میں چند اور مثبت تبدیلیاں تھیں جو اس میں آگئی تھیں۔ اس نے مذہبی احکامات کی پابندی شروع کردی تھی۔ ایک محسوس کی جانے والی عاجزی اور انکساری اور دھیما پن۔ اس کے مزاج کا حصہ بنے تھے۔ ایک سکون بھری کیفیت تھی جو اس کے چہرے اور وجود سے جھلکنے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ بدل رہا ہے اسے لگتا تھا وہ بدل چکا ہے۔

☼ ☼ ☼

کاروباری مصروفیات کی بنا پر وہ پچھلے ایک ماہ سے کراچی میں تھا۔ وہ کل شام ہی کراچی سے واپس آیا تھا اور آج شام تھکن کے باوجود وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلا آیا تھا۔ ان کے پاس اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے چند طلبا و طالبات آئے بیٹھے تھے۔ وہ سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسلام اور انسان کے موضوع پر بات کررہے تھے وہاں موجود سب لوگ بھرپور دلچسپی سے انہیں سن رہے تھے۔ وہ بھی سر جھکائے ان کی دلکش گفتگو سن رہا تھا۔ وہ بہت اچھا بولتے تھے یہ اسے معلوم تھا اتنا اچھا بولتے ہیں یہ معلوم نہیں تھا۔

"سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام صرف ناک اور پیشانی سے زمین چھونے کا نام نہیں ہے۔ اسلام صرف چند دینی احکامات کی تعمیل کا نام نہیں ہے۔ اسلام کو اب صرف خدا اور بندے کے درمیان تعلق تک محدود مت کریں۔ اسلام کو صرف گھر سے مسجد تک کی چیز مت بنائیں۔ اسلام صرف گھر سے مسجد تک کی چیز نہیں ہے۔ ہم نے اسلام کو گھر سے مسجد تک محدود کردیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اسلام میرے نزدیک زندگی کے ہر ایک لمحے کو ایمانداری کے ساتھ گزارنے کا نام ہے۔ اسلام ہر فرض ہر رشتے اور ہر تعلق کو سچائی کے ساتھ نبھانے کا نام ہے اور میں حیران ہوتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ ہم میں سے بہت سارے لوگ سارا دن مخلوق خدا کے ساتھ ہزار ہا بے ایمانیاں کرکے زیادتیاں کرکے رات کو اسی خدا کے مصلے پر کھڑا ہونے کا اہل خود کو کیسے سمجھنے لگتے ہیں۔ کیسے ان کی ہمت پڑتی ہے اس رب کے سامنے جانے کی جس کی مخلوق کو حقیر کیڑے مکوڑے سمجھتے اور انہیں ہر طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے ہیں۔

آپ ساری رات مسجدوں میں گر کر معافیاں مانگتے ہیں اور صبح اٹھ کر لوگوں کو تکلیفیں دینے میں ضرر پہنچانے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ تو آپ بتائیں کیا ایسے میں آپ کی وہ معافی قابل قبول ہوسکتی ہے؟ ایک نماز پڑھ لینے سے آپ متقی اور پرہیزگار نہیں بن جاتے۔ اور نہ ہی پیشانی پر محراب سجالینے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہوگئے ہیں۔ صرف سجدے کرنا کافی نہیں ہوتا۔ صرف سجدہ کرنے سے بات نہیں بنتی۔ ہمیں کیا لگتا ہے اللہ صرف ہماری نمازیں دیکھے گا اور ہمیں بخش دے گا ایسا نہیں ہے اللہ صرف آپ کی نمازیں آپ کے روزے اور سجدے نہیں دیکھے گا۔ وہاں آپ کے متعلق گواہی بھی لی جائے گی ان لوگوں سے جو آپ کے ساتھ رہے یا جن کے حقوق آپ کے ذمہ لگائے گئے تھے۔ اللہ آپ سے صرف اپنی نماز کے متعلق نہیں پوچھے گا وہ آپ سے اپنے بندوں سے کی جانے والی زیادتیوں کا حساب بھی لے گا۔

ہم سمجھتے ہیں صرف نماز پڑھ لینا کافی ہوتا ہے مگر میں آپ کو بتاؤں صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا۔" وہ بول رہے تھے وہ اب بھی بول رہے تھے مگر اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اس کے پاس مزید سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھا تھا اور باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ شام کا وقت تھا جب وہ وہاں سے نکلا تھا اب آدھی سے زائد رات گزر چکی تھی اسے شہر بھر کی سڑک ناپتے۔ اسے یاد نہیں تھا وہ کہاں سے آیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی اسے اب کدھر جانا تھا۔ وہ بے مقصد مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا ایک جھٹکے سے اس کے سارے زخموں کے ٹانکے کھل چکے تھے۔ اس کے پورے وجود میں طوفان کے بگولے اٹھتے تھے اور اسے لگتا تھا وہ طوفان اس کی ہستی کو اڑا کر رکھ دے گا۔

بار بار ڈاکٹر عبدالباسط کے کہے الفاظ اس کے ذہن میں گونجتے تھے اور اسے اذیت کے گہرے سمندر میں گرادیتے تھے۔ اسے اس کی حقیقت پتا چل گئی تھی اور اس حقیقت نے اسے منہ کے بل گرادیا تھا۔ پانچ سال لگے تھے اسے سیدھا کھڑا ہونے میں پانچ سال بعد وہ ایک بار پھر منہ کے بل گرا پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک پورا ہفتہ ہوگیا تھا اسے اپنے کمرے میں مقید ہوئے۔ اسے لگتا وہ کبھی خود سے نگاہ نہیں ملا پائے گا وہ لوگوں کا سامنا کیسے کرتا؟ وہ کیا تھا اسے پتا چل گیا تھا اس نے کیا کیا تھا اسے پتا چل گیا تھا۔ اس پورے ہفتے میں اس کی نماز پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ غلط تھا وہ جانتا تھا اتنا غلط تھا اسے علم نہیں تھا لوگ کسی کے دل کے ساتھ کھیلتے ہیں وہ کسی کی پوری زندگی کے ساتھ کھیل گیا تھا۔ ہاتھ پکڑ کر کسی کو اندھے کنویں میں پھینکا تھا اس نے۔ اس نے زیادتی نہیں کی تھی۔ زیادتی کی انتہا کی تھی وہ اپنے انتقام میں اندھا ہوگیا تھا اسے خبر نہیں تھی وہ کیا کرنے جارہا تھا۔ جب خبر ہوئی تو چیزیں ریت کی طرح اس کی ہتھیلی سے پھسل چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے دس دن سے ان کے پاس نہیں گیا تھا اس نے ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے اپنے کسی دوست جاننے والے سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا سیل فون پچھلے دس دن سے بند پڑا تھا۔ آفس فون کرکے اس نے مزمل سے کہہ دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ جب تک آفس نہ آئے وہ ہر چیز کا دھیان رکھے۔ وہ ساری دنیا سے کٹ گیا تھا۔ وہ سارا دن ساری رات کمرہ مقفل کیے بیٹھا رہتا تھا۔ اس میں اس اچانک آنے والی تبدیلی سے اس کے ملازم بھی حیران و پریشان تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے دس دنوں میں تین بار اسے گھر کے نمبر پر کال کی تھی۔ دو بار فون کال اس کے ملازم نے اٹینڈ کی تھی اور بتایا تھا وہ گھر پر نہیں ہے۔ اس نے اپنے ملازم کو یہ ہی بتانے کی ہدایت کررکھی تھی۔ تیسری بار ان کے حد درجہ اصرار پر ملازم اسے بتانے پر مجبور ہوگیا تھا وہ ناچار اٹھ کر کال اٹینڈ کرنے آیا تھا۔

دوسری طرف ڈاکٹر صاحب نے بنا کوئی خفگی و ناراضی ظاہر کیے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں اس کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ اور پھر کل شام آنے کو کہا تھا وہ اسے اپنے کچھ جاننے والوں سے ملانا چاہتے تھے وہ انہیں انکار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر جس ذہنی کیفیت سے وہ گزر رہا تھا وہ کسی سے بھی ملنے ملانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے انہیں اپنی طبیعت کی ناسازی کا بتا کر معذرت کرلی تھی۔ انہوں نے بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ چند لمحے مزید گفتگو کرکے فون بند کرچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور مکمل غائب دماغی کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ وہ ان کی باتیں سن رہا تھا سمجھ نہیں رہا تھا۔ اس کی غائب دماغی انہوں نے بھی محسوس کرلی تھی۔

"کوئی پریشانی ہے؟" انہوں نے اپنی بات بیچ میں روک کر پوچھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"کوئی الجھن ہے تو اس کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔" انہوں نے مشورہ دیا تھا وہ آہستگی سے ہنسا۔

"سارے سرے ہاتھ میں ہیں ڈاکٹر صاحب۔ بس وقت ہاتھ میں نہیں رہا۔"

"اگر آپ مجھ پر اعتماد کریں تو اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کرسکتے ہیں۔"

"مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے لیکن مجھے یہ یقین بھی ہے کہ اگر میں نے اپنی پریشانی آپ سے شیئر کرلی تو آپ ابھی کے ابھی یہاں سے چلے جائیں گے اور دوبارہ میری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کریں گے بلکہ ہوسکتا ہے آپ کو مجھ سے شدید قسم کی نفرت ہوجائے۔"

"اگر آپ نے میرے متعلق یہ اندازہ لگایا ہے تو میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ بہرحال میں ایک انسان ہی ہوں۔ آپ اپنی پریشانی کسی انسان سے شیئر نہیں کرسکتے تو اس کے سامنے لے جائیں جو آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ دھتکارے گا نہیں وہ آپ سے نفرت نہیں کرے گا وہ آپ کو پوری توجہ سے سنے گا۔" ڈاکٹر صاحب نے نرم ترین لہجے میں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔

"آپ نے ہی تو کہا ہے جو انسان رب کی مخلوق کے ساتھ زیادتیاں کرے وہ رب کے مصلے پر کھڑا ہونے کا اہل نہیں ہوتا۔ میں بھی اہل نہیں ہوں۔ میں کس منہ کے ساتھ اس کے سامنے جاؤں؟ آپ نے کہا تھا غلطی ہوجائے تو معافی مانگ لینی چاہیے۔ میں آپ کو بتاؤں میں نے بہت بار مانگی ہے۔ ہر رات روتے ہوئے میں اس سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہوں ہر صبح مجھے لگتا ہے میری مانگی ہوئی معافی میرے منہ پر مار دی گئی ہے۔ میں جانتا ہوں ایسا کیوں ہے۔ غلطیوں کی معافی مل جاتی ہے زیادتیوں کی معافی نہیں ملتی۔"

"ایسا نہیں ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہنا چاہا تھا۔

"ایسا ہی ہے کم از کم میرے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ آپ نہیں جانتے میں کون ہوں۔ میں جانتا ہوں میں کون ہوں۔ میں داور ابراہیم ہوں۔"

☆ ☆ ☆

اس نے بیگ کی زپ کھول کر اندر موجود چیزیں چیک کیں پھر اطمینان کرتے زپ بند کردی تھی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر پہنچا تھا آج اس کا فزکس کا بہت اہم ٹیسٹ تھا اور وہ لیٹ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا باپ پہلے سے موجود تھا اور اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑانے کے ساتھ ساتھ وہ گھڑی پر وقت بھی دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کی ماں ناشتے کی ٹرے لے کر کچن سے برآمد ہوئی تھی اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ اس کی ماں نے پہلے اس کے باپ کو اور پھر اسے ناشتا دیا تھا۔ "یہ انڈا فرائی کیا ہے تم نے؟" وہ سر جھکائے جلدی جلدی نوالے لے رہا تھا جب اس نے اپنے باپ کی دھاڑ نما آواز سنی تھی۔ وہ بے اختیار سر اٹھا کے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کی ماں نے تحمل بھری خاموشی اختیار کی تھی جس پر اس کے باپ کا پارہ مزید ہائی ہوا تھا اس نے بلادریغ اس کی ماں پر اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ نکالنی شروع کردی تھی۔ وہ اس کے سلیقے سگھڑاپے اور تربیت وغیرہ کو خراج تحسین پیش کررہا تھا۔ اور اس کی ماں خلاف معمول خاموش تھی۔ پچھلے ایک سال سے اس کی ماں اس کے باپ کی تمام تر طعنہ زنی اور غصے کے جواب میں یونہی خاموش ہوجایا کرتی تھی۔ ورنہ وہ پہلے وہ بہ وہ جواب دیتی اور مقابلہ کرتی تھی۔ اس نے ایک نظر غصے سے بولتے باپ پر اور دوسری آنسوؤں بھری آنکھوں اور غمگین چہرے والی ماں پر ڈالی اور ناشتا ادھورا چھوڑ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے اسے روکنا چاہا تھا مگر اپنے شوہر کی وجہ سے وہ اس کے پیچھے نہیں جا پائی تھی وہ نہیں چاہتی تھی اب اس کے شوہر کا عتاب اس کے بیٹے پر نازل ہو۔ وہ دل مسوس کر بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کا باپ ابھی بھی بول رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ داور ابراہیم تھا۔ اپر کلاس سے تعلق رکھنے والے امیر کبیر، مغرور اور انتہائی گھمنڈی فطرت اور کانوں کے انتہائی کچے باپ اور مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ایسی عورت جس کا مقصد اس کے باپ سے

کی جانے والی محبت تھی اور جس کا تاوان اس نے ساری عمر ادا کیا تھا۔ ماں کا اکلوتا بیٹا۔

اس کے ماں باپ کی شادی ان دونوں کی ذاتی پسندیدگی کی بنا پر ہوئی تھی۔ جس کی مخالفت دونوں کے گھر والوں نے کی تھی اور انتہائی شدید طریقے سے کی تھی۔ اس کی ماں کے بھائیوں نے اس سے اپنا ہر تعلق توڑ لیا تھا آج سے وہ اس کے لیے مرگئے وہ ان کے لیے مرگئی بات ختم۔

باپ کی طرف ایسا نہیں تھا اس کا باپ اپنے والدین کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ دیر اپنی ناراضی برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ بیٹے کی مانگی گئی معافی پر ان کا دل پسیج گیا تھا۔ بیٹے کو گھر رہنے کی اجازت مل گئی اور بیٹے کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی جیسے طوعاً "کرہاً" قبول کیا گیا برداشت بھی کرلیا گیا مگر رفتہ رفتہ برداشت ختم ہونے لگی اور بیٹے کی پسند آنکھوں میں کھٹکنے لگی چبھنے لگی ہر طرح کا اعتراض بہت آسانی کے ساتھ اس کی ذات میں جڑ دیا جاتا۔ اس کی ماں تب تک مضبوط رہی جب تک شوہر ساتھ رہتا رہا۔ جس دن اس کے باپ نے بیوی کو چھوڑ کر گھر والوں کا یقین کرنا شروع کیا اس دن سے وہ اکیلی پڑتی گئی۔

گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا، غصہ اور نفرت نظر آنے لگی۔ دونوں کو اپنا فیصلہ غلط لگنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے بے تحاشا اور بلادریغ لڑتے اور اس محبت کو کوستے جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی وہ چھوٹا تھا تب ان کی لڑائیوں سے خوف زدہ ہوجاتا۔ بڑا ہوا تو اوبنے لگا۔ وہ گھر سے باہر زیادہ وقت گزارنے لگا۔ وہ جب تک باہر رہتا خوش رہتا جب گھر آنے لگتا تو لگتا اس کی گردن کے گرد کوئی پھندا کسا جارہا ہے اور جان جانے سے وہ گھبرا تا۔

اس نے کبھی اپنے ماں باپ سے ان کے جھگڑوں کی وجہ نہیں پوچھی تھی ان کے بیچ مداخلت نہیں کی۔ ان دونوں کے آپس کے جھگڑوں کے دوران وہ ایک خاموش اور اجنبی تماشائی کا کردار ادا کرتا جسے ان کے کسی جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ان دونوں کی لڑائی کے دوران بالکل لاتعلق سا رہتا تھا۔ مگر ایک بار ایسا بھی ہوا تھا وہ خود کو لاتعلق نہیں رکھ پایا تھا۔ احمد اور حماد دونوں اس کے کلاس فیلوز اور بچپن کے دوستوں میں سے تھے باوجود بہت اچھی دوستی کے اس نے انہیں کبھی اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ مگر اس روز ان دونوں کے اصرار پر وہ انہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کی ماں اس کے دوستوں سے بہت اچھے طریقے سے ملی تھی۔ اس کا موڈ گزشتہ دنوں کی نسبت خاصا خوشگوار تھا۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگا تھا۔

وہ اپنے دوستوں کو اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ اس کی ماں نے ملازمہ کے ہاتھ کولڈ ڈرنک کیک چپس اور کچھ دوسری چیزیں بھیجی تھیں۔ وہ لوگ بہت اچھے اور خوشگوار انداز کے ساتھ گپ لگا رہے تھے وہ لوگ کھانے پینے کی چیزیں انجوائے کررہے تھے۔ جب اس نے اپنے باپ کی دھاڑ نما آواز سنی تھی۔ کولڈ ڈرنک کا گلاس اس کے ہاتھ میں لرز گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بلا ٹل جانے کی دعا مانگنے لگا تھا وہ دعا کررہا تھا کہ اس کے باپ کا غصہ کسی طرح ٹل جائے یا کم از کم اس کی ماں ہی اپنی سابقہ روش کے بجائے آج خاموش رہے۔ اس کی دونوں دعائیں قبول نہیں ہوئی تھیں۔

اس کے باپ کی چنگھاڑوں کے جواب میں اس کی ماں بھی پورے زور سے چیخ رہی تھی شرمندگی اور ندامت سے اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کی جانب دیکھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کررہے تھے اس کی شرمندگی میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ اپنا بھرم کھلنے جانے کے باعث وہ ان سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ احمد اور حماد کچھ دیر بعد چلے گئے تھے وہ انہیں پورچ تک چھوڑ کر واپس آیا تھا۔

اس کے ماں باپ ابھی تک لڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کررہے تھے

"بس کردیں آپ دونوں خدا کے لیے بس کردیں"

اس نے اندر آکر کہا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک لمحے کو خاموش رہ گئے تھے۔

"آپ دونوں کو اندازہ ہے کہ آپ دونوں کی ہر وقت کی چیخ چیخ نے اس گھر کو کیا بنا دیا ہے؟ میں دوسروں کے گھر جاتا ہوں مجھے ان کے گھر گھر لگتے ہیں۔ مجھے اپنا گھر گھر نہیں "جہنم" لگتا ہے۔ اور اسے جہنم آپ دونوں نے بنایا ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں اتنے ہی ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت ہیں تو ایک دوسرے کو چھوڑ دیں اس سے ہم تینوں کی زندگیوں میں اور کچھ تو نہیں کم از کم سکون ضرور آجائے گا۔" اپنے پندرہ سالہ بیٹے کے مشورے پر وہ گنگ ہو کر اس کی شکل دیکھتے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اگلے چند دنوں میں اس نے اپنے ماں باپ کے رویے میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ وہ دونوں اب اس کے سامنے لڑنے سے گریز کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں اب اس کے سامنے ایک اچھے ماں باپ کا اور ایک پرفیکٹ کپل کا رول پلے کرنے لگے تھے۔ اس کی ماں اب ہر وقت رونے دل جلانے اور اس کے باپ کو برا بھلا کہنے کے بجائے اپنا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے بیٹے کے قریب ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں ممتا جاگی تھی۔ ان دنوں ان کے گھر کا ماحول بھی خوشگوار رہنے لگا تھا اس کا باپ ہفتے میں ایک آدھ بار انہیں باہر کھانا کھلانے لے جاتا تھا۔ ان کی پسند کی شاپنگ بھی کروا دیتا۔ اس کے ماں باپ اب ساتھ بیٹھ کر لڑتے نہیں تھے وہ بہت اچھے موڈ میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ اپنی کالج لائف کی اپنے مشترکہ دوستوں کی اور اپنے بیٹے کے شاندار مستقبل کی۔ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ خوش باش دیکھتا اور اس کا دل اطمینان سے بھر جاتا۔ اب اسے اپنا گھر بھی گھر لگنے لگا تھا۔

لیکن یہ گھر ایک بار پھر جہنم تب بنا تھا جب اس کے باپ کی ماں ان کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی اس نے آتے ہی ان کی زندگیوں میں موجود سکون کو بھونچال میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا باپ بھی رفتہ رفتہ اپنی ماں کا ساتھ دینے لگا تھا۔ اسے بیوی میں سینکڑوں کیڑے نظر آنے لگے تھے۔ اس کی ماں کی آنکھیں ایک بار پھر سے نم رہنے لگی تھیں۔ مگر اب کی بار وہ روتی تو وہ اس کی ڈھارس بندھاتا وہ اپنی ماں کے آنسو پونچھتا۔ اور حتی الامکان اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن اس کا ٹیسٹ خلاف توقع اچھا ہوا تھا وہ بہت خوش تھا اور جلد از جلد یہ خوشخبری اپنی ماں کو سنانا چاہتا تھا۔ وہ گھر آیا بیگ رکھ کر یونیفارم تبدیل کر کے اپنی ماں کے کمرے میں جانا چاہتا تھا جب اس کی ماں خود ہی اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا اور چونک گیا تھا اس کی ماں کا چہرہ اور آنکھیں انتہائی سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ پچھلے کچھ گھنٹوں سے روتی رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ اور کچھ کہنے لگی تھی۔ جسے سن کر وہ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ کا گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔

اس کی ماں نے اس سے پوچھا تھا آیا وہ اس کے ساتھ جائے گا یا وہ اپنے باپ کے ساتھ رہے گا۔ اس نے اپنی ماں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی ماں اس کی انگلی پکڑ کر اپنے بھائی کے گھر آئی تھی اس کے بھائی کو ہرگز توقع نہیں تھی وہ بھی دوبارہ یہاں آئے گی وہ چند لمحے حیرت سے گنگ اسے دیکھتے رہے تھے پھر انہوں نے نفرت بھرے انداز میں منہ موڑ لیا تھا۔ اس کی ماں تڑپ کر رہ گئی تھی۔

"نہیں بھائی جی۔ مجھ سے یوں منہ مت موڑیں۔ خدا کے لیے بھائی صاحب مجھے میری غلطیوں کے لیے معاف کر دیں۔" اس کی ماں تڑپ کر آگے بڑھی تھی وہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔ وہ ان سے التجا

کررہی تھی۔ وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے جو رو رہی تھی جو روتے ہوئے معافی مانگ رہی تھی وہ اپنی ماں کے بھائی کو دیکھ رہا تھا جن پر کوئی آنسو کوئی التجا اثر نہیں کررہی تھی۔ وہ اس کی ماں کی طرف متوجہ ہی نہیں تھے وہ گود میں موجود اپنی دس سالہ بچی کی طرف متوجہ تھے۔

"میں جانتی ہوں بھائی صاحب میں غلط تھی مگر میں نے اپنی اس غلطی کی قیمت چکائی ہے اور چکا رہی ہوں۔ میں نے آپ سب کا دل دکھایا تھا۔ اور یقین مانیے میں خود بھی ایک پل کے لیے سکون میں نہیں رہ سکی ہوں۔" اس کی ماں ان کی لاتعلقی اور کٹھور انداز کے باوجود روتے ہوئے بول رہی تھی اس کے ہاتھ ابھی بھی بندھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی ماں کی بے بسی پر رونا آیا۔ اسے اپنی ماں کی لاچاری پر رونا آیا اسے اپنے ماموں کی لاتعلقی پر رونا آیا۔

"اب ان سب باتوں کا کیا فائدہ؟" اس کے ماموں نے لاتعلقی کا چولا اتار پھینکا تھا۔

"تم نے جو کرنا تھا کرلیا۔" انہوں نے بنا اس کی ماں کی طرف دیکھے کہا تھا۔

"مجھے معاف کردیجیے بھائی صاحب۔"

"تمہیں لگتا ہے تمہاری غلطی قابل معافی تھی۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا اس کی ماں کا جھکا ہوا سر مزید جھکا اپنی ماں کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے اسے اندر سے تکلیف ہوئی۔

"تم کہتی ہو تم سے غلطی ہوگئی تھی۔ ہم سے پوچھو تمہاری اس غلطی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا تمہاری اس غلطی کی وجہ سے ہمیں کیا کیا بھگتنا پڑا۔ تمہاری اس غلطی نے ہمیں عرش کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں گرلوایا۔ تمہاری اس غلطی نے ہماری عزت سے اٹھی گردنوں کو شرمندگی کے طوق سے ہمیشہ کے لیے جھکا دیا۔ اور تم کہتی ہو تمہیں معاف کردیا جائے۔ ہر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی ہے۔ تم بہن ہو تمہاری جگہ یہ غلطی اگر میری بیٹی بھی کرتی میں اسے زمین میں گاڑ دیتا اور اگر ایسا نہ کرسکتا تو زندگی بھر اس کی شکل نہ دیکھتا۔" اس کے ماموں نے کہا تھا اور وہاں سے چلے گئے تھے۔ وہ ماں بیٹا رونے کے لیے اکیلے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کی ماں ایک بار پھر اس کے باپ کے گھر آگئی تھی اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور نہ کوئی ایسا ٹھکانہ جہاں وہ جاسکتی۔ اس دن اس کی ماں بے تحاشا اور تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ اس کے دل پر ہمیشہ کے لیے اپنی ماں کے وہ آنسو نقش ہوگئے تھے۔ اس دن کے بعد اس کی ماں خاموش رہنے لگی تھی۔ اور اس کے باپ کے دیے گئے طعنوں میں تیزی آگئی تھی۔ اس کا باپ بیوی کو اکثر اس کے گھر والوں کے طعنے دیتا اور باور کروانے کی کوشش کرتا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے ایک ایسا بوجھ تھی جسے اتار پھینکنے کے بعد وہ پلٹ کر دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے اس کی ماں خاموش ہوجاتی بلکہ اس دن کے بعد وہ اب اکثر ہی خاموش رہنے لگی تھی۔ ویسے اس کے پاس ان طعنوں کے کوئی جواب نہیں تھے جو اس کا شوہر اور گھر والے اسے دیتے تھے وہ اپنی ماں کی دکھی صورت کو دیکھتا اور اس کے دل میں غبار اٹھتا اپنے باپ کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو اس کی ماں کے دکھوں کی وجہ تھے اس کی نفرت کئی گنا بڑھ جاتی۔

☆ ☆ ☆

ان کے گھر کے حالات تب تک ایسے ہی رہے جب تک وہ اپنی ماں کے حق میں بولنے کے قابل نہیں ہوا تھا جس دن وہ پہلی بار اپنی ماں کے لیے اپنے باپ سے الجھا تھا اس دن سے ان کے گھر کے حالات تبدیل ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اس کے باپ کا دم خم جوان ہوتے بیٹے کے سامنے کم پڑنے لگا تھا۔ اس کا رویہ اب مصالحانہ ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی ماں کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی ماں کو ہر طرح سے خوش رکھنے کے جتن کرتا۔ مگر اس کی ماں پر جو ایک مستقل اداسی آٹھہری تھی وہ کم ضرور ہوئی ختم نہیں ہوپائی

تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنی ماں کے خاندان والوں کو دوسری بار تب دیکھا تھا جب ایک حادثے میں اس کے ماں باپ دونوں اس دنیا کو چھوڑ گئے تھے۔ وہ جیسے بھی تھے اس کے ماں باپ تھے اور اسے بہت عزیز تھے۔ یہ سانحہ اس کے لیے جتنا بڑا تھا اتنا ہی اذیت ناک بھی تھا۔ وہ دکھی تھا اور غمزدہ تھا ٹوٹا اور بکھرا ہوا بھی تھا۔ تب بہت سارے لوگ تھے جو اسے سنبھالنے کو آگے بڑھے تھے ان بہت سارے لوگوں میں اس کی ماں کے خاندان والے بھی تھے۔ اس کی ماں کے دونوں بھائی ہمہ وقت اس کی دلجوئی میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کو یاد کرکے روتے غمگین رہتے اور اس کے اندر کی وحشت بڑھنے لگتی۔ اس کے کانوں میں اس کی ماں کی باتیں اس کا رونا گونجتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کی اداس غمگین صورت آتی اور اس کا دل سر دیواروں سے ٹکرانے کو چاہنے لگتا۔

☆ ☆ ☆

آنے والے وقت میں اس نے اپنے باپ کے خاندان والوں سے ہر تعلق ختم کرلیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کے خاندان والوں سے اپنے تعلقات مضبوط کرلیے تھے۔ اس نے بہت جلد ان سب کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ وہ ان کی زندگیوں میں اہمیت اختیار کرتا گیا۔ اسے یہ سب کرنے کے لیے کسی خاص تردد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اور اگر پڑتی بھی تو وہ اپنی ماں کے دکھوں اور تکلیفوں کا حساب لینے کے لیے ضرور کرتا۔

☆ ☆ ☆

چیزیں ابھی اس کے ذہن میں واضح نہیں تھیں۔ ارادہ ضرور واضح اور صاف تھا۔ اپنی ماں کے خاندان والوں سے بدلہ تو اس نے لینا تھا اور ہر قیمت میں لینا تھا ایسی چوٹ پہنچانا چاہتا تھا وہ انہیں کہ وہ ساری زندگی زخم چاٹتے رہیں۔ وہ دوبارہ سر اٹھا کر بات نہ کرسکیں۔ ایسا گھاؤ لگانا چاہتا تھا وہ انہیں۔

سامعہ زبیر اس کی ماں کے بڑے بھائی کی چھوٹی بیٹی۔ بہت جلد وہ اس سے بے تکلف ہوگئی تھی وہ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر پسندیدگی دیکھ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں چیزیں واضح ہونے لگیں اس کا ارادہ انہیں سامعہ زبیر کے ذریعے ہی چوٹ پہنچانے کا تھا۔ اس نے پورا پلان ترتیب دے لیا تھا اور تب اس پر انکشاف ہوا تھا عشا عذیر احمد کی شدید ترین محبت کا انکشاف۔

عشا عذیر اس کی ماں کے چھوٹے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس بھائی کی جس کے سامنے وہ بے بسی سے روتی رہی تھی اور جس نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

وہ پہلے حیران ہوا پھر مسرور۔ سامعہ زبیر یا عشا عذیر۔ اسے فرق نہیں پڑتا تھا اسے فرق پڑنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ فرق تو دوسری طرف پڑنا تھا۔ وہ جانتا تھا چیزیں ویسے ہی ہوں گی جیسے وہ چاہتا ہے وہ اتنی آسانی سے ویسے ہوتی جائیں گی جیسے وہ چاہتا تھا یہ اس پر اب انکشاف ہوا تھا۔ عشا عذیر اس کے پاس آئی تھی اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھیک مانگ رہی تھی اس نے کیا کیا تھا۔ اس نے بھیک دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اپنی کامیابی کا جشن اس نے کئی روز تک منایا تھا۔ وہ خوش تھا اور اسے لگتا تھا اس نے دنیا فتح کرلی ہو۔ تب ہی اسے ایک بار پھر عشا کی کال آئی تھی وہ اس سے ملنا چاہتی تھی اور اسے کچھ بتانا چاہتی تھی۔

"کیا؟" وہ اگلے دن ہی اس کے سامنے تھا۔ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی اسے محظوظ کررہی تھی وہ کچھ کہنے آئی تھی وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھی اور بتا نہیں پارہی تھی وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو کھول اور بند کررہی تھی پھر اس نے اپنے بیگ میں سے ایک سفید لفافہ نکال کر اسے تھمادیا تھا۔

اس نے کھولا' پڑھا اور چونک گیا تھا۔ یہ چیز اس کے لیے غیر متوقع تھی مگر اس نے بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے اس سے کہا تھا کہ وہ یہ سب ختم کردے اس کی بات نے سامنے موجود عورت کے چہرے پر حیرت بکھیر دی تھی۔

"ختم کردوں کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟" اس عورت نے اسی حیرانی سے پوچھا تھا جواباً" وہ جتنے برے لہجے میں جتنے برے الفاظ ادا کرسکتا تھا اس نے کیے تھے۔ وہ اسے جتنا ذلیل کرسکتا تھا اس نے کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شادی۔" اس عورت سے اسے کبھی نہیں کرنی تھی نہ آج نہ کل۔ اس نے اسے ذلیل کرنا تھا کردیا تھا۔ اس نے اس کی عزت خاک میں ملانی تھی اس نے ملادی تھی مگر یہ خدیجہ ماں کی اچانک ہونے والی ڈیتھ تھی۔ جس کے بعد وہ اپنا فیصلہ برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ خدیجہ ماں کی وفات کے چند دن بعد ہی صبا انور اس کے پاس آئی تھی اس نے اسے اس کی ماں کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ وہ عشاء سے شادی کرے۔ اس سے زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کی ماں کے نام پر کچھ مانگا تھا وہ انکار نہیں کرپایا تھا۔ وہ اپنا پرپوزل لے کر خود ان کے گھر گیا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ خوشی خوشی ہاں کردیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کے سوال پر انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا تھا۔

"وہ تمہارے قابل نہیں ہے داور۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے تو سوچ رکھا تھا کہ وہ بہت آسانی سے اور خوشی کے ساتھ اپنا بوجھ اس کے سر ڈال دیں گے تب وہ انہیں ان کی بیٹی کی حقیقت بتائے گا کہ وہ اسے انجان نہ سمجھیں ان کی اکلوتی بیٹی نے جو کالک ان کے چہرے پر ملی ہے وہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ وہ انہیں بے بس دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اس کے سامنے بے بس بیٹھے تھے۔

"آپ کیسی باتیں کررہے ہیں ماموں' میرے لیے آپ لوگوں سے بڑھ کر کوئی نہیں۔" وہ اندر ہی اندر ان کی بے بسی پر لطف اندوز ہوتے کہہ رہا تھا۔

"میرے لیے بھی تم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے بیٹا مگر عشاء واقعی تمہارے قابل نہیں ہے۔" انہوں نے اپنا تمام تر حوصلہ جمع کرکے کہا تھا۔ وہ روتے ہوئے اسے بتارہے تھے کہ انہیں کیوں اپنی بیٹی اس کے قابل نہیں لگ رہی تھی وہ حیران سا انہیں سن رہا تھا۔ اسے ایک فیصد بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ تمام تر سچائی اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

بولتے بولتے انہوں نے عجیب حرکت کی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور اس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے وہ انہیں بے بس دیکھنا چاہتا تھا وہ بے بسی کی انتہا پر کھڑے تھے۔ وہ اس سے التجا کررہے تھے وہ ان کی بیٹی کو اپنا نام دے دے وہ یہاں سے لے جاکر ان کی بیٹی کو جھٹکے مار دے چھوڑ دے جو اس کا دل چاہتا ہے وہ کرے مگر کم از کم اسے یہاں سے لے جائے۔

وہ انہیں یاد کروانا چاہتا تھا وہ دن جب اس کی ماں ان کے قدموں میں بیٹھی تھی اور ان سے معافی مانگ رہی تھی تب انہوں نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے اس کی ماں کا مان رکھا تھا جو وہ ان کا مان رکھے مگر وہ انہیں یہ سب نہیں کہہ پایا تھا اور بظاہر ان کا مان رکھتے اس نے رضا مندی دے دی تھی۔

وہ عشاء عذیر احمد کو عشاء داور ابراہیم بنا کر گھر لے آیا تھا اور بس گھر تک ہی لایا تھا۔ اس سے آگے وہ اسے کوئی درجہ دینے کو تیار نہیں تھا وہ عورت اسے اس قابل لگتی ہی نہیں تھی مگر بات یہاں تک نہیں تھی۔ اس عورت نے اسے اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔

عشاء عذیر نے اس سے محبت کی اس نے غلط نہیں کیا تھا یہ وہ تھا جس نے اس چیز کو اس کی غلطی بنا ڈالا تھا۔ وہ اسے عزت نہیں دے سکتا تھا نہ دیتا وہ اس سے محبت نہیں کرسکتا تھا نہ کرتا مگر وہ اس کے لیے زندگی تو عذاب نہ بناتا مگر اس نے یہی کیا تھا اس نے اس کے لیے زندگی کو عذاب بنا دیا تھا اور ایسا عذاب بنایا تھا کہ وہ اس کی زندگی سے نکلنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

عذیر ماموں کو اچانک ہونے والے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے تین دن کے بعد آفس آیا تھا۔ تین دن تک وہ اسپتال میں ان کے ساتھ رہا تھا۔ وہ ان کے سامنے اپنا امیج ہر حال میں بہترین رکھنا چاہتا تھا۔ پچھلے تین دن سے پھیلے کام کی مصروفیات نے اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں دی تھی۔

شام چھ بجے کا وقت تھا جب اسے گھر سے ملازمہ کی کال آئی تھی وہ اسے بتارہی تھی کہ بیگم صاحبہ صبح کی گھر سے نکلی ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ وہ چونکا تھا۔

"وہ کہاں گئی ہیں؟ یہ مجھے نہیں معلوم ہاں پر وہ صبا میڈم کے ساتھ گئی تھیں۔" اس نے ملازمہ کو فون رکھنے کا کہا تھا اور خود عشاء کا نمبر ملانے لگا تھا کال ملازمہ نے اٹینڈ کی تھی وہ فون گھر چھوڑ گئی تھی۔

رات آٹھ بجے کا وقت تھا جب اس کی گاڑی صبا انور کے گھر کے باہر آرکی تھی اور اب وہ اس کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھا تھا وہ خود پریشان تھی اور بار بار اپنی پیشانی مسل رہی تھی۔

"مجھے خود نہیں معلوم کہ وہ یوں اس طرح اچانک کہاں گئی وہ میرے ساتھ انکل کو دیکھنے اسپتال گئی تھی میں اندر انکل کے پاس تھی اور وہ باہر کھڑی تھی اور جب میں باہر نکلی تو وہ کہیں نہیں تھی۔ میں نے پورا اسپتال' پارکنگ اور ارد گرد کا ایریا چھان مارا پر وہ نہیں ملی' میں سمجھی وہ گھر چلی گئی ہوگی مگر جب آپ کے گھر کال کی تو ملازمہ نے بتایا وہ گھر نہیں پہنچی۔" صبا انور کے پاس سنانے کے لیے کہانی تھی وہ یقین تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں سے چھلکتی پریشانی اور چہرے پر چھایا تفکر۔ وہ سر ہلاتا اٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جتنی تیزی سے اس کی گاڑی سڑک پر بھاگ رہی تھی اس سے دگنی رفتار سے اس کا دماغ الٹ پلٹ رہا تھا۔ بار بار اپنے بالوں میں اضطراب سے انگلیاں چلاتے اسے عشاء عذیر پر اس شدت کے ساتھ غصہ آرہا تھا کہ دل چاہ رہا تھا ابھی وہ سامنے آجائے اور وہ اسے شوٹ کردے۔ پچھلے تین گھنٹوں سے وہ اسے ڈھونڈ رہا تھا اور اگلے تین گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہ ناکام رہا تھا۔

دو دن دو راتیں۔ غصہ' تفکر اور پریشانی میں ڈھل چکا تھا۔ تمام رشتے داروں اور جاننے والوں ——— تمام چھوٹے بڑے اسپتالوں' دارالامان یہاں تک کہ مردہ خانوں سے بھی پتا لگایا تھا۔ وہ کہیں نہیں تھی وہ کہیں بھی نہیں تھی۔

دو دن دو ہفتوں میں اور دو ہفتے دو مہینوں میں ڈھل چکے تھے۔ عشاء عذیر واپس نہیں آئی تھی اور ان گزرے دو ماہ میں اسے کوئی بھی ایک ایسا لمحہ یاد نہیں تھا جو اس نے حالت سکون میں گزارا ہو۔ اسے لگتا وہ اکیلی نہیں گئی تھی وہ اس کی زندگی سے سکون و اطمینان بھی لے گئی تھی۔ ہر دن وہ نئی امید کے ساتھ اسے ڈھونڈتا اور ہر آنے والی رات وہ انجانے خدشوں کے ساتھ گزارتا۔ اسے اپنے کاروبار کی فکر نہیں رہی۔ اس نے آفس جانا چھوڑ دیا۔ اس نے دوستوں سے جاننے والوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ اسے دوست' رشتہ دار ملنے والے سب بھول گئے اسے ہر چیز بھول گئی اسے صرف عشاء عذیر احمد یاد رہ گئی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب اسے لگتا وقت گزر رہا ہے اور زندگی ٹھہر گئی ہے۔ وہ سارا سارا دن ایک عورت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا اور ہر دن کی ناکامی کے بعد اس کا احساس جرم بڑھنے لگتا۔ وہ عورت اکیلی نہیں گئی تھی وہ اس کا بچہ بھی ساتھ لے کر گئی تھی یہ چیز اسے مزید تکلیف دیتی وہ ساری رات اذیت کے صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا اور حساب کتاب کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ عشاء عذیر کی محبت ماپنے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنے ظلم گننے کی کوشش کرتا۔ وہ عورت اس سے محبت کرتی تھی اور اس نے اس چیز کو اس کے گلے کا پھندا بنا دیا تھا۔ وہ اس عورت کو ان گناہوں کی سزا دے رہا تھا جو اس

عورت نے کیے ہی نہیں تھے۔ اسے یقین نہ آیا یہ سب اس نے کیا ہے؟ اسے احساس ہو رہا تھا مگر غلط وقت پر ہو رہا تھا۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ خود کو سنبھال نہیں پایا تھا۔ وہ خود کو ایک مضبوط اعصاب کا مالک انسان سمجھتا تھا اسے اب پتا چلا تھا وہ کتنے کمزور اعصاب کا مالک ہے وہ سنبھل نہیں پا رہا تھا' ان گزرے چھ ماہ میں بہت ساری چیزیں تھیں جو اس کی زندگی سے نکل چکی تھیں اس کی زندگی میں سکون نہیں رہا۔ اس کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں رہا۔ اس کی زندگی میں ترتیب نہیں رہی۔ اس نے دوستوں کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ اس نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ وہ کئی کئی گھنٹے انجان راستوں پر بھٹکتے ہوئے گزارتا تھا۔ اس کی زندگی گھر سے آفس' آفس سے گھر تک محدود ہو گئی تھی۔

وہ وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکال رہا تھا جب مختلف رنگوں کی شرٹس نکالتے اس کی نظر کونے میں ٹنگی بلیو کلر کی شرٹ پر پڑی تھی یہ وہ شرٹ تھی جو عشنا اس کے لیے لائی تھی اور آج اس نے وہی شرٹ اس کے پہننے کے لیے نکالی تھی۔

"یہ شرٹ؟ میں لے کر آئی تھی۔"

"کیوں؟"

"مجھے لگا یہ کلر آپ پر سوٹ کرے گا۔" اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ آئی تھی۔

"اور تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہاری پسند کی ہوئی شرٹ پہن لوں گا۔" پہلے دو سوالوں کے جواب اسے معلوم تھے اس نے دے دیے تھے اس سوال کا جواب اسے معلوم نہیں تھا وہ خاموش رہی تھی وہ سر جھٹک کر دوسری شرٹ نکالنے لگا تھا۔ وہ بلیو شرٹ ابھی تک ایک کونے میں لٹکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر باہر نکالی تھی پھر پہن لی تھی اگلا پورا ماہ وہ بلا ناغہ یہ شرٹ دھلوا دھلوا کر پہنتا رہا تھا۔ آخر ایک دن اس کی ملازمہ کو اسے بتانا پڑا تھا کہ بار بار کی دھلائی کے بعد وہ شرٹ اب پہننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے سر ہلایا تھا اور اس کی ملازمہ کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب وہ شام کو اسی رنگ اور ڈیزائن کی شرٹ خرید لایا تھا۔

☼ ☼ ☼

عدنان اظہر اس کا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ یونیورسٹی میں بھی وہ دونوں اکٹھے تھے' تعلیم مکمل کر کے اس نے اپنے باپ کے ساتھ بزنس جوائن کر لیا تھا۔ عدنان اظہر لاہور چلا گیا تھا۔ پچھلے دس سالوں سے وہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے ساتھ آفیشلی طور پر منسلک تھا۔ وہ لاہور سے اسلام آباد اس کے لیے آیا تھا اور اب اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"زبیر بہت خفا ہو رہا تھا' تم اس کے ولیمے پر بھی نہیں آئے۔" اس نے اپنے ایک اور مشترکہ دوست کا نام لے کر کہا تھا۔ "میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" ہاتھ میں پکڑے کپ پر نگاہ جما کر اس نے کہا تھا۔

"وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں پچھلے کچھ عرصے سے تمہاری طبیعت مستقل خراب رہنے لگی ہے۔ تم نے محسوس کیا پچھلے کچھ عرصے سے تم کتنے بدل گئے ہو۔ تم نے سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ باہر آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔ سارا سارا وقت تم کمرے میں بند ہو کر گزارنے لگے ہو۔ تمہارے معمولات زندگی ڈسٹرب ہو کر رہ گئے ہیں۔ تم دو دو' تین تین دن کھانا نہیں کھاتے۔ ساری ساری رات جاگ کر گزارتے ہو۔ تم نے اپنے کاروبار پر توجہ دینی چھوڑ دی ہے تمہاری لاپروائی اور عدم دلچسپی کے باعث صرف ایک ماہ میں تمہاری کمپنی کے دو اہم اور بڑے کنٹریکٹ ہاتھ سے نکل دیے۔ اس سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہے اور وہ کیا ہے یہ تم بتاؤ گے۔" اسے عدنان کی باتیں حیران نہیں کر رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا اسے یہ ساری باتیں اس کے ملازموں نے پہنچائی تھیں اسے اندازہ تھا اس کے ملازم اسے عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں اور پیٹھ پیچھے اس کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

عدنان اسے زبردستی اپنے ساتھ باہر لے آیا تھا۔ کچھ دیر مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد وہ اسے مشہور شاپنگ مال میں لے آیا تھا۔ سیڑھیاں اترتے اسے جیولری شاپ میں داخل ہوتی عورت پر اس عورت کا گمان ہوا تھا جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اگر اس دنیا میں اس کے لیے سب سے غیر اہم کوئی ہے تو وہ' وہ عورت ہے اب وہ اس عورت کی تلاش میں اندر داخل ہونے والی عورت کے پیچھے لپکا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ عدنان کو بھول گیا تھا۔ وہ وہاں موجود تمام لوگوں کو بھول گیا تھا۔ وہ بھول گیا وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ عشناء عشناء کہتے اس عورت کے پیچھے اندر داخل ہوا تھا اندر موجود عورت نے حیرت بھرے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا اور وہ وہیں ٹھہر گیا تھا۔

وہ عورت وہ نہیں تھی' وہ عورت وہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے پتا تھا وہ غلط تھا اسے ان غلطیوں کی سزا کتنی اور کب تک ملنی ہے یہ اسے پتا نہیں تھا۔ لیکن یہ صرف ایک احساس نہیں تھا جو اس پر ہوا تھا اس پر اس گھڑی مہنگے ترین شاپنگ مال میں جیولری کی مہنگی ترین شاپ پر کھڑے کھڑے ایک اور انکشاف بھی ہوا تھا۔ اسے اس عورت سے محبت ہو گئی تھی جسے وہ اپنے ہاتھوں ایک اندھے کنویں میں ڈال چکا تھا۔ اسے عشناء عزیر احمد سے اس وقت محبت ہو گئی تھی جب وہ اس کی زندگی سے جا چکی تھی۔

اس نے سب کچھ عدنان کے سامنے رکھ دیا۔ ہر بات' ہر چیز اس کے سامنے کھولتا چلا گیا۔ وہ نظر جھکائے بول رہا تھا اور جب بولتے بولتے تھک گیا تو اس نے نظر اٹھا کر عدنان کو دیکھا تھا۔ اس وقت جو کچھ اس کے چہرے پر تھا اس نے اسے ایک بار پھر سے نگاہ جھکا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ دونوں خاموش تھے اور بہت دیر تک خاموش ہی رہے تھے۔ "جو ہو گیا ہے اسے بھولنے کی کوشش کرو۔" بہت دیر بعد عدنان بولنے کے قابل ہوا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"زندگی ایسے نہیں گزرتی۔ زندگی میں بہت ساری چیزوں کو مائنس بھی کرنا پڑتا ہے۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں تم سے بھی ہوئیں' لیکن اب ان غلطیوں کو لے کر ساری زندگی کے لیے رویا بھی تو نہیں جا سکتا۔ چیزیں غلط ہو جائیں تو یا تو انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر ان پر صبر کر لیا جاتا ہے تم اب چیزوں کو ٹھیک نہیں کر سکتے تم اب ان پر صبر کر لو۔" وہ اسے سمجھاتا رہا' وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔

پانچ سال پہلے عشناء عزیر اس کی زندگی سے نکل گئی تھی اور پچھلے پانچ سال اس نے جس ذہنی خلفشار اور بے سکونی کے ساتھ گزارے تھے پانچ سال بعد بھی وہ اپنی جگہ پر پہلے دن کی طرح موجود تھی عدنان کے سمجھانے پر اس نے بظاہر خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس نے اپنے کاروبار پر توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ان پانچ سالوں میں بہت سارے ہاتھ تھے جو اس کی طرف بڑھے تھے' مگر اس کی جانب سے ہونے والی سرد مہری کے مظاہرے نے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کی زندگی ایک جیسے ڈھب پر گزر رہی تھی جب اس کی ملاقات ڈاکٹر عبدالباسط سے ہوئی تھی وہ بدلنے لگا اس کی سوچ بدلنے لگی۔ اب اس کی زندگی میں ٹھہراؤ' سکون' ترتیب آنے لگی۔ پہلے وہ اللہ کو مانتا تھا اب اس نے اللہ کو جاننا شروع کر دیا۔ اسے لگا وہ اپنے رب کے قریب ہو رہا ہے یہ تو اسے اب پتا چلا تھا وہ تو اس رب کے مصلے پر کھڑا ہونے کا بھی اہل نہیں ہے۔ وہ غلط تھا۔ کتنا غلط تھا اسے صحیح معنوں میں اب پتا چلا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنا آپ ڈاکٹر صاحب کے سامنے کھول دیا تھا۔ اپنی حقیقت بتاتے وہ کئی بار رو پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تسلی دیتے انداز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا جسے وہ نرمی سے تھپتھپا رہے تھے۔

ہر انسان اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں غلط ہوتا ہے مگر ہر انسان کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ چند ایک ہوتے ہیں جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتے ہیں اور آپ ان چند ایک میں سے ہیں ایک بات یاد رکھیے

گا داور صاحب۔ وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں شروع سے ہی صراط مستقیم پر چلایا جاتا ہے مگر ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ ہوتے ہیں جو اپنی عقل اور سمجھ کے زور پر صراط مستقیم کو ڈھونڈ لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دل میں اللہ اپنی محبت ڈال دیتا ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے اللہ خود محبت کرتا ہے۔ اللہ آپ کو یہ نہیں کہتا کہ آپ کبھی غلطی ہی نہ کرو۔ اللہ آپ سے یہ کہتا ہے۔ غلطی ہوجائے تو اس پر نادم ہونا سیکھو۔ اور غلطیوں کا اعتراف کرنا سیکھو اپنی غلطیوں پر معافی مانگنا سیکھو۔ غلطی ہوجائے تو معافی مانگ لینی چاہیے۔"

وہ اپنے مخصوص نرم انداز میں بول رہے تھے جب خاموشی سے سنتے اس نے تڑپ کر سر اٹھایا تھا۔

"ہر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب۔"

"ہوتی ہے ہر غلطی قابل معافی ہوتی ہے۔ وہ اللہ ہے ہم انسان ہیں۔ وہ رحیم ہے اور ہم اس کی رحمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہمارے پاس نہیں ہے کہ ہماری کون سی غلطی قابل معافی ہے کون سی نہیں۔ معاف کرنا اس کا وصف ہے۔ معافی مانگنا آپ کے اختیار میں۔ آپ وہ کیجیے جو آپ کے اختیار میں ہے۔ ایک بات یاد رکھیے گا۔ جب بھی ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوجائے تو یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ چاہتا ہے آپ اپنی غلطیوں کی معافی مانگیں۔ آپ بھی مانگیں۔ دل سے مانگیں، یقین جانیے وہ ضرور معاف کرے گا۔"

جب انسان بکھرتا ہے اللہ کسی نہ کسی وسیلے کے ذریعے اسے سمیٹ دیتا ہے اس کا وسیلہ ڈاکٹر عبدالباسط بنے۔ اسے سمیٹ لیا گیا اسے سنبھال لیا گیا۔ بدلے میں معافی مانگنا سکھا دیا گیا۔ وہ معافی مانگتا۔ ہدایت مانگتا اور پرسکون رہتا۔

ڈاکٹر صاحب اگلے کئی دن تک اس کے پاس آتے رہے تھے۔ وہ اسے سنبھالتے رہتے وہ سنبھلنے لگا۔ اس نے کاروبار پر توجہ دینی شروع کردی۔ اس کے کاروبار نے ترقی کرنی شروع کردی۔ وہ محنت کرتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھتا اور عاجز رہتا۔

اگلے چند سالوں میں اس نے اپنے ماموں اور تایا چچا سے بھی ملنا شروع کردیا تھا۔ ایسا اس نے ڈاکٹر صاحب کے سمجھانے پر کیا تھا۔ وہ لوگ اس کی ذات میں ہونے والے بدلاؤ پر حیران بھی ہوئے اور متاثر بھی۔ انہیں خبر نہیں تھی اسے توڑ کر جوڑا گیا ہے وہ عذیر ماموں سے بھی ملا وہ پہلے کی نسبت بہت کمزور ہوگئے تھے اور مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ ان سے مل کر اس کی ندامت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ وہ انہیں سچ بتانا چاہتا تھا مگر ڈاکٹرز نے انہیں ہر طرح کی ٹینشن سے بچانے کی ہدایت کر رکھی تھی مجبوراً" اسے بنا کچھ بتائے واپس آنا پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

عدنان اظہر پچھلے دس سال سے پاکستان کرکٹ بورڈ سے منسلک تھا۔ اس کی جاب فنانشلی طور پر زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ آرام دہ بھی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی جاب سے خاصا مطمئن اور خوش تھا۔ کرکٹ بورڈ نے ان دنوں ایک پروگرام ـــ شروع کر رکھا تھا جس کا مقصد نوجوان اور اچھے کھلاڑیوں کو سامنے لانا تھا۔

وہ ان دنوں اسلام آباد میں تھا اس کے ساتھ دو سینئر کھلاڑی بھی تھے اسلام آباد اور پنڈی کے اسکولوں کے درمیان ہونے والے کرکٹ میچ کا فائنل دیکھنے وہ لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہاں موجود لڑکوں میں جوش و خروش بڑھ گیا تھا وہ ٹیمز میدان میں اتری تھیں۔

میچ شروع ہوچکا تھا۔ اس کی توجہ میچ سے زیادہ اپنی بیوی کو کیے جانے والے ٹیکسٹ پر تھی۔ وہ آج بے دلی کے ساتھ وہاں آیا تھا اور اپنی بیوی کو میسج کرکے اپنا وقت گزار رہا تھا۔ میچ اختتام پذیر ہوا تو پنڈی کی ٹیم جیت چکی تھی۔ انتظامیہ کی طرف سے انعامات دیے جارہے تھے۔ اس نے بھی موبائل جیب میں ڈالا اور سامنے کھڑی ٹیمز کی طرف متوجہ ہوا اور چونک گیا۔

اس کے سامنے پندرہ سالہ داور ابراہیم کھڑا تھا۔

وہ لڑکا عمر ابراہیم تھا وہ راولپنڈی کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی ٹیم کا کیپٹن تھا۔ اس کی نظریں مسلسل اس لڑکے کے چہرے پر تھیں۔ اس لڑکے کی شکل اس کا ایک ایک نقش اس کی مسکراہٹ سب کچھ داور ابراہیم سے ملتا تھا وہ داور ابراہیم کو بچپن سے جانتا تھا جس شخص نے داور ابراہیم کو ایک بار دیکھا ہوتا وہ بھی جان جاتا کہ اس لڑکے کا داور ابراہیم سے تعلق ہے۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ پچھلے دو سال سے امریکا میں مقیم تھا۔ (کاروباری مصروفیات کے باعث پاکستان میں اپنی کمپنی کا ہیڈ اس نے مزمل کو بنادیا تھا۔ امریکا قیام کے دوران اس کا رابطہ ڈاکٹر صاحب اور عدنان کے ساتھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی گہری نیند کال بیل کی تیز آواز پر ٹوٹی تھی۔ سلیپرز پہن کر وہ دروازہ کھولنے آیا تھا۔ سامنے مسکراتا ہوا چہرہ لیے جیسی کھڑی تھی کیتھرین ڈی سوزا اس کے اپارٹمنٹ کے سامنے والے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ وہ جب یہاں شفٹ ہوا ! ! ویلکم کہنے والوں میں کیتھرین سرفہرست تھی۔ وہ عام امریکن لڑکیوں سے بہت مختلف اور سادہ مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ خاصی خوش اخلاق اور جلدی بے تکلف ہونے والے لوگوں میں سے تھی ان کے درمیان ہونے والی بے ضرر قسم کی دوستی میں زیادہ ہاتھ اسی کا تھا مگر کب کیتھرین نے اس دوستی کو خاص معنی پہنانے شروع کیے اس کا پتا نہیں چلا ہاں مگر جب اندازہ ہوا تو اس نے احتیاط برتنی شروع کردی۔

اس نے اپنے اور کیتھرین کے درمیان ایک مخصوص قسم کا گریز پیدا کرلیا وہ اس لڑکی کو کسی بھی خوش فہمی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا حالانکہ جن دنوں عدنان اس کے پاس آیا ہوا تھا اس نے مشورہ دیا تھا کہ کیتھرین ایک اچھی لڑکی ہے اور اسے اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ اسے عدنان کا مشورہ اچھا نہیں لگا تھا۔

"تم جانتے ہو میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔"

عدنان چند لمحے غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا پھر اس نے سر جھٹکا تھا۔

"وہ عورت تمہاری زندگی سے جاچکی ہے۔ اب اس کے پیچھے ساری زندگی برباد کروگے کیا؟ زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کا ہاتھ تھامنا پڑے گا وہ ہاتھ کیتھرین کا ہوجائے تو کچھ برا نہیں۔ ماضی سے نکل حال میں جینے اور مستقبل کو سوچنے کی کوشش کرو۔"

تب اس نے عدنان کو روک دیا تھا اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عدنان نے بھی پھر بات نہیں کی تھی۔ اس نے کیتھرین کو اندر آنے کی دعوت دی۔ دروازے کے ایک طرف ہوکر اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ کیتھرین نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا اس نے سرخ پھولوں کا گلدستہ اٹھایا ہوا تھا۔

آج چودہ فروری تھی اور وہ باضابطہ طور پر اپنی محبت کا اظہار کرنے آئی تھی اس نے پھول اس کی طرف بڑھائے تھے۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا تھا۔ اس نے پھول لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے تھے۔

"میری زندگی میں ان ساری چیزوں کی گنجائش نہیں ہے کیتھرین۔" اس نے کہا تھا کیتھرین کا مسکراتا چہرہ کچھ لمحوں کے لیے تاریک ہوا تھا۔

"میں تمہارے جذبوں کی قدر کرتا ہوں کیتھرین مگر ان کی پذیرائی کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ میں شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہوں۔" اس نے اس کے سر پر دھماکہ کیا تھا۔

کیتھرین بہت افسردہ ہوکر گئی تھی۔ وہ خود بھی اس کا دل دکھا کر پشیمان تھا مگر جو وہ مانگ رہی تھی وہ اسے دے نہیں سکتا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی بیٹھا رہا پھر دانستہ دھیان بٹانے کو اٹھ کر کمپیوٹر آن کرنے لگا۔ میلز چیک کرتے اور جواب لکھتے گھنٹہ گزر گیا تھا جب سائیڈ ٹیبل پر موجود اس کا سیل بجنے لگا تھا۔ عدنان کالنگ کے الفاظ چمک رہے تھے وہ سیل آن کرکے کان سے لگاتا

کچن میں چلا آیا تھا۔ الیکٹرک کیٹل میں چائے بناتے وہ عدنان سے بات بھی کر رہا تھا۔

"تم پاکستان کب تک آرہے ہو؟" دو باتوں کے بعد ہی عدنان نے پوچھا تھا۔

"فی الحال تو کوئی ارادہ نہیں۔" چائے کپ میں انڈیلتے اس نے کہا تھا۔

"اگر میں کہوں کل ہی آجاؤ تو؟"

"خیریت؟" وہ واپس سٹنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"خیریت ہی ہے' میں تمہیں کسی سے ملانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں عمر داور ابراہیم سے ملوانا چاہتا ہوں۔" عدنان کے الفاظ پر اس کا ہاتھ کانپا تھا اس کا سارا وجود کانپا تھا اس کے ہاتھ میں موجود کپ نیچے جا گرا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے پاکستان کی ٹکٹ تین دن بعد کی ملی تھی اور یہ تین دن اس نے کیسے گزارے تھے وہی جانتا تھا۔ وہ ہر آدھے گھنٹے بعد عدنان کو کال کرتا اور اس سے پوچھتا کہ کیا جو اس نے کہا ہے وہ سچ ہے۔ عدنان اس کی کیفیت جانتا تھا لہٰذا ہر بار تحمل سے یقین دلانے کی کوشش کرتا۔ تین دن بعد جب وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترا تو اس کے قدموں میں واضح لغزش تھی۔

عدنان کا ڈرائیور اسے لینے آیا ہوا تھا۔ عدنان سے اس کی ملاقات رات کو ہوئی تھی اور رات تک کا وقت اس نے بے صبری سے گزارا تھا۔ عدنان اس سے اس کی خیریت پوچھ رہا تھا وہ اس سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے اس کے بیٹے کو کہاں دیکھا۔ کیسے پہچانا؟ یہ سارے سوال وہ اس سے فون پر بھی کئی بار پوچھ چکا تھا اور اب روبرو بیٹھ کر پوچھ رہا تھا۔ عدنان آرام و تسلی سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح نو بجے ہی وہ پنڈی کے لیے نکلے تھے عدنان نے تمام معلومات لے رکھی تھیں جس کی بنا پر وہ بنا کسی وقت کے مطلوبہ جگہ تک پہنچ چکے تھے۔ اسکول کے پرنسپل نے خوشدلی سے ان کا استقبال کیا تھا۔ اور آنے کی وجہ پوچھی تھی۔

"آئم سوری لیکن اسکول ٹائمنگ کے دوران ہم آپ کو کسی بچے سے ملنے کی پرمیشن نہیں دے سکتے البتہ چھٹی کے بعد آپ عمر سے مل سکتے ہیں۔" پرنسپل کی بات پر وہ سر ہلا کر بیٹھ گئے تھے چھٹی میں دو گھنٹے باقی تھے اور دو گھنٹے انہیں انتظار کرنا تھا۔ عدنان پرنسپل کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے بیٹے نے اسے ماننے سے انکار کر دیا؟ وہ نہیں جانتا تھا اس کی ماں نے اسے اس کے باپ کے متعلق کیا بتا رکھا ہے ہو سکتا ہے اس نے بتایا ہو کہ اس کا باپ مر چکا ہے؟ اور اگر اس نے اسے تمام سچ بتا رکھا ہوا تو نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی وہ اسے جانتا ہے کم از کم اتنا تو وہ اسے جانتا ہی ہے۔

وہ سوچتا رہا۔ الجھتا رہا۔ وہ خود سوال کر رہا تھا وہ خود جواب دے رہا تھا۔ دو گھنٹے وہ یہی کرتا رہا تھا۔ اس نے پرنسپل صاحب کی منگوائی چائے نہیں پی۔ اس نے ان کی گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ چھٹی ہوئی تو پرنسپل نے چپڑاسی کو عمر ابراہیم کو آفس میں لانے کے لیے بھیجا تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ چپڑاسی کے ساتھ آفس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ پرنسپل صاحب کے کم ان کہنے کے بعد وہ اندر آگیا تھا۔ اس نے نظریں نہیں اٹھائیں اس کے اندر اپنے پندرہ سال بعد ملنے والے بیٹے کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا اس کے اندر اپنے پندرہ سالہ بیٹے کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ عدنان اب عمر سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس نے تمام تر ہمت جمع کر کے نظر اٹھائی تھی اس لمحے عمر نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔"

"ابو" اس کے منہ سے بے ساختہ طور پر نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے بیٹے سے ملنے تک خوفزدہ تھا اسے لگتا تھا وہ

اسے قبول نہیں کرے گا۔ اسے گمان تھا شاید عشاء نے اسے اس کے باپ کے حوالے سے متنفر کر رکھا ہو۔ اس کا گمان غلط تھا۔ یہ عمر کے رویے نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ جتنی خوشدلی سے باپ سے ملا تھا اس بات نے اسے شانت کر دیا تھا۔

اور ایک بار پھر اس عورت کا مقروض ہو گیا۔ اس عورت نے اس کا بھرم رکھا تھا اس عورت نے ہمیشہ اس کا بھرم رکھا تھا۔ اس عورت نے کسی کے سامنے بھی اس کا بھرم نہیں توڑا تھا۔ نہ اپنے ماں باپ کے سامنے نہ اپنی اولاد کے سامنے۔ وہ آج بھی اس سے محبت کرتی ہے یہ اسے اب پتا چلا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس عورت کی محبت پر فخر محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

دسمبر کی چمکیلی سی دھوپ میں چارپائی ڈالے وہ دونوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ مٹر چھیل رہی تھی اور ساتھ ساتھ رشیدہ کی باتوں کے جواب بھی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سکون بھری کیفیت تھی اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ مٹر چھیل کر اس نے پیاز وغیرہ کاٹی پھر ہانڈی چڑھانے چل دی تھی۔ شام کو ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کی وجہ سے وہ زیادہ تر کام دن کو ہی نمٹالیتی تھی۔ ہانڈی بنا کر اس نے آٹا گوندھا روٹی بنائی پھر دھوپ میں بیٹھ کر ان دونوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر اس نے برتن صاف دھو کر رکھے تھے اور پھر ظہر کی نماز ادا کرنے چل دی تھی۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے بنائی اور پھر ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

بچوں کے جانے کے بعد وہ عصر کی نماز پڑھ رہی تھی جب فواد نے دروازے پر دستک دی تھی۔ وہ دعا مختصر کر کے اٹھ گئی تھی۔

"آنٹی عمر ابھی تک واپس نہیں آیا؟" فواد نے ذرا سا اندر جھانکتے پوچھا تھا۔ ذرا سا مسکرا کر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ مایوس سا پلٹ گیا تھا۔

"کون تھا؟" وہ واپس پلٹی تھی جب رشیدہ نے پوچھا تھا۔

"فواد تھا عمر کا پوچھنے آیا تھا۔" اس نے سکون بھرے لہجے میں جواب دے کر اپنے قدم کچن کی طرف بڑھا دیے تھے۔ رشیدہ اس کی پشت کو دیکھ کر گہری سانس بھرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

عمر کو اپنے باپ کے پاس گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اس ایک ہفتے میں رشیدہ نے اس کے انداز میں کوئی غیر معمولی پن نہیں دیکھا تھا۔ اس کی روٹین سابقہ تھی اور کسی بھی بے چینی اور پریشانی کا اس کے چہرے سے شائبہ تک نہیں پڑتا تھا۔ رشیدہ اس کی عمر کے لیے محبت سے بھی واقف تھیں اور اس کے اتنے سکون بھرے انداز پر وہ دل ہی دل میں حیران بھی تھیں۔ خدیجہ نے بھی اسے کال کی تھی۔ "تمہیں عمر کو روکنا چاہیے تھا۔ اسے سچ بتانا چاہیے تھا۔ تم نے اسے یوں کیوں جانے دیا۔" خدیجہ نے خفگی بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ سکون سے سنتی رہی۔

"انسانوں کو ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوتا ہے خدیجہ انہیں روکا نہیں جا سکتا۔" اس نے سکون بھرے لہجے میں کہا تھا۔ پاس بیٹھی رشیدہ اور فون کے دوسری طرف موجود خدیجہ دونوں کو حیرت ہوئی تھی۔

"آپ سولہ سال تک بنجر زمین کو نرم کرتے رہیں ہل چلائیں بیج بوئیں۔ پانی لگائیں اور جب فصل تیار ہو جائے تو کوئی شخص آکے آپ کے کھیت کو آگ لگا جائے تو اسے کیا کہتے ہیں؟" وہ ایک پل کو چپ ہوئی تھی خدیجہ خاموشی سے سن رہی تھی۔

"پہلے مجھے لگتا تھا اسے بدنصیبی کہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اسے بدنصیبی نہیں اسے آزمائش کہتے ہیں۔" اس نے رشیدہ کی طرف دیکھتے کہا تھا۔ رشیدہ نے سر اثبات میں ہلایا۔

"اور آزمائش کے وقت ہی پتا چلتا ہے آپ کتنے پانی میں ہیں۔ ہر انسان کی آزمائش مختلف ہو سکتی ہے پر ہر انسان کی آزمائش کڑی ہوتی ہے۔ آزمائش مختلف

ہو سکتی ہے مگر اس میں سے گزرنے کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے۔" وہ بہت نرمی سے بول رہی تھی اور اس کے چہرے پر سکون بھری کیفیت تھی۔

"آزمائش ہر ایک پر آتی ہے۔ کبھی بار بار آتی ہے کبھی ایک ہی بار آتی ہے مگر آتی ضرور ہے۔ مجھ پر بھی آئی تھی۔ سولہ سال پہلے بھی مجھے آزمایا گیا تھا۔" اس نے یاد دلاتے لہجے میں کہا تھا۔ اب کی بار اس کی آواز تھوڑی پست تھی اور لہجے میں شرمندگی گھل گئی تھی۔

"تب میں نے کیا کیا تھا؟ تب میں صبر نہیں رکھ پائی تھی۔ تب میں بے صبری بن گئی تھی۔ کل مجھے پتا نہیں تھا کہ آزمائش آنے پر صبر کیا جاتا ہے۔ آزمائش میں بے صبرے نہیں بنتے۔ سولہ سال پہلے آزمائش آنے پر میں نے جو کیا تھا اگلی سولہ صدیوں تک مجھے اس پر نادم رہنا ہے۔ کل میں محبت کے ذریعے آزمائی گئی تھی اور میں آزمائش میں کھری نہیں اتر پائی تھی۔ آج آزمائش اولاد کے روپ میں سامنے کھڑی ہے میں پہلی آزمائش میں فیل ہو گئی تھی مجھے دوسری آزمائش میں فیل نہیں ہونا مجھے صبر کرنا ہے خدیجہ۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی تھی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ دوسری طرف موجود خدیجہ اور ساتھ بیٹھی رشیدہ بھی بے آواز رو رہی تھیں۔

"تمہیں پتا ہے خدیجہ۔ مجھے ہمیشہ لگتا تھا اسے میرے سجدوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اب پتا چلا ہے سجدوں کی ضرورت ہمیشہ وہاں نہیں یہاں رہتی ہے۔ میں نے اب جانا ہے خدیجہ کہ انسانوں کی خطاؤں پر اللہ سے ناراض نہیں ہوتے 'انسانوں کے پیچھے اللہ کو نہیں چھوڑتے۔ میں نے ہمیشہ یہ کیا تھا۔ میں ہمیشہ اللہ کو چھوڑ کر انسانوں کے پیچھے بھاگتی رہتی تھی۔ سولہ سال پہلے میں نے یہی کیا تھا۔ میں نے اللہ اور انسان میں سے انسان کو چنا تھا۔ میں انسان کے پیچھے گئی تھی۔ میں نے اللہ کو چھوڑ دیا تھا۔ میں غلط تھی اور مجھے اپنی اس غلطی کو اب نہیں دہرانا تھا۔ مجھے "انسانوں" کے پیچھے "اللہ" کو نہیں چھوڑنا ہے۔"

☼ ☼ ☼

اس نے کلائی موڑتے وقت دیکھا چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے یعنی عمر کے آنے میں مزید دس منٹ تھے۔ وہ گہری سانس لے کر بنچ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند چکا تھا۔ پچھلے ہفتے جب وہ عمر سے ملا تھا۔ وہ فوراً" اس کے ساتھ عشاء کے پاس جانا چاہتا تھا۔ مگر عمر نے اس سے کچھ دن انتظار کرنے کو کہا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ پہلے اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتائے گا پھر اسے ساتھ لے کر جائے گا اس کا خیال تھا اگر وہ یوں ایک دم سے اسے ساتھ لے کر گیا تو اس کی ماں کو شاک لگے گا اور شاید اسے اچھا نہ لگے۔ اسے اچھا لگا عمر کا اپنی ماں کے احساسات کے متعلق یوں حساس ہونا۔

حمدان نے بھی عمر کی تائید کی تھی تب اسے مجبوراً" سر ہلانا پڑا تھا۔ البتہ عمر نے اسے اپنے تمام دوستوں اور کلاس فیلوز سے ملوایا تھا۔ اسے اپنے باپ کی حیثیت سے ان سب سے ملواتے عمر کے لہجے میں جو فخر اور جوش تھا اس نے اس کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔ عمر کئی بار باتیں کرتے ہوئے باپ کے حوالے سے اپنی کسی محرومی کا اظہار کرتا تو اس کی آنکھیں ندامت سے جھک جاتیں۔ اسے اپنا آپ عمر کا مجرم لگتا۔ اور اس کی ندامت بڑھنے لگتی۔ عمر ہر روز سہ پہر کے وقت اس سے ملنے اس پارک میں آتا تھا۔ وہ ہر روز اسلام آباد سے پنڈی عمر سے ملنے آتا تھا۔ وہ عمر کے آنے سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے آجاتا تھا۔ پارک کے پتھریلے بنچ پر بیٹھ کر عمر کا انتظار کرنا اسے دنیا کا سب سے اچھا کام لگتا تھا۔ جو خوشی اسے یہاں اپنے بیٹے کا انتظار کر کے محسوس ہوتی تھی وہ خوشی اسے کسی اور کام کرنے میں محسوس نہ ہوتی۔ وہ عمر سے ملنے سے پہلے عمر کے متعلق سوچتا رہتا اور یہاں سے جانے کے بعد وہ دل ہی دل میں اس کی باتیں دہراتا رہتا۔

عمر نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہت جلد اپنی ماں سے اپنے باپ کے حوالے سے بات کرے گا اور اسے شدت سے اس پل کا انتظار تھا۔ وہ اب بھی آنکھیں موندے عمر کی کہی باتیں دہرا رہا تھا جب اس نے

قریب ہی سے آہٹ کی آواز سنی تھی۔ وہ فوراً" سیدھا ہوا اور چونک گیا اس کے سامنے چھوٹا سا سفری بیگ تھامے عمر کھڑا تھا۔

"عمر" اس نے حیرت بھرے انداز میں اس کا نام لیا تھا "یہ کیا ہے؟" جواباً" عمر نے جو کچھ کہا تھا اس نے اسے اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے آج کام بہت جلدی ختم کر لیا تھا اور اب نائنتھ کلاس کی انگلش کی کتاب اور نوٹ بک لیے وہ رشیدہ کے ساتھ والی چارپائی پر بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ اس کے پاس نائنتھ کلاس کے جو بچے ٹیوشن کے لیے آتے تھے ان کے ایگزامز ہونے والے تھے اور وہ ان پر آج کل زیادہ محنت کر رہی تھی۔

رشیدہ کے پاس ساتھ والے گھر سے صغریٰ خالہ آئی ہوئی تھیں۔ وہ رشیدہ کی طبیعت وغیرہ کا پوچھنے آئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں باتوں میں مشغول تھیں وہ بھی نوٹ بک پر لگانے کے بجائے نظر ہٹا کر ان کی باتوں میں حصہ ڈال دیتی تھی۔ کام مکمل کر کے اس نے صغریٰ خالہ کے لیے چائے بنائی تھی انہیں دے کر وہ رشیدہ کے لیے دال چاول بنانے لگی تھی۔ جب تک اس نے دال چاول بنائے صغریٰ خالہ جا چکی تھیں۔ وہ پلیٹ میں دال چاول ڈال کر رشیدہ کے لیے لائی تھی اس نے پلیٹ ان کے سامنے رکھی تھی دروازے پر کھٹکا ہوا تھا وہ چونک کر مڑی تھی اور پتھر ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے وہ دو مرد کھڑے تھے جن سے اس نے اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی اور جنہوں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے سامنے داور ابراہیم اور عمر ابراہیم کھڑے تھے۔

اس نے عمر کے ہاتھ میں موجود بیگ کو دیکھ کر اچھی خاصی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"یہ کیا ہے عمر؟" اس کے سوال پر عمر مسکرا دیا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں اب۔" وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا تھا۔

"مگر کیوں اور تم اپنی ماں کو اس طرح چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟" اسے عمر کی حرکت اچھی نہیں لگی تھی یہ اس کی آواز و انداز سے ظاہر تھا۔

"یہ ضروری ہے ابو۔" عمر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"انہیں آپ کی زندگی میں واپس لانے کے لیے یہ ضروری ہے۔" عمر نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی تھی وہ جواباً" خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ کچن میں کھڑی تھی۔ اس کا رخ دیوار کی سمت تھا۔ داور اور عمر باہر رشیدہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس نے ان دونوں سے کوئی بات نہیں کی تھی وہ جس وقت سے آئے تھے وہ کچن میں ہی موجود تھی وہ باہر نہیں نکلی تھی۔

"امی۔" عمر نے پیچھے سے اسے پکارا تھا۔ وہ چونکی مگر پلٹی نہیں۔ پلٹنا آسان کہاں تھا؟

"امی۔" عمر نے اس کے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف گھمایا تھا۔ اس کا چہرہ عمر کے سامنے تھا۔ وہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے عمر کو اندازہ تھا۔ عمر نے ذرا سی ایڑیاں اٹھا کر اس کی پیشانی پر بوسہ لیا تھا پھر ہاتھ پکڑ کر اسے موڑھے پر بٹھا دیا تھا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس کے دونوں ہاتھ ہاتھ میں تھام کر اس نے پوچھا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کو مجھ سے ناراض ہونا چاہیے امی میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔" عمر نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں عمر۔" اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کے کہا تھا۔

"میں جانتا ہوں امی آپ مجھ سے ناراض ہیں اور آپ کو ہونا بھی چاہیے۔ میں نے آپ کا دل دکھایا۔ میں نے آپ کا اعتماد توڑا۔" عمر نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھامتے اپنی بات دہرائی تھی۔

"میں واقعی تم سے ناراض نہیں ہوں عمر۔ یہ وہ

چیزیں ہیں جو میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ کی تھیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں ایک نہ ایک دن میرے سامنے آنا تھا۔" اس نے سکون بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"ایسا مت کہیں امی۔" عمر نے تڑپ کر کہا تھا۔

"مجھے جب پہلی بار ابو ملے تو مجھے لگا کہ مجھے میرا ادھورا حصہ مل گیا ہے۔ میرا باپ مجھے پندرہ سال بعد ملا تھا اور مجھے لگا مجھے میری پہچان میرا حوالہ مل گیا۔ رشیدہ نانو کہتی ہیں باپ کا حوالہ اولاد کا فخر ہوتا ہے وہ صحیح کہتی ہیں۔ اس دن مجھے لگا کہ اب میں سر اٹھا کر دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چل سکتا ہوں۔ مجھے اب باپ کے متعلق سوالوں پر شرمندہ نہیں ہونا کیوں کہ میرے پاس ان سوالوں کے جواب آگئے تھے اور جس دن میں نے انہیں ___ اپنے کلاس فیلوز اور دوستوں سے ملایا تو تعارف کرواتے وقت میرے جو احساسات تھے میں انہیں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا امی۔ میں خوش تھا مطمئن تھا۔ مجھے میرا کھویا ہوا باپ مل گیا تھا میری ادھوری ذات مکمل ہو گئی تھی۔ ابو چاہتے تھے میں انہیں آپ کے پاس لے آؤں وہ آپ سے معافی مانگنا چاہتے تھے مگر مجھے لگا اگر میں اچانک انہیں آپ کے پاس لے آیا تو آپ کو شاک لگے گا۔ شاید آپ اس چیز کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کر پائیں گی' میں پہلے آپ کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا' مگر مجھے آپ کو اچانک بتانا پڑا تھا اور آپ کا ردعمل اتنا شدید تھا' میں دنگ رہ گیا تھا۔ امی میں تو آپ کو اور ابو کو پھر سے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا' مگر آپ کا غصہ اور شدید ترین ردعمل ___ مجھے لگا اگر میں کچھ دنوں کے لیے آپ کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تو شاید نہیں یقیناً" آپ کا دل نرم ___ جائے گا۔ لیکن میں ابھی اس خطا کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ امی پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

عمر روتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس نے نرمی سے عمر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"تم نے ایسا کچھ نہیں کیا عمر جس کے لیے تمہیں معافی مانگنی پڑے میں تم سے ناراض نہیں ہوں مگر جو کچھ تم چاہتے ہو وہ کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں رہا۔" اس کے الفاظ نے عمر کو ششدر کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے بیٹے کے ساتھ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے چہرے پر پھیلی مایوسی اسے دکھ اور اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ عشاء عذیر نے انہیں مایوس لوٹا دیا تھا عشاء عذیر کو اس کے ساتھ یہی کرنا چاہیے تھا وہ کیوں بھول گیا تھا کہ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے معاف کیا جاتا اسے معافی دی جاتی وہ اس چیز کا مستحق نہیں تھا کہ اسے معافی دی جائے اور جس چیز کا وہ مستحق نہیں تھا وہ چیز اسے کیونکر دی جاتی۔ معافی دینا تو الگ وہ اس کے سامنے ہی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے دکھ نہیں ہوا اسے تکلیف نہیں ہوئی یہ چیز اسے تب ہوتی اگر اسے علم ہوتا اس نے اس عورت کے ساتھ کیا کیا ہوا ہے؟

وہ سر جھکائے سوچوں میں گم تھا جب اس نے عمر کی پکار سنی وہ کچن کے دروازے پر کھڑا تھا اور اسے کچھ کہہ رہا تھا کیا؟ اس نے سمجھنے کی کوشش کی اسے سمجھ نہیں آیا۔ اس کے بائیں پہلو میں اچانک ___ درد کی شدید لہر اٹھی تھی اور وہ ایسا درد تھا جو ناقابل برداشت تھا۔ اس کا پورا وجود لمحوں میں پسینہ پسینہ ہوا تھا چکراتے سر اور بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ وہ زمین پر گرا تھا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

اس نے اپنے سامنے موجود شخص کو اتنی ہی حیرت سے دیکھا جتنی وہ اس سے توقع کر رہے تھے وہ ذرا سا مسکرائے اور آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا پھر اس کی خیریت دریافت کی تھی اس کا سر میکانکی انداز میں اوپر نیچے ہلا تھا وہ اس کے سامنے والی چارپائی بیٹھے تھے اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"میں آپ کو لینے آیا ہوں اور مجھے امید ہے آپ انکار نہیں کریں گی۔" کچھ دیر بعد انہوں نے کہا تھا وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"وہ بیمار بھی ہے شرمندہ اور نادم بھی۔ اس نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ غلط تھا انتہائی غلط تھا مگر اپنی اس غلطی کی سزا اس نے کئی سال کاٹی ہے۔ وہ کل کیا تھا میں نہیں جانتا' وہ آج کیا ہے یہ مجھے معلوم ہے اور میں اس کے بارے میں ہر طرح کی گواہی دینے کے لیے تیار ہوں۔ زندگی میں ہر ایک کو دوسرا موقع نہیں ملتا مگر میں چاہتا ہوں آپ اسے دوسرا موقع دیں۔" وہ حیرت سے بت بنی انہیں سن رہی تھی۔

"آپ میرے ساتھ چلیں عشاء کیونکہ اسے اس وقت صرف آپ ہی کی ضرورت ہے۔" وہ جواباً کچھ بھی نہیں کہہ پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈاکٹر عبدالباسط کے ساتھ جس وقت اسپتال میں داخل ہوئی وہاں عدنان' اظہر' مزمل حسین اور عمر تینوں ہی موجود تھے۔ تینوں کی نظریں یک بیک اس پر اٹھی تھیں اور پھر عمر لپک کر اس تک آیا تھا۔

"امی۔ امی۔" کہتے وہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

"امی میرے ابو۔" وہ روتے ہوئے بے ربط سا ہوا جا رہا تھا۔

"حوصلہ رکھو عمر۔" اس نے عمر کو ساتھ لپٹا کر حوصلہ دینے کی کوشش کی تھی۔

عمر نے اس کی گود میں سر رکھا ہوا تھا اور وہ اب بھی رو رہا تھا۔ اس کی نظریں آئی سی یو کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور ہاتھ تسلی دینے انداز میں عمر کے سر پر پھیر رہے تھے۔

"ابھی تو میں نے ان سے ساری باتیں بھی نہیں کیں امی۔ ابھی تو میں نے ان سے جی بھر کے لاڈ بھی نہیں اٹھوائے۔ ابھی تو میں نے انہیں آپ سے نہیں ملوایا' میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں آپ سے ملواؤں گا۔ امی ابھی تو۔" اس کی روتے ہوئے ہچکی بندھ گئی تھی۔

"تمہارے ابو ٹھیک ہو جائیں گے عمر۔" اس نے بدقت تمام کہا تھا۔

"آپ دعا کریں نا ای وہ ٹھیک ہو جائیں۔"

"میں دعا کروں گی عمر۔" اس نے عمر سے کہا تھا اور پھر مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ خدا سے اس شخص کی زندگی کی دعا مانگ رہی تھی جو اس کا شوہر تھا جو اس کے بیٹے کا باپ تھا اور جس کے متعلق اس کا خیال تھا وہ کبھی کسی صورت اس شخص کی طرف نہیں پلٹے گی۔ وہ اس شخص کے لیے رو رہی تھی جس کے متعلق اس کا خیال تھا وہ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

پورے تین دنوں بعد اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اسے ہوش آیا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ خوشخبری فوراً" پریشان اور باہر منتظر بیٹھے لوگوں کو سنائی تھی۔ سب ہی کے منہ سے بے ساختہ کلمہ شکر نکلا تھا۔ وہ سب ہی فوراً" اندر کی جانب لپکے تھے ایک وہی تھی جو اپنی جگہ بیٹھی رہی تھی۔ وہ اندر نہیں جا پا رہی تھی۔ اس کے احساسات ——— ناقابل فہم سے ہو رہے تھے اور اندر عمر نے اپنے باپ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"وہ آگئی ہیں ابو۔" اس کی نیم وا آنکھوں میں فقط ایک لمحے کو چمک آئی تھی پھر اس کے زرد چہرے پر بے یقینی پھیلی تھی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں ابو۔ میں انہیں لے کر آتا ہوں۔" عمر یہ کہتے ہوئے باہر نکلا تھا اس کی منتظر نگاہیں دروازے پر جم گئی تھیں۔

عمر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لایا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی کتنے سالوں بعد وہ اسے روبرو دیکھ رہا تھا اور اسے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سولہ سال بعد وہ اسے روبرو دیکھ رہا تھا اسے لگا اس کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی ہو۔ وہ مسکرایا اور اس نے ڈاکٹرز کی دی ہوئی ہدایات سے قطع نظر اٹھنے کی کوشش کی وہ پورا زور لگا کر اٹھ رہا تھا جب عمر نے آگے بڑھ کر اسے روکا تھا۔

"ابو آپ کو ڈاکٹرز نے زیادہ حرکت کرنے سے منع کیا ہے۔" تب وہ آگے بڑھی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔" بنا اس کی طرف دیکھے اس نے پوچھا تھا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مگر اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس سے مخاطب تھی شکر ادا کرنے کو یہی بات کافی تھی۔ سولہ سال بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پر رشک آیا۔ کہ وہ اسے سن رہا ہے اسے اپنی بصارتوں پر رشک آیا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن وہ اسپتال میں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا اور دو دن وہ عمر کی وجہ سے وہاں رہی تھی۔ ان دو دنوں میں وہ بہت کم اس کے سامنے آئی تھی اور اس سے مخاطب تو ایک بار بھی نہیں ہوئی مگر اس کے لیے غنیمت تھا وہ اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹرز نے اسے صرف ہلکی پھلکی غذا لینے کی ہدایت کی تھی۔ عدنان گھر سے اس کے لیے یخنی بنوا کر لایا تھا۔

"بھابھی آپ خود پلائیں۔" عدنان نے ڈاکٹرز کی ہدایات کے پیش نظر کہا تھا وہ اندر سے جزبز ہوئی مگر اسے انکار نہیں کر پائی تھی۔ وہ سر ہلا کر اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور بستر پر اس کے قریب جگہ بنا کر بیٹھی تھی۔ وہ بنا اس کی طرف دیکھتے اسے یخنی پلا رہی تھی یہ کام وہ کتنی مجبوری میں کر رہی ہے یہ اس کے چہرے سے ہی صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے یخنی پلانے کے بعد وہ اٹھنے لگی تھی جب ڈاکٹر صاحب اور ان کی فیملی اس کی عیادت کو چلی آئی تھی۔ کمرہ چھوٹا ہونے کے باعث اسے مجبوراً" وہیں بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

وہ ڈاکٹر صاحب کی بہو اور بیوی وغیرہ کے ساتھ ہلکی پھلکی باتوں میں مصروف تھی جب اس نے اپنے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا تھا۔ اسے شدید جھٹکا لگا تھا اس نے فوراً" اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا جو یاد آیا تھا کون سا کون سا زخم نہیں تھا جو رسنے نہیں لگا تھا۔ سولہ سال پہلے کی ساری اذیت وہ ایک بار پھر سے محسوس کر رہی تھی۔

اس نے فوراً" ہاتھ کھینچا تھا مگر دوسری طرف سے التجا آمیز دباؤ بڑھا تھا۔

"تمہارا لمس مجھے جو سکون دے رہا ہے وہ سکون مجھے دنیا کی کوئی دوسری شے نہیں دے سکتی۔ مجھ سے یہ سکون مت چھینو۔" دوسری طرف سے اتنے التجائیہ انداز میں یہ سرگوشی ہوئی تھی کہ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔

"مجھے محسوس کرنے دو کہ تم ہو اور میرے پاس ہو۔" اس نے آنکھیں موندتے کہا تھا۔ وہ سن سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن میں اسے اسپتال سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ واپس جانا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر صاحب کے سمجھانے اور عمر کی التجاؤں اور اصرار پر اسے ان کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ عمر اس کے آنے پر بے انتہا خوش تھا اور اس کی خوشی اس کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ رشیدہ بھی داور کی عیادت کو آئی تھیں اور عشاء نے انہیں زبردستی اپنے پاس روک لیا تھا۔

وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اس کا منتظر تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ وہ آئے اور وہ اپنا دل کھول کے اس کے سامنے رکھ دے۔ وہ اپنے سارے گناہوں کا غلطیوں کا اعتراف کرے اور اس سے التجا کرے کہ وہ اسے معاف کر دے۔ اسے "یقین" تھا وہ اس سے معافی مانگے گا اسے "امید" تھی وہ اسے معاف کر دے گی اور پھر اسے اس کے سامنے ایک اور اعتراف بھی کرنا تھا وہ اعتراف اس کی محبت کا ہوتا۔

اس نے دعا مانگ کر ہاتھ چہرے پر پھیرے اسے حیرت ہوئی اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے اس نے مصلیٰ تہ کیا اور اٹھ گئی اور اب اسے وہاں جانا تھا جہاں وہ اس کا منتظر تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کہے گا اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا تھا اسے داور ابراہیم کو دوسرا موقع دینا چاہیے۔ وہ اسے دوسرا موقع دینے کو تیار ہو گئی تھی۔ اسے "امید" تھی وہ اپنی غلطیوں کی معافی مانگے گا اسے "یقین" تھا وہ اسے معاف کر دے گی۔

اور اگلی صبح وہ دونوں جب ایک ساتھ نیچے آئے تھے تو عمر نے دیکھا ان دونوں کے چہرے مطمئن تھے ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور سکون بھری کیفیت ان کے دل میں موجود خوشی و انبساط کو ظاہر کر رہی تھی۔ وہ دونوں وہ لوگ تھے جنہوں نے کڑی آزمائش جھیلی تھیں۔ وہ دونوں وہ تھے جنہوں نے زندگی میں بہت ساری غلطیاں کی تھیں۔ وہ دونوں وہ تھے جنہوں نے اپنی غلطیوں سے سیکھا تھا۔ وہ دونوں وہ تھے جنہوں نے اپنی عقل کے زور پر صراط مستقیم کو پایا تھا۔ وہ دونوں وہ تھے جو اللہ سے محبت کرتے تھے۔ وہ دونوں وہ تھے جن سے اللہ محبت کرتا تھا۔ جب ہی تو کڑے امتحان کے بعد انہوں نے انعام بھی پایا تھا۔

وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ وہ ایک ساتھ تھے اور خوش تھے۔

☼ ☼

فرحی نعیم

راہیں کُھلتی ہیں

"امی' ساجدہ آپا کا فون ہے۔" چھوٹی بہو نے ساس سے مخاطب ہو کر کہا اور امی جو چائے پی رہی تھیں جلدی سے پیالی میز پر رکھ کر لپک کر فون تک آگئی تھیں۔ انہوں نے ریسیور کان سے لگا کر بے تابی سے ساجدہ سے ہیلو کہا تھا۔

"ہاں وعلیکم السلام' کیسی ہو ساجدہ۔" جواب میں ساجدہ نے سب خیریت کی اطلاع دی اور پھر ان کی خیریت دریافت کی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ' کیا بنا ساجدہ؟ کیا جواب دیا ان لوگوں نے۔" امی کے لہجے میں بے چینی واضح تھی۔

"وہ آپا بس کیا بتاؤں' آپ لوگ تو انہیں بہت پسند آئے' لیکن سائمہ۔" وہ چند لمحے رکیں۔

"اصل میں آپا وہ کہہ رہی تھیں کہ ان کے بیٹے کی عمر ستائیس' اٹھائیس ہے تو سائرہ اس کے آگے تو کچھ بڑی ہے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ آپا' سائرہ کی بڑی تعریف۔" ساجدہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں' لیکن امی تو بس انکار کا لفظ سنتے ہی گم سم ہو گئی تھیں۔

ساجدہ اپنی بات مکمل کر کے اور بھی کچھ باتیں کر رہی تھیں' لیکن اب امی سے کچھ بھی نہ کہا جا رہا تھا اور نہ سنا لہٰذا انہوں نے بات مختصر کر کے اللہ حافظ کر کے فون بند کر دیا۔ وہ خاموشی سے وہیں بیٹھی رہیں۔

"امی چائے تو پی لیں۔" چھوٹی بہو طاہرہ نے ٹھنڈی ہوتی چائے کی طرف۔۔۔ توجہ دلائی۔

"ہاں! انہیں بس رہنے دو دل نہیں چاہ رہا۔"

"یہ تو ٹھنڈی بھی ہو گئی میں تازہ بنا کر لاتی ہوں۔" طاہرہ نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا رہنے دو بس پی لی۔"

"مگر آپ نے تو ابھی آدھی بھی نہیں پی تھی۔"

"ہاں بس اب دل نہیں چاہ رہا۔" اور طاہرہ خوب جانتی تھی کہ امی کا دل کیوں نہیں چاہ رہا' پچھلے چند ماہ سے وہ دیکھتی آ رہی تھی اس کی بڑی نند سائرہ کو اس دوران کتنے ہی لوگ دیکھنے آئے تھے' لیکن ہر دفعہ ہی کوئی نہ کوئی خامی نکل کر وہ لوگ پلٹتے نہیں تھے اور جو لوگ رشتہ دیتے تو امی ابو اور سائرہ کے بھائیوں کو مناسب نہیں لگتے اور یہ بات تھی بھی درست' اکثر ایسے رشتے ہوتے جس میں "لڑکا" سائرہ سے دگنی عمر کا ہوتا یا پھر کئی بچوں کا باپ یا پھر مالی لحاظ سے اتنے کمزور ہوتے کہ امی تو دل پر ہاتھ رکھ لیتیں۔

"ارے مجھے اپنی بیٹی اب اتنی بھی بھاری نہیں کہ میں اسے اندھے کنویں میں دھکا دے دوں۔" ایک دفعہ امی نے ایسے ہی بے جوڑ رشتے پر بیٹوں سے کہا تھا۔

"امی رات کے کھانے میں چاول بنالوں۔" سائرہ امی سے پوچھ رہی تھی اور امی جو نہ جانے کن سوچوں میں گم تھیں۔ اس کے کہنے پر بجائے اس کی بات کا جواب دینے کے بغور اسے دیکھنے لگیں۔

"امی کیا سوچ رہی ہیں' میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ رات کے لیے چاول بنالوں؟" سائرہ نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں بیٹا بنالو۔" امی نے نرمی سے کہا اور سائرہ یہ سن کر واپس پلٹ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

صفیہ بیگم کی چار اولادیں تھیں سب سے بڑا بیٹا تھا جس کی شادی کو چھ سال کا عرصہ ہو چکا تھا پھر سائرہ تھی جس کی شادی کے لیے وہ کافی عرصہ سے۔۔۔ تگ و دو میں تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر تا جا رہا تھا ویسے ویسے ان کی کوششوں میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ ہر آئے گئے سے وہ سائرہ کی شادی کا تذکرہ کرنا نہ بھولتیں۔ سائرہ کی رنگت اگرچہ صاف تھی' لیکن نین نقش بس واجبی سے تھے جس کی وجہ سے آنے والے چپ سادھ لیتے۔ پھر سائرہ سے دو سال چھوٹا کامران اور اس سے تین سال چھوٹی سمعیہ تھی۔ سمعیہ نے ابھی صرف میٹرک ہی کیا تھا کہ اس کے لیے لوگ آنے لگے تھے۔ امی تو یہ سب دیکھ کر گھبرا ہی گئیں۔ کہاں سائرہ' جس کو بی اے کیے بھی سال سے اوپر ہو گیا

تھا اور کہاں سمعیہ۔ جس نے ابھی صرف میٹرک کا امتحان ہی دیا تھا اور پھر لوگ سمعیہ کو بھی دیکھنے آنے لگے۔ امی مسکرا کر ان سے معذرت کرتیں۔

"ابھی تو سمعیہ بہت چھوٹی ہے۔ اس کی بڑی بہن بھی ہے۔ پہلے میں اپنی بڑی بیٹی کی کروں گی پھر سمعیہ کا سوچوں گی۔" لیکن ایسا کب تک ہوتا۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ سائرہ کے لیے آنے والے لوگ جب سمعیہ کو دیکھتے تو انہیں وہ گوری چٹی' تیکھے نین نقش والی نازک سی سمعیہ ہی پسند آتی اور وہ اسی کا رشتہ دے جاتے۔ وہ سختی سے سمعیہ کو مہمانوں کے سامنے آنے سے منع کر دیتیں۔ دوسری طرف سمعیہ بھی یہ سب سن کر روہانسی ہو جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپی سے پہلے اس کی بات طے ہو۔ لیکن شاید خدا کو یہی منظور تھا۔

اس دن اتوار تھا اور پھپھو آئی ہوئی تھیں۔ شام کی چائے پر سب ہی موجود تھے ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ پھپھو اکثر ہی اتوار کو آجاتی تھیں۔ ساتھ میں کبھی فیملی بھی ہوتی اور کبھی اکیلے ہی آجاتیں۔ چائے سے فارغ ہو کر جب لڑکیاں برتن سمیٹنے لگیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں تو پھپھو نے امی کو مخاطب کیا۔

"بھابھی جان آج میرے آنے کا مقصد ایک اور بھی تھا۔"

"ہاں ہاں بولو شاہدہ۔" امی نے ان کو دیکھا۔

"میرے جاننے والی ایک فیملی ہے وہ آپ کے ہاں آنا چاہ رہے ہیں' اچھے لوگ ہیں' کماتے بیٹے' اپنے بیٹے کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے میں نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ ایک دو دن میں آئیں گے۔"

"سائرہ کا ذکر کیا تھا نا۔" امی جلدی سے بولیں۔

"بھابھی جان دراصل۔" وہ گڑبڑائیں۔ "میں نے تو ان سے سمعیہ کا ہی تذکرہ کیا ہے ویسے آپ سائرہ کو بھی دکھا دیجیے گا' کوئی حرج تو نہیں ہے کیا پتا قسمت ہو تو اس کا ہی ہو جائے۔" شاہدہ نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا اور امی خاموش ہو گئیں' کیا کہتیں۔

"لوگ کیسے ہیں؟" ابو پوچھ رہے تھے۔

"لوگ تو بھائی جان بہت اچھے ہیں' شریف اور دیندار اس سے آپ بے فکر رہیں بس اجازت دیں تو میں۔"

"اچھے لوگ ہیں تو پھر کیا مضائقہ ہے۔" امی دبی آواز میں بولیں۔ سائرہ کے لیے پھر آس بندھی تھی۔ اگلے ہی دن پھپھو ان لوگوں کو لے آئیں۔ امی کو بھی لوگ پسند آئے تھے اور آنے والوں نے بھی حسب معمول سمعیہ کو پسند کر لیا تھا۔ امی نے نند کی وجہ سے کچھ کہا تو نہیں' لیکن کچھ زیادہ توجہ بھی نہ دی' لیکن چند دن بعد جب پھپھو نے انہیں یہ خوش خبری سنائی کہ ان لوگوں نے باقاعدہ سمعیہ کے لیے رشتہ دے دیا ہے اب آپ لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ تو امی ابو سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"سائرہ کے ہوتے میں کیسے سمعیہ کے لیے ہاں کر دوں؟" امی فکر مند تھیں۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں' لیکن شاہدہ ان لوگوں کی بڑی تعریف کر رہی ہے' کہہ رہی تھی کہ زیادہ معلومات کی بھی ضرورت نہیں لڑکا اور اس کی پوری فیملی بہت ہی شریف۔ اور نیک فطرت ہے۔" ابو بھی تذبذب کا شکار تھے۔

"میرا دل نہیں مانتا ابھی بڑی بیٹھی ہے اور چھوٹی کی منگنی کر دوں' آپ بس منع کر دیں شاہدہ کو اللہ مالک ہے' سمعیہ کے لیے اور اچھے رشتے آجائیں گے۔" امی نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا اور ابو بھی جواب میں خاموش ہو گئے' انہیں بھی چپ چاپ سی سائرہ جو خاموشی سے سارے گھر کی خدمت کرتی رہتی بہت پسند تھی اگرچہ چاہتے تو وہ۔ چاروں۔ کو ہی تھے' لیکن سائرہ سے ان کو خاص قلبی لگاؤ تھا اور وہ اسے نادانستگی میں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ اگلے دن جب انہوں نے فون پر شاہدہ سے بات کی تو شاہدہ تو اتنے اچھے لوگوں کے لیے انکار کا لفظ سنتے ہی اچھل پڑیں۔

"ارے بھائی جان کیا ہو گیا آپ کو' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں شاہدہ' میں نے اور تمہاری بھابھی نے' ہم دونوں نے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"اچھا ایسا ہے کہ میں شام کو آپ کی طرف آؤں گی پھر تفصیل سے بات ہو گی۔" شاہدہ نے کہا اور پھر انہوں نے شام ہونے کا بھی انتظار نہ کیا اور رکشا کر کے بھائی کے گھر آگئیں۔

"کیا ہوا؟ آپ لوگ کس وجہ سے اتنے اچھے رشتہ سے انکار کر رہے ہیں؟"

"وجہ تو صاف ظاہر ہے۔" امی سنجیدگی سے بولیں۔

"دیکھو شاہدہ تم بھی یہ بات جانتی ہو کہ ہم سائرہ کے لیے کتنے پریشان ہیں اور ہم اسی لیے یہ چاہتے ہیں کہ پہلے سائرہ کی بات طے ہو جائے' رہی سمعیہ تو اس نے تو ابھی صرف انٹر ہی کیا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے فقط اٹھارہ سال' جبکہ سائرہ۔ ہم نہیں چاہتے کہ سائرہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ لہٰذا پہلے سائرہ کی ہو گی پھر سمعیہ کی۔" ابو نے فیصلہ کن انداز میں بہن سے کہا۔

"لیکن بھائی جان یہ کہاں لکھا ہے کہ پہلے بڑی کی ہی ہو پھر چھوٹی کی باری آئے۔ اب لوگوں کے ذہن بدل رہے ہیں' ہاں آپ کے ہمارے زمانے میں ضرور ایسی صورت حال تھی' لیکن اب نہیں ہے۔ لوگوں کی سوچ بدل چکی ہے۔ ارد گرد کتنی ہی مثالیں میں آپ کو دکھا دوں' لوگ تو اچھے رشتے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اسی میں دانشمندی ہے۔ آپ انکار کریں گے وہ لوگ کسی اور لڑکی سے کر دیں گے۔ مجھے خدا نخواستہ سائرہ سے کوئی بیر تو ہے نہیں جیسے سمعیہ میری بھتیجی ویسے ہی سائرہ' لیکن میں نہیں چاہتی کہ اتنے اچھے شریف لوگ' جن کو میں بہت اچھی طرح جانتی بھی ہوں ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔" وہ اپنے بھائی بھابھی کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"تم نہیں سمجھ رہیں شاہدہ' پھر سائرہ کیا سوچے گی؟ وہ دل میں یہ نہیں محسوس کرے گی کہ ماں باپ نے اس کو چھوڑ کر اس سے کئی سال چھوٹی بہن کی کر دی۔" امی بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

"بھابھی وہ کیوں ایسا سوچے گی' کیا آپ لوگ جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہیں' کیا آپ لوگ اس کے لیے کوششیں نہیں کرتے؟ جب ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں سوچے گی' پھر اگر ایسی بات بھی ہے تو میں اسے سمجھاؤں گی' ماشاء اللہ سمجھ دار ہے' پڑھی لکھی ہے۔ آخر قسمت کے آگے کس کا بس چلتا ہے اب اگر نصیب سے اچھے لوگ سمعیہ کے لیے آگئے ہیں تو اللہ نے چاہا تو سائرہ کے لیے بھی آجائیں گے پھر سائرہ' سمعیہ سے کتنی محبت کرتی ہے وہ بھی تو اپنی بہن کے لیے اچھا ہی چاہے گی۔" شاہدہ' شاید آج یہی سوچ کر آئی تھیں کہ بھائی اور بھابھی کو قائل کر کے ہی رہیں گی۔

"اچھا میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گی۔" امی اب بھی گومگو کی کیفیت میں تھیں۔

"نہیں اب سوچنے میں وقت نہیں ضائع کرنا' سائرہ کا تو جب وقت آئے گا سو آئے گا' لیکن سمعیہ کے لیے میں آپ سے اقرار کروا کر ہی رہوں گی۔" وہ تقریباً" ضدی لہجے میں بولیں۔ امی' ابو نے ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھا کیونکہ ابو بھی اس فیملی سے مل چکے تھے اور لڑکے کو بھی دیکھ چکے تھے۔ اگرچہ انکار کرنا واقعی نادانی تھی کیونکہ لڑکا مناسب عمر کا' شریف اور کماؤ تھا' لیکن یہاں بیٹی کی محبت آڑے آرہی تھی' لیکن پھر وہ دونوں شاہدہ کے دلائل کے آگے مجبور ہو گئے۔ انہوں نے گھر میں بیٹوں سے بھی مشورہ کیا۔ سائرہ کی دل شکنی ہونے کے خدشے کا بھی اظہار کیا' لیکن پھر اجتماعی طور پر سب کا یہی فیصلہ تھا کہ اچھے لوگوں کو انکار کرنا بھی کفران نعمت ہے لہٰذا اس رشتے کے سلسلے میں سائرہ سے بھی ذکر کر کے "ہاں" کر دی جائے۔ پھر امی نے سائرہ کو بٹھا کر ساری صورت حال بتائی۔

امی جس طرح سائرہ کو پوری تفصیل سنا رہی تھیں

اس سے وہ امی کی اس کیفیت کو بخوبی جانچ رہی تھی کہ کس طرح امی نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے پر دوسروں کے اصرار کی وجہ سے راضی ہو رہی ہیں۔ اگرچہ ایک طرف اس کا دل بھی لمحہ بھر کے لیے اپنے سے کئی سال چھوٹی بہن کا رشتہ طے ہونے پر ڈوبا تھا' لیکن یہ ایک وقتی جذبہ تھا ورنہ وہ سعدیہ سے بہت پیار کرتی تھی جس کا اظہار بھی کھلے دل سے کرتی رہتی اور پھر اس جذبے پر بہن کی محبت غالب آگئی تھی۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو اندر ہی اندر جذب کرکے امی کا ہاتھ تھام کر دبایا تھا۔

"امی آپ میری طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ یہ رشتہ پھپھو کی معرفت آیا ہے تو یقیناً" اچھا ہوگا آپ فوراً" ہاں کریں اور اب ہم سعدیہ کی منگنی کی تیاریاں کریں گے۔" سائرہ نے مسکرا کر کہا تھا۔

"بیٹا یقین کرو میں تو یہی چاہتی تھی بلکہ تمہارے ابو بھی کہ پہلے تمہاری۔"

"امی اللہ نے ہر کام کا ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے تو بس جب ہمیں اس بات کا یقین ہے تو پھر اس بات کا بھی یقین رکھیں کہ ابھی سعدیہ کا وقت آیا ہے میرا نہیں اور اب آئندہ آپ ایسی باتیں نہیں کریں گے اور آپ بالکل بھی یہ نہ سوچیں کہ میں کسی بھی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہوں گی بلکہ میں تو خوش ہوں کہ اللہ نے اچھے لوگوں سے میری معصوم بہن کا جوڑ ملایا۔" سائرہ نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا اور امی اس کے اس طرح کہنے سے یکدم ہی مطمئن ہو گئیں۔

"خوش رہو' دیکھنا اللہ تم کو بھی اس کا کتنا اچھا انعام دے گا میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" امی اس کا ماتھا چومتی اطمینان سے اٹھ گئیں — ان کے ذہن سے بوجھ اتر گیا تھا اور وہ ہلکی پھلکی ہو گئیں پھر انہوں نے ابو اور پھپھو سے بات کرکے وہاں اقرار کہلوا دیا تھا۔ چند روز بعد ہی ان لوگوں نے رسم کرنے کا عندیہ دے دیا اور یوں سعدیہ کی منگنی کر دی گئی اور اس دوران سائرہ نے بڑی خوشی خوشی امی کے ساتھ جا کر منگنی کی تیاریوں میں حصہ لیا تھا۔ سعدیہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سسرال والوں نے اس کے لیے بہت قیمتی اور خوب صورت چیزیں بھیجی تھیں جس کو دیکھ کر سب ہی خوش تھے۔ یوں خیر و خوبی سے منگنی ہو گئی تھی۔ چند دن تو اسی تقریب کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر جب سب واپس اپنے معمول پر آئے تو امی کو دوبارہ سے سائرہ کی فکر نے گھیر لیا تھا۔ ان کی زیادہ تر دعائیں سائرہ کے لیے ہی ہوتیں۔

☆ ☆ ☆

سعدیہ کی منگنی کو چھ ماہ ہو گئے تھے تب ہی پھپھو' فراز (سعدیہ کے منگیتر) کے گھر والوں کی طرف سے یہ پیغام لائیں کہ فراز کی والدہ شادی کے لیے تاریخ مانگ رہی ہیں۔ کیونکہ فراز کے بڑے بھائی سجاد کی جہاں منگنی ہوئی تھی وہاں لڑکی کے بھائی دو سال کے لیے امریکہ جا رہے ہیں لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ بہن کی شادی ان کے سامنے ہو اور فراز کی والدہ دونوں بیٹوں کی ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں۔

پھپھو نے جب یہ تفصیل امی ابو کے گوش گزار کی تو امی کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ انہوں نے سعدیہ کی منگنی تو کر دی تھی' لیکن سائرہ سے پہلے اس کی شادی! ایسا وہ نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے ابو سے مشورے کے بعد کہلوا دیا تھا کہ اتنی جلدی وہ شادی کی تاریخ نہیں دے سکتیں کم از کم ایک سال سے قبل وہ سعدیہ کی شادی نہیں کر سکتیں۔ یہ ساری باتیں پھپھو کی معرفت ہی کی گئی تھیں۔ اگرچہ پھپھو نے بھائی بھابھی پر تھوڑا زور بھی دیا' لیکن اب کے ابو نے بیوی کا ساتھ دیا۔

"شاہدہ! ان لوگوں سے ہماری طرف سے معذرت کر لو۔ اگر سال کے دوران سائرہ کی بھی کہیں بات طے ہو گئی تو اللہ نے چاہا تو میں دونوں بیٹیوں کی ساتھ شادی کروں گا۔" ابو نے دو ٹوک لہجہ میں کہا تھا اور یوں پھپھو کو بات ماننی ہی پڑی۔

سعدیہ کے جیٹھ کی شادی اور ولیمہ' دونوں دن سارا گھر ہی شریک تھا۔ سعدیہ کے لیے اس کے سسرال سے دونوں دعوتوں میں پہننے کے لیے لباس آئے تھے اور اسے خصوصی طور پر وہاں شرکت کرنی تھی۔ سارا گھر ہی شادی میں شریک ہوا تھا۔ بہرحال شادی بہت اچھی رہی تھی۔ دلہن بھی تیکھے نقش کی بڑی جاذب نظر تھی۔

امی تو سائرہ کے رشتے کے انتظار میں تھیں' جس کی وجہ سے ابھی وہ سعدیہ کی شادی بھی نہیں کر رہی تھیں تو ایسے حالات میں وہ کامران کی شادی کا تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں' لیکن ہونی کو کون روک سکتا ہے طاہرہ' امی کی بڑی بہن کی بیٹی تھی' جو بچپن ہی سے انہیں بہت پسند تھی۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار وہ وقتاً" فوقتاً" بڑی بہن اور بہنوئی کے آگے کرتی رہتی تھیں اور کئی سال قبل جب طاہرہ کی بڑی بہن کی شادی ہوئی تو مہندی والے دن طاہرہ جب تیار ہو کر دلہن کے ساتھ آئی تو بے ساختہ ہی امی نے اسے گلے سے لگا کر بہن سے کہہ دیا کہ طاہرہ تو میرے کامران کی ہے۔ جواب میں بہن اور بہنوئی نے بھی اقرار کر لیا۔ اتفاق سے کامران بھی وہاں موجود تھا اس نے بھی طاہرہ کی طرف پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب طاہرہ اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

طاہرہ ویسے بھی بہن بھائیوں میں چھوٹی تھی اور ابھی اس سے بڑی دو بہنیں غیر شادی شدہ تھیں لہٰذا امی کو اطمینان تھا کہ جب تک طاہرہ کا نمبر آئے گا وہ بھی بیٹیوں سے فارغ ہو چکی ہوں گی۔ اس دوران اگرچہ بہن بہنوئی کی طرف سے رسم کرنے کا بھی دبے الفاظ میں اشارہ ملا' لیکن امی ٹال گئیں۔ ان کے مطابق تو زبان سے بڑھ کر کسی چیز کی اہمیت نہیں' لیکن اب اچانک ہی بہن بہنوئی نے آکر شادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ جس کو سن کر امی کو تو گویا سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔ ان کا مطالبہ بھی درست تھا کہ طاہرہ کا وہیں سے ایک بڑا اچھا رشتہ آیا ہوا تھا اور وہ لوگ تین ماہ میں ہی شادی کا کہہ رہے تھے۔

"صفیہ اگر تم کامران اور طاہرہ کی شادی چھ ماہ میں کرا لو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میں ان لوگوں کو ہاں کر دوں۔" بڑی خالہ نے بغیر کسی لگی لپٹی کی۔

"آپا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اول تو تم نے منگنی کی رسم بھی نہ کی۔ میں خاموش رہی اس دوران کتنے ہی اچھے رشتے آئے' لیکن میرے لیے تم اور کامران سے بڑھ کر کوئی نہ تھا' لیکن یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ انکار کرتے ہوئے بھی دل ڈر رہا ہے اور تمہارے بہنوئی بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ طاہرہ سے بڑی کی شادی بھی ہو چکی تم خاموش بیٹھی ہو میں آخر کب تک تمہارے آسرے پر اپنی بیٹی بٹھائے رکھوں۔" بڑی خالہ برہمی سے کہہ رہی تھیں۔

"لیکن ابھی طاہرہ کی عمر ہی کیا ہے میری سعدیہ سے بھی چھوٹی ہے۔" امی پریشان تھیں۔

"بس بس' وہ شادی کے قابل ہو چکی ہے اور یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کی' اب کیا بڑی عمر میں لڑکیاں دلہن بنتی اچھی لگتی ہیں؟" ان کے لہجے میں تلخی — گھلی ہوئی تھی۔

"تو آپ کیا چاہ رہی ہیں۔"

"اگر ہم چاہتے تو یہ رشتہ توڑ بھی سکتے تھے' لیکن ہم نے بھی زبان کا پاس رکھا ہے۔ اسی لیے تمہارے پاس آئے ہیں اگر تم آج چھ ماہ میں شادی کر سکتی ہو تو اچھی بات ہے ورنہ بات ختم کرو' میں ان لوگوں کو پھر ہاں کر دوں۔"

"اتنی جلدی آپا' ابھی تو سائرہ اور سعدیہ دونوں۔ میں نے تو سائرہ کی وجہ سے سعدیہ کے سسرال معذرت کر لی اور اب کہاں کامران کی۔" امی تو سچ مچ روہانسی ہو گئیں۔

"تو پھر سیدھا سیدھا رشتہ ختم کرو۔" بڑی خالہ تلخی سے بولیں۔

"میرے خیال سے صفیہ تم بھائی افضل سے مشورہ کرکے کل تک ہمیں جواب دے دو۔" اتنی دیر سے خاموش بڑی خالہ کے میاں بولے۔ تو امی نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ پہلی معقول بات ہوئی

تھی اس ساری گفتگو میں۔

"بس کل تک بتا دینا" ہم اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔" بڑی خالہ نے کہا اور کھڑی ہو گئیں اور امی لب بھینچ کر رہ گئیں۔

شام میں میاں اور بیٹوں کے سامنے امی نے ساری بات رکھی۔ ابو بھی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ بڑا بیٹا سفیان بھی خالہ کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

"خالہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ہمیں کچھ وقت تو دیں۔" سفیان ماتھے پر بل ڈالتا ہوا بولا۔

"تم نے کیا سوچا صفیہ۔" ابو امی سے پوچھ رہے تھے۔

"میرا تو آپا کی بات سن کر بہت ہی دل کھٹا ہوا ہے۔ وہ بیٹی والی ہو کر بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں اور میں بیٹے کی ماں ہوتے ہوئے بھی۔ لاکھ میری بہن سہی پر میری مجبوری بھی تو دیکھیں۔ بس آنکھوں پر دولت کا نشہ چڑھ گیا ہے' میں تو یہی سوچ رہی ہوں کہ کہہ دوں کہ ٹھیک ہے پھر اپنی بیٹی کو دے ہی بھیج دو۔ آج اس طرح زور دکھا رہی ہیں تو شادی کے بعد تو نہ جانے مجھے کیا حیثیت دیں گی۔" امی کو بہن کی بات پر غصہ آیا ہوا تھا۔

"کامران سے تو پوچھ لیں۔" سفیان نے کچھ سوچ کر کامران کی طرف دیکھتے ہی کہا۔

"کامران نے کیا کہنا ہے' ساری بات تو تم نے بھی سن لی تمہاری خالہ کیا کہہ کر گئی ہیں۔" امی نے سامنے بیٹھے کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں' لیکن میں نے شادی طاہرہ ہی سے کرنی ہے ورنہ میں شادی ہی نہیں کروں گا اور خالہ جان کا مطالبہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں اور جہاں تک رہا چھ ماہ کا سوال تو چھ مہینے اچھے خاصے ہوتے ہیں آسانی سے تیاری ہو سکتی ہے۔" کامران کا جواب سن کر امی کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

"لیکن بیٹا سائرہ۔" امی اٹک کر رہ گئیں۔ "وہ تم سے بڑی ہے اور۔۔۔"

"امی جب سائرہ کی ہونا ہو گی تو اس کی بھی ہو جائے گی۔" وہ عجیب نروٹھے لہجے میں بولا اور امی سے اس کے جواب میں کچھ نہ بولا گیا۔ ابو اور سفیان بھی خاموش رہے۔ وہ کچھ کہہ کر اپنی بات ہلکی نہیں کروانا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں کامران اور سفیان دونوں ہی اٹھ گئے تو ابو نے امی کو بغور دیکھا ان کا چہرا اترا ہوا تھا ان کو کامران سے شاید ایسے صاف اور سیدھے جواب کی امید نہ تھی۔

"تم پریشان نہ ہو' اللہ مالک ہے۔" ابو تسلی دے رہے تھے۔

"لیکن اتنی جلدی جبکہ دونوں بچیاں ابھی۔۔" امی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"کل آپا نے جواب مانگا ہے کیا ان سے ہاں کہہ دوں؟"

"ہاں! ان سے ہاں کہہ دو' لیکن چھ ماہ کا نہ کہو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر اس دوران سائرہ کا ہو گیا تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ کامران اور سمعیہ کی شادی ساتھ کر دیں گے۔ میں شاہدہ سے بات کرتا ہوں وہ اس کی سسرال بات کرے پھر دونوں کی شادی ایک ہی ساتھ نبٹا دیں گے۔" ابو سوچتے ہوئے بولے اور جواب میں امی صرف سرہلا کر رہ گئیں۔ یہ بات ان کو بھی کچھ بہتر لگی تھی۔

* * *

اگلے دن امی نے پہلے تو اپنی بہن کو ان کے من کی مراد پوری ہونے کی خوش خبری سنائی اور مبارک دی۔ جواب میں خالہ نے فوراً" ہی مہینہ مقرر کرنے کا اشارہ دیا جس کے جواب میں امی نے ان سے پندرہ دن کا کہہ کر وقت لیا کہ تم گھر آ جاؤ پھر بیٹھ کر صلاح مشورے سے دن' تاریخ بھی مقرر کریں گے۔ جس کے لیے خالہ خلاف توقع مان گئیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی نند شاہدہ کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی اور ان سے اپنے میاں کی سوچ کا بھی اظہار کر دیا پھر ان سے ان کی رائے طلب کی۔

"بھابھی بات تو ٹھیک ہی ہے' اب دیکھیں فراز کے

گھر والے کیا کہتے ہیں؟" وہ سوچ کر بولیں۔
"تمہارا کیا خیال ہے مان جائیں گے یا نہیں۔"
"میں کچھ کہہ نہیں سکتی' دونوں باتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ اب یہ بھی تو دیکھیں کہ جب وہ لوگ شادی پر اصرار کر رہے تھے تو آپ کی طرف سے انکار تھا۔ اب آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ کامران کے ساتھ سمعیہ کی بھی ہو جائے اور وقت بھی آپ پانچ' چھ ماہ کا خود کہہ رہی ہیں تو یہ تو پھر۔"
"شاہدہ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں آپا' ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔" امی نے نند کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر ان کی آواز بھرا گئی۔
"اچھا بھابھی آپ پلیز دل چھوٹا نہ کریں' میں بات کرتی ہوں' ان شاء اللہ جو ہو گا ٹھیک ہی ہو گا آپ اطمینان رکھیں۔" شاہدہ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا اور پھر ایک ہفتہ بعد ہی شاہدہ خود ہی آگئیں ان کا جواب لے کر۔
"بھائی جان اگرچہ انہوں نے میری بات بہت سمجھ سے سنی اور وہ بھی آپ کی خواہش پوری کرنا چاہ رہے تھے' لیکن ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔" شاہدہ بھائی اور بھابھی کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھیں۔
"ان سے کہو کہ زیادہ بکھیڑا نہ کریں بس سادگی سے شادی کر لیں۔ ظاہر ہے ابھی ایک شادی سے فارغ ہوئے ہیں تو اتنے جلدی تو دوسری شادی کرنا آسان نہیں۔" امی جلدی سے بولیں کیونکہ وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ اتنی مہنگائی میں دوبارہ سے اتنی جلدی شادی کرنا آسان نہیں۔
"ارے نہیں بھابھی خرچہ کی بات نہیں ہے آپ تو جانتی ہی ہیں کہ اصل میں فراز کی بڑی بہن کے میاں جاب کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتے ہیں جہاں سے ان کو جب چھٹیاں ملتی ہیں تب ہی وہ یہاں آتے ہیں۔ اب ظاہر ہے وہ پچھلی بار چھٹیوں میں ہو گئے اور اتنے جلدی دوبارہ آ نہیں سکتے۔ لہٰذا بہن نے بھی کہہ دیا کہ اگر ہماری فیملی کے بغیر شادی کر سکتے ہیں تو کر لیں ورنہ میں میاں کے بغیر شرکت نہیں کروں گی اور پھر دوسری بات یہ کہ ان کے بڑے بیٹے کی بھی بیوی کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ چل رہی ہے۔ آثار کچھ اچھے نہیں بے چاری بڑی پریشان ہیں۔ ایک طرف بیٹی' داماد کا آنے سے انکار تو دوسری طرف گھر میں جھگڑے۔ اب ایسے حالات میں وہ چھوٹے بیٹے کی شادی کیسے کر دیں۔ آپ کامران کی تاریخ مقرر کریں' دیکھیں آگے کیا ہوتا ہو' ہو سکتا ہے اس دوران فراز کے گھر والے بھی تیار ہو جائیں۔" شاہدہ نے تفصیل سے بتا کر آخر میں ان کو آس بھی دلائی۔
"لیکن بڑے بیٹے کی شادی کو ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے جو تم کہہ رہی ہو کہ کھٹ پٹ بھی شروع ہو گئی۔" امی کا تو ذہن وہیں اٹک گیا تھا کیونکہ آخر ان کی بیٹی کو بھی اسی گھر میں ہی جانا تھا۔
"بھابھی مسئلے مسائل کس گھر میں نہیں ہوتے۔ ویسے میں آپ کی فکرمندی سمجھ رہی ہوں' لیکن آپ مطمئن رہیں وہ جھگڑے ان کی وجہ سے نہیں بلکہ آنے والی لڑکی یعنی نئی دلہن کی وجہ سے ہی ہو رہے ہیں۔ خدا جانے کیسے کیسے مطالبات اس نے آتے ہی شروع کر دیے ہیں کچھ کچھ بتا رہی تھیں۔ خیر جانے دیں بس آپ یہ سمجھ لیں کہ وہ خود ایسی نہیں ہیں نہ ہی ان کی بیٹیاں۔"
اور پھر امی بھی خاموش ہو گئیں اس کے بعد انہوں نے بے دلی سے کامران کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ زیادہ تر وہ بیٹیوں اور بہو کو ہی بازار بھیج دیتیں۔ بس خاص خاص تیاری انہوں نے خود کی۔ اس تمام عرصہ میں وہ سائرہ کے لیے بھی بڑی دعائیں کرتی رہیں لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ قبولیت کا بھی ایک وقت ہوتا ہے تو ابھی ان کی دعا قبول تو ہو گئی تھی' لیکن وقت نہ آیا تھا اور یوں انہوں نے کامران کی شادی بھی کر دی اور طاہرہ ان کی چھوٹی بہو بن کر گھر میں آگئی۔
طاہرہ نے جلد ہی اپنی سعادت مندی اور خلوص سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور یوں امی کے دل میں طاہرہ اور کامران کی طرف سے جو تھوڑی سی کدورت تھی وہ جلد ہی جاتی رہی۔

ابھی کامران کی شادی کو صرف مہینہ ہی گزرا تھا کہ سمعیہ کے سسرال سے یہ خبر آئی کہ فراز کے بڑے بھائی سجاد اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو گئی ہے۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ لڑکی کو سجاد اور اس کے گھر والے دونوں ہی ناپسند تھے اس نے یہ چند مہینے بھی اپنے والدین کی بہت منت سماجت کے بعد گزارے' لیکن اب مزید وہ یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا سجاد سے طلاق مانگی اور اپنا ضروری سامان لے کر چلی گئی۔ یہ ساری باتیں پھپھو نے ہی انہیں بتائی تھیں اور امی تو متحیر سی یہ کہانی سن رہی تھیں۔ ان کی تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔
"شاہدہ یہ سب کیا ہے؟ آخر کل کو میری بچی نے بھی اسی گھر میں جانا ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ سمعیہ کتنی سیدھی ہے کہیں میری بچی۔ یہ رشتہ میں نے صرف تمہارے بھروسہ پر کیا ہے اگر کل کو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میری بچی تو کہیں کی نہیں رہے گی۔" امی سخت فکرمند تھیں۔
"بھابھی' بھابھی کیسی باتیں کر رہی ہیں سمعیہ جتنی آپ کو پیاری ہے اتنی ہی مجھے بھی' آپ یقین کریں کہ یہ سب اسی لڑکی کی وجہ سے ہوا' ورنہ ان لوگوں نے تو بات بنانے کی پوری کوشش کی وہی گھر بسانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی اور یہ اتنے مہینے بھی انہی کی کوششوں کی وجہ سے نکل گئے ورنہ وہ تو شاید ایک ماہ بعد ہی چلی جاتی۔"
"آخر کوئی تو بات ہوگی' لڑکے میں یا اس کے گھر والوں میں' جو لڑکی نے رہنا پسند نہ کیا ورنہ وہ کیوں جاتی۔" امی سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔
"بھابھی یہ دنیا ہے' یہاں ایسے ایسے واقعات اب تو دیکھنے سننے کو ملتے ہیں کہ جو ہم کبھی خواب میں نہیں دیکھتے تھے آپ خدشات نہ پالیں۔" کافی دیر تک شاہدہ ان کو سمجھاتی رہیں تب کہیں جا کر امی مطمئن ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

دن یونہی بے کیف گزر رہے تھے۔ موسموں کا تغیر اسی طرح ہو رہا تھا اس دوران سائرہ کے لیے لوگ آتے رہے' لیکن بات نہ بن پا رہی تھی۔ سائرہ پہلے بھی زیادہ نہ بولتی تھی اب تو اور خاموش رہنے لگی تھی۔ امی نے سمعیہ کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ اسی دوران شاہدہ ایک بڑا اچھا رشتہ لائی تھیں' لوگ اچھے تھے امی کو پسند آئے تھے' لیکن پھر نتیجہ وہی نکلا۔ سائرہ کی بڑھتی عمر اب اس رشتے میں رکاوٹ کا سبب بن گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"امی پھپھو کا فون ہے۔" سمعیہ نے امی سے کہا جو الماری سے سامان نکالے نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔
"اچھا آ رہی ہوں۔" امی مصروف لہجے میں بولیں اور پھر انہوں نے اپنے آگے سے سامان ہٹایا اور شاہدہ کا فون سننے لاؤنج میں آ گئیں۔
"السلام علیکم! بھابھی جان کیسی ہیں؟" شاہدہ بڑے چونچال موڈ میں تھیں۔
"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔"
"بس بھابھی' مٹھائی تیار رکھیں شام کو میں آ رہی ہوں' بڑی خوشی کی خبر لے کر۔"
"وہ تو تمہارے لہجے سے ہی لگ رہا ہے۔ کیسی خوشی کی خبر ہے کیا تمہارا کوئی انعام وغیرہ نکل آیا؟"
"ارے انعام چھوڑیں' بس بھائی جان کو فون کر دیں وہ مٹھائی لیتے آئیں۔"
"ارے کچھ بتاؤ گی بھی یا صرف خوش ہی ہوتی رہو گی اور مٹھائی کا کیا ہے وہ تو میں ابھی منگوا لیتی ہوں' لیکن بات کیا ہے؟" امی حیران تھیں۔
"بس میں یہ آ کر بتاؤں گی۔" انہوں نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا اور امی کو تجسس میں مبتلا کر دیا۔ پھر امی اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہو گئیں۔ شام میں انہوں نے میاں کو فون کر دیا تھا کہ آتے ہوئے مٹھائی لیتے آئیں کہ نہ جانے شاہدہ کیا خبر سنانے والی ہیں۔ پھپھو اور ابو دونوں آگے پیچھے ہی گھر میں داخل ہوئے۔ سلام دعا' خیر خیریت کے بعد ابو کپڑے بدلنے اور فریش

ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور شاہدہ بھاوج کے پاس بیٹھ گئیں وہ بات کرنے کے لیے بڑی بے چین لگ رہی تھیں۔ بھائی کے آنے تک وہ امی سے سائرہ اور صحیبہ کے بارے میں ہی گفتگو کرتی رہیں۔

"ہاں بھئی شاہدہ اب کہو وہ کیا خبر ہے، جس کے لیے تم نے پہلے مٹھائی منگوائی۔" ابو مسکرا کر پوچھ رہے تھے۔

"بھائی جان ہے تو خوشی کی خبر میں نے جب یہ بات سنی تو میں تو آپ دونوں سے کہنے کو بے چین ہو گئی' لیکن اب مجھے اچانک یہ خیال آیا ہے کہ نہ جانے آپ کے لیے بھی یہ بات اتنی ہی اہم اور مسرت کا باعث ہو گی یا۔" شاہدہ رکیں۔

"اپنی بات مکمل کرو شاہدہ۔" ابو نے بہن کو بات پوری کرنے کا کہا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"یا کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔" شاہدہ بھی اب سنجیدہ ہو چلی تھیں۔

"خوشی اور ناراضی تو بعد کی بات ہے' تم اصل بات تو بتاؤ۔" اب امی بھی بولیں۔

"بات اصل میں یہ ہے بھابھی جان کہ فراز کے بڑے بھائی سجاد کا قصہ تو سب آپ کے سامنے ہے کہ کیسے چند مہینوں میں ہی اس کی شادی ختم ہو گئی۔ اگرچہ ان لوگوں نے اس شادی کو قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جس کی گواہ میں خود ہوں۔ لیکن جب اگلا فریق کسی طرح تیار ہی نہ ہو تو یہ لوگ کیا کرتے۔ اب چونکہ اس بات کو بھی کافی مہینے گزر گئے اور آپا (فراز کی والدہ) کل میرے پاس آئی تھیں وہ فراز اور صحیبہ کی شادی کے متعلق بات کر رہی تھیں کہ تین چار مہینوں میں بس تاریخ ٹھہرا لیں۔"

"اچھا تو تم نے اس لیے مٹھائی کا کہا تھا۔" امی ہنسیں۔

"نہیں اس لیے نہیں کہا تھا بلکہ۔۔۔" پھپھو نے چند لمحے کا توقف کیا۔ "بلکہ انہوں نے ہماری سائرہ کا رشتہ مانگا ہے۔" پھپھو یہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئیں۔

"سائرہ کے لیے؟ شاہدہ کیا کہہ رہی ہو؟ سائرہ کا رشتہ کس کے لیے؟" امی نا سمجھی سے کہہ رہی تھیں۔

"سائرہ کا رشتہ سجاد کے لیے!" پھپھو نے گویا دھماکا کیا۔

"سجاد کے لیے؟ کیا مطلب؟" امی متحیر تھیں تو ابو بھی حیران نظروں سے بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"اصل میں اب وہ فراز کے ساتھ سجاد کی دوسری شادی بھی کر کے دونوں بیٹوں کا گھر ساتھ بسانا چاہتی ہیں اور پچھلے کافی دنوں سے وہ سجاد کے لیے بھی لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں' لیکن اللہ کا حکم ہی نہیں ہو رہا۔ کل وہ جب خود آئیں تو انہوں نے ہی مجھے کہا کہ دو تین جگہ بات ڈالی' لیکن بات نہ بن سکی تو انہیں ان کی چھوٹی بہن یعنی فراز کی خالہ نے یہ مشورہ دیا کہ آپ ادھر ادھر لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں حالانکہ ایک بڑی اچھی لڑکی آپ کے سامنے ہے اور دیکھی بھالی بھی ہے۔ جس پر فراز کی خالہ نے ہماری سائرہ کا نام لیا تو وہ تو خود بڑی حیران ہوئیں کہ سائرہ کا تو انہیں خیال نہ آیا' لیکن بہن کے کہنے پر وہ فوراً" ہی میرے پاس آئیں کہ میں آپ لوگوں سے آپ کی رائے لوں' اگر آپ لوگ راضی ہوں تو وہ باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں گی۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیں آپ کی کیا رائے ہے؟" شاہدہ نے اپنی بات پوری کر کے بھائی' بھاوج کو امید افزا نظروں سے دیکھا۔

"شاہدہ ہمیں سوچنے کا وقت تو دو۔"

"بالکل بھائی جان' آپ وقت لے لیں' لیکن یہ بھی ضرور خیال رکھیے گا کہ لوگ بہت اچھے ہیں اور۔۔۔"

"یہ تو تم ہمیشہ سے کہتی آ رہی ہو' لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ سجاد نے اپنی بیوی کو چھوڑا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ سجاد کی کیا بات ایسی تھی کہ وہ لڑکی۔۔۔ اور پھر ایک لڑکی تو ہم اس گھر میں دے رہے ہیں' پھر دوسری بھی' مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" امی پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔

"بھابھی اگر میں ہمیشہ ان لوگوں کی تعریف کرتی ہوں تو اس لیے کہ وہ ہیں ہی تعریف کے قابل اور میں آج سے نہیں بلکہ پچھلے بارہ' تیرہ سالوں سے ان کی

فیملی کو جانتی ہوں اور جہاں تک سجاد کی شادی کی بات ہے تو وہ میں آپ کو پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس میں ننانوے فیصد قصور لڑکی اور اس کے گھر والوں کا تھا۔ ان کی غلطی تو صرف ایک فیصد ہی ہو گی اور پھر' آپ سب سے اچھا تو یہ کہ استخارہ کر لیں اللہ سے مشورہ کر لیں اگر استخارہ اچھا ہوا تو پھر تو کوئی مسئلہ نہ ہو گا اور یہ بھی کہ دونوں بہنیں ایک گھر میں ہوں گی تو ان دونوں کے لیے بھی یہ کتنا اچھا ہو گا اور ایک آخری بات۔" وہ چند لمحے رکیں۔ "آپ سائرہ کے لیے کب سے کوششیں کر رہی ہیں' لیکن اس کا نصیب کہ کہیں بھی بات نہ بن سکی اور مجھے کہنا تو نہیں چاہیے' لیکن۔۔۔ سائرہ کی عمر دیکھیں وقت تیزی سے گزر رہا ہے اگر اب بھی اس کی شادی نہ ہوئی تو بہیں پھر عمر گزر جائے گی تو ہم سب خدانخواستہ ہاتھ ملتے ہی نہ رہ جائیں۔ بھابھی جان آپ پلیز میری بات کا غلط مطلب نہ لیجیے گا۔ یہ سب میں طنزاً" نہیں بلکہ اپنی پیاری بھتیجی سائرہ کی محبت اور اس کی بھلائی میں کہہ رہی ہوں۔ آپ یقین کریں سجاد تو فراز سے بھی اچھا لڑکا ہے۔" وہ اتنی لمبی بات کر کے خاموش ہو گئیں۔

امی اتنی لمبی بات کے جواب میں پہلو بدل کر رہ گئیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں پھپھو کی بات پسند نہیں آئی۔ ابو بھی خاموش بیٹھے رہے۔

"اگر آپ لوگوں کو میری بات بری لگی تو میں معذرت چاہتی ہوں' لیکن آپ دونوں ٹھنڈے دل سے میری بات پر غور ضرور کیجیے گا اور سائرہ سے بھی اس کا ذکر کر دیں اگر وہ انکار کرتی ہے تو بے شک انکار کر دیجیے گا۔" وہ یہ کہہ کر کھڑی ہو گئیں۔

"ارے تم یہ کھڑی کیوں ہو گئیں۔" امی ایک دم ہی ان کے اٹھنے سے بڑبڑا گئیں۔ "بس بھابھی اب میں چلتی ہوں۔" "بغیر چائے پانی کے؟" "ہاں بھابھی بس۔"

"چلو چلو بیٹھو' یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے' یہ بات اپنی جگہ اور ہمارا تمہارا رشتہ اپنی جگہ' آج تک بھی ایسا ہوا ہے کہ تم بغیر کھائے گئی ہو؟" امی بڑی اپنائیت سے کہہ رہی تھیں اور پھپھو ان کی محبت کے آگے بے بس تھیں۔ سو امی کو بڑی اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ وہ اپنے سسرالی رشتہ داروں سے بھی کتنا خلوص اور لگاؤ رکھتی تھیں اور خاص کر شاہدہ سے تو ان کی بہت بنتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پھپھو بھی اپنے اس بھائی' بھابھی اور بچوں سے بڑی انسیت رکھتی تھیں اور بہت آتی جاتی تھیں اور پھر وہ کافی دیر بیٹھی رہیں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھپھو کے جانے کے بعد رات میں ابو' امی نے دونوں بیٹوں کے سامنے سائرہ کے رشتے کی بات رکھی۔

"اگر پھپھو مطمئن ہیں تو میرے خیال سے پھر انکار نہیں کرنا چاہیے۔" سفیان نے کہا تو ابو نے امی کو دیکھا لیکن بیٹا تمہاری ایک بہن تو اس گھر میں جا رہی ہے اب دوسری بھی۔" امی کے دل میں خدشات ابھر رہے تھے۔ "یہی بات ہے میرا دل ڈر رہا ہے۔"

"امی آپ ڈریں نہیں سائرہ ہماری پیاری بہن ہے' ہم اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی اسے بیاہیں گے اور پھر دو بہنیں ایک گھر میں شادی ہو کر جائیں تو یہ تو اور بھی بہتر ہو گا۔ دونوں ایک دوسرے کا خیال کریں گی جیسے یہاں رہتی ہیں ویسے وہاں رہ لیں گی اور آپ خود دیکھیں کہ آج تک سائرہ کے لیے جو بھی آیا وہ ایسا نہ تھا کہ ہم ہاں کرتے' لیکن یہاں ایسا ہے کہ ہم قبول کر لیں۔" سفیان امی سے کہہ رہا تھا۔

"لیکن یہاں بھی تو لڑکے کی دوسری شادی ہے' کون سا کنوارہ ہے۔" امی نے سفیان کو یاد دہانی کروائی۔

"سوائے اس خامی کے اور تو کوئی نہیں اور سب سے بڑھ کر پھپھو مطمئن ہیں۔ ہمیں تو پھپھو کی ضمانت حاصل ہے تو پھر ہمیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔" سفیان بھی لگتا تھا کہ پھپھو سے متفق تھا۔

اس کے بعد چند دن کی سوچ بچار' مشورہ کر کے سائرہ سے بھی اس کا ذکر کر دیا گیا تھا اس نے معاملہ والدین پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ امی نے استخارہ بھی کیا جس میں مثبت اشارے ہی ملے تو پھر آپس کے صلاح مشورے کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا گیا اور ہاں کرنے کی

www.paksociety.com

دیر تھی پھر تو چار مہینے کے بعد ہی شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی۔

اور پھر شادی کی تیاریاں اور وہ بھی دو دو' کس طرح دن پر لگا کر اڑے کہ کسی کو سچ مچ سر کھجانے کی فرصت نہ رہی۔ کہاں تو امی سائرہ کے لیے پریشان تھیں اور کہاں معاملہ جھٹ پٹ ہی نبٹا کہ منگنی اور رسم بھی نہ کی گئی اور یوں وہ خوشیوں بھرا دن آپہنچا جب دونوں بہنیں اسٹیج پر دلہن کا روپ سجائے بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ امی اگر ایک طرف خوش تھیں تو دوسری طرف آنے والے وقت کا دھڑکا بھی تھا کہ دو بیٹیاں ایک ہی گھر میں رخصت ہو رہی تھیں۔ دل ہی دل میں دونوں پر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں کہ حاسدوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جو ان کی بیٹیوں کے اچھے گھر میں جانے سے حسد کر رہے تھے۔ کوئی خوش تھا تو کوئی جل بھی رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں ساتھ خیریت کے اپنے گھر کی ہوئیں تو امی نے گھر آکر شکرانے کے نفل پڑھے۔

ایک دن کے وقفہ کے بعد ولیمہ کا فنکشن تھا۔ آف وائٹ اور سی گرین کے کنٹراسٹ کے شراروں میں دونوں بہنیں بہت پیاری لگ رہی تھیں اور سب سے بڑھ کر دولہوں کے مطمئن چہرے جن پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ امی تو بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں اور سب سے بڑھ کر اپنے رب کی شکر گزار تھیں۔ پھپھو بھی خوشی خوشی سب سے مل رہی تھیں۔ سب ہی گھر والے ولیمہ کے فنکشن میں بڑے خوش اور مطمئن تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہاں بیٹا' عاشر کی اب طبیعت کیسی ہے؟"

"جی امی ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کل کچھ فرق لگ رہا تھا' لیکن صبح سے پھر بخار تیز ہو رہا ہے۔"

"تو بیٹا میں نے تم سے جو کہا تھا وہ کیا؟"

"امی یہ کہہ رہے تھے کہ بس اپنے ٹوٹکے چھوڑو' انہوں نے ایک اسپیشلسٹ سے ٹائم لے رکھا ہے' میں اب وہیں جا رہی ہوں۔ اس ڈاکٹر کی دوا سے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ لہٰذا دوسرے بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے' حالانکہ ان کی اتنی اہم میٹنگ بھی تھی' لیکن وہ بھی انہوں نے چھوڑ دی کہ بچوں سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں۔" سائرہ امی سے کہہ رہی تھی۔

"اور فارعہ کیسی ہے؟" امی' سائرہ سے اس کی دو سال کی بیٹی کا پوچھ رہی تھیں۔

"جی امی' فارعہ ٹھیک ہے' اسے میں سمعیہ کے پاس چھوڑ دوں گی وہ علیزہ کے ساتھ مگن رہتی ہے۔" سائرہ بولی۔ اسی وقت ہارن کی آواز سنائی دی۔

"اچھا امی یہ آگئے ہیں' میں عاشر کو لے کر جا رہی ہوں واپس آکر آپ سے بات کروں گی۔" سائرہ جلدی سے بولی۔

"اللہ کی حفاظت میں۔" امی نے دعا دی اور فون بند کر دیا۔ سائرہ اور سمعیہ کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ دونوں ہی ماشاء اللہ اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ سائرہ کے دو بچے اور سمعیہ کی ایک بیٹی تھی۔ دونوں اکثر مل کر ہی میکے آتیں۔ سمعیہ اور فراز کی تو اس عرصے میں چھوٹی موٹی کھٹ پٹ ہوئی بھی' لیکن سائرہ اور سجاد کی تو مثالی زندگی تھی۔ امی اکثر سائرہ سے پوچھتیں اور سائرہ ہر دفعہ ہی ہنس کر امی کو مطمئن کرتی۔ سجاد کے رشتے سے وہ جتنا ڈر رہی تھیں اللہ نے اس کے برخلاف ہی کیا تھا۔ سجاد نا صرف ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا بلکہ وہ ایک سعادت مند بیٹا اور داماد بھی تھا۔ امی اور ابو جتنے مطمئن اس سے تھے اتنے تو فراز سے بھی نہ تھے کہ وہ کبھی کبھی لاپرواہی برت لیا کرتا تھا' لیکن سجاد کا معاملہ بالکل مختلف تھا وہ ہر رشتہ کو احترام دیتا اور ہر ایک سے ہی محبت سے ملتا۔

امی تو اسے سائرہ کے صبر اور اس کے خلوص کا انعام ہی کہتیں اور کبھی کبھی اس لڑکی پر افسوس بھی کرتیں کہ کیسا بہترین شوہر اس نے ٹھکرایا تھا' لیکن پھر ساتھ یہ خیال بھی آتا کہ اگر وہ نہ جاتی تو۔ اس کے گھر چھوڑنے کے بعد ہی تو ان کی سائرہ کا گھر بنا تھا۔ اللہ کی مصلحت اللہ ہی جانے۔ یہ دنیا کا کارخانہ اسی طرح تو چل رہا ہے ایک جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا آجاتا ہے اور اسی طرح ایک کے بعد دوسرے کے لیے راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

چالیسویں قسط

نبیلہ عزیز

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دونوں بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے دوران بڑے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آویز شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

"یہ… یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" عبداللہ بھی ششدر سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"میرا خیال ہے کہ مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" دل آور کا لہجہ حد سے زیادہ مضبوط ہو رہا تھا۔
"کیا تمہارے خیال میں شادی بیاہ یا نکاح وغیرہ بھی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ جب چاہا نکاح کرلیا اور جب چاہا طلاق کا شوق پورا کرلیا؟ واہ یار… عجیب منطق ہے تمہاری…؟"
عبداللہ علیزے کی طلاق کا سن کر خود پہ کنٹرول نہیں کرسکا تھا۔
"طلاق کا مطالبہ وہ کررہے ہیں۔" دل آور نے اسے یاد دلایا۔
"تو کیا نکاح کا مطالبہ بھی انہوں نے کیا تھا؟" عبداللہ کے لہجے میں خفگی تھی۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" دل آور نے پلٹ کر عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کرچکے ہو اب اسے بھگتو… تمہارے اس طرح ہاتھ اٹھا دینے سے اور ملک چھوڑ کر چلے جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔" عبداللہ اب دل آور پہ غصہ ہو رہا تھا اور دل آور کے چہرے پہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ کرچکا ہوں میں اسے بھگت نہیں رہا…؟ ہونہہ… غلط فہمی ہے تمہاری، تمہیں کیا پتا کہ میں کیا کیا بھگت رہا ہوں اور اس بھگتنے کے چکر میں مجھ پہ کیا کیا بیت رہی ہے؟"
دل آور نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تھپکتے ہوئے بڑے زہرخند سے لہجے میں کہا تھا۔
"اگر ایسی بات ہے تو تم صاف بات کیوں نہیں بتاتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ سارا چکر، یہ سارا قصہ کیا ہے آخر…؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" عبداللہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کی تھی اور دل آور اپنی جگہ پہ کھڑے کھڑے چپ ہو کے رہ گیا تھا، لیکن آخر کب تک…؟
فی الحال کچھ تو کہنا ہی تھا، تبھی وہ ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا تھا۔
"مجھے سنبھلنے کا وقت دو… بس چند دن کا وقت میرا وعدہ ہے تم سے… تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔"
دل آور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے وعدہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اس کے وعدے پہ اعتبار کرتے ہوئے چپ ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اس چپ کو کئی دن گزر گئے تھے، مگر پھر بھی ان دونوں نے دوبارہ اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"جودت… جودت…! رکو… کہاں جارہے ہو؟ مجھے جیولر کے پاس جانا ہے۔" جودت تیار ہو کر بہت عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر کوریڈور کراس کررہا تھا جب ثروت بیگم نے اسے پیچھے سے پکارتے ہوئے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔
"ایم سوری… میں اس وقت اپنی یونیورسٹی کے کسی کام سے جارہا ہوں، مجھے اس سائیڈ پہ نہیں جانا جس سائیڈ پہ آپ جارہی ہیں اس لیے پلیز آپ مبارک خان کو ساتھ لے جائیں، وہ آپ کو واپس بھی لے آئے گا، میں تو صرف ڈراپ ہی کروں گا نا…؟"
اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن ثروت بیگم بھی آخر ماں تھیں "فوراً" ہی اس کے گریز پہ کچھ مشکوک سی ہو گئی تھیں۔
"اب یونیورسٹی کا کیا کام ہے تمہیں…؟ تم تو آج کل یونیورسٹی سے فری پھر رہے ہو؟" انہوں نے جان بوجھ کر اسے کریدا تھا۔

"بس ہے ایک کام، آکر بتادوں گا… ابھی میں جلدی میں ہوں۔" جودت ان کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا پلٹ کر ہوا ہو گیا تھا اور ثروت بیگم اس کے پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔
"کرتی ہوں تمہارا بندوبست… بس ایک بار آذر کی شادی سے فارغ ہو جاؤں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی مبارک خان کی طرف چل دیں اور وہ انہیں دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ٹھہرو مریم… میں تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔" وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو کر نکل رہی تھی جب عدیل نے اسے روک دیا تھا۔
"آج جلدی جارہے ہیں آپ…؟" مریم صحن میں ہی رک گئی تھی۔
"ہاں… وہ دراصل آج مجھے نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، شوروم کے کسی کام کے سلسلے میں۔"
عدیل بھی جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا اور پھر فاروق نیازی سے ملنے کے بعد باہر نکل آیا تھا۔
"او کے ابی! اللہ حافظ… ہم ان شاء اللہ کل شام تک واپس آجائیں گے اور اگر کام ختم نہ ہوا تو ہم لیٹ بھی ہوسکتے ہیں، لیکن پلیز آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں فون کرتا رہوں گا۔" عدیل ماں سے مل کر انہیں تسلی دیتے ہوئے مریم کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اور گلی میں نکلتے ہی بائیک اسٹارٹ کرلی تھی۔
"کیا آپ بائیک پہ اسلام آباد جائیں گے…؟" مریم عجیب احمقانہ سا سوال کر بیٹھی تھی اور اپنے اس سوال کے بعد خود ہی پچھتائی بھی تھی کیونکہ عدیل ایک بھرپور قسم کا قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
اور وہ جان گئی تھی کہ یہ قہقہہ اس کی بے وقوفی پہ لگایا گیا ہے۔
"ہم نے آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے کسی ریس میں حصہ لینے کے لیے نہیں جانا کہ ہم لوگ بائیک لے کر نکل کھڑے ہوں۔" وہ اس کے اس احمقانہ سے سوال سے جی بھر کے لطف اندوز ہوا تھا۔
"تو پھر بائیک لے کر کیوں جارہے ہیں؟" اس کے سوال میں اب بھی نا سمجھی اور بے وقوفی کی آمیزش موجود تھی
"افف پاگل لڑکی… ! میں بائیک لے کر شوروم جارہا ہوں، وہاں بائیک چھوڑ جاؤں گا اور وہاں سے گاڑی میں نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جاؤں گا، بس اتنا سا چکر ہے اور تمہیں سمجھ میں نہیں آرہا۔"
عدیل نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا تھا اور مریم بھی سمجھ آجانے پہ مسکرا اٹھی تھی۔
"نبیل صاحب کے ساتھ جارہے ہیں تو یہ صاحب کہاں ہیں؟ ان سے ملاقات ہوئی؟"
"ہاں… ہوتی رہتی ہے۔"
"تو انہیں ہماری بھابھی کب بنائیں گے؟" مریم نے شرارت سے پوچھا۔
"جب تم لوگوں کے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔" عدیل کا جواب سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔
"ارے نہیں بھائی… ابھی تو بہت دیر ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔
"کوئی بات نہیں میں انتظار کرلوں گا۔"
"لیکن آپ انہیں پرپوز تو کردیں نا، تاکہ انہیں اور ان کے گھر والوں کو پتا تو چل جائے کہ کوئی ان کو کتنا چاہتا ہے۔" مریم نے اسے ایک ہلکا پھلکا سا مشورہ دیا تھا لیکن وہ یہ مشورہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا۔
"کروں گا پرپوز…! لیکن تب جب میں اس کے قابل ہو گیا جب مجھے اس کے گھر والوں سے اس کا ہاتھ مانگتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوگی کہ میں اپنی اوقات سے اونچی جگہ پہ ہاتھ مار رہا ہوں۔"
"لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ ایسی سوچ رکھنے والے لوگ ہوں گے؟" مریم اکیڈمی کے سامنے بائیک رکتے

ہی بائیک سے اتر آئی تھی۔

"لیکن میں تو ایسی سوچ رکھتا ہوں نا، خیر چھوڑو اس بات کو۔۔۔ تم اندر جاؤ ان شاء اللہ کل گھر پہ ہی ملاقات ہوگی۔" عدیل نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے بائیک کا رخ موڑ لیا تھا اور مریم اس کے سفر کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوئی اکیڈمی کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

اور ان کو گھر سے لے کر اکیڈمی تک فالو کرنے والا جودت اور اس کے دونوں ساتھی دانت پیستے ہوئے رہ گئے تھے کیونکہ ان کے ہاتھ سے موقع ضائع ہو گیا تھا اب انہیں دو بجے کا انتظار کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹھیک سوا دو بجے وہ اکیڈمی سے باہر نکل آئی تھی۔

اور اس کی تاک میں بیٹھے شکاری فوراً" ہی الرٹ ہو گئے تھے۔

"اترو۔۔۔" وکی نے جودت کو اشارہ دیا کیونکہ مریم بس اسٹاپ کی طرف جانے والے راستے پہ قدم بڑھا چکی تھی۔ اس لیے جودت بھی فوراً" ہی گاڑی سے اتر آیا تھا اور اس نے بھی مریم کے پیچھے ہی قدم بڑھا دیے تھے اور بالآخر اس کے بے حد قریب جا پہنچا تھا۔

"ہیلو! کہاں جا رہی ہو؟" اپنے عقب میں اور اپنے بے حد قریب ہی جودت آفندی کی آواز سن کر وہ چلتے چلتے کرنٹ کھا کے پلٹی تھی۔

"تم۔۔۔؟" مریم نجانے کیوں یکدم ہی خوف زدہ سی ہو گئی تھی' حالانکہ وہ اتنی خوف زدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں میں۔۔۔ میں نے سوچا جہاں جا رہی ہو۔۔۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" وہ جان بوجھ کر اسے ہراساں کرنے اور خود لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"م۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو اپنے گھر جا رہی ہوں۔۔۔" مریم کی چھٹی حس اسے پہلے سے ہی خطرے کے الارم سنانا شروع ہو گئی تھی۔

"اوہ یعنی میں تمہارے گھر نہیں جا سکتا۔۔۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں تم تو میرے ساتھ جا سکتی ہو نا؟" وہ خاصی لاپروائی سے کہہ رہا تھا اور مریم اس کے الفاظ پہ چونک گئی تھی۔

"میں سمجھی نہیں؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"سمجھا دوں گا' ایک بار میرے ساتھ تو چلو۔۔۔" اب جودت کا لہجہ خباثت میں بدلنے لگا تھا۔

"ک۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"مطلب کہ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اسی طرح ایک دن گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا لیکن بڑی عزت' بڑی دیانت اور بڑی شرافت کے ساتھ۔۔۔ مگر تمہیں وہ شرافت' وہ دیانت اور وہ عزت راس نہیں آئی تھی اور تمہیں نہیں پتا تھا کہ منصور حسین کون ہے۔"

وہ دانت پیس کر بولا تھا اور مریم اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آج نشے اور خمار کی بجائے غصے کی لالی دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گئی تھی۔

"لیکن مجھے تو اب بھی نہیں پتا کہ منصور حسین کون ہے؟" اس نے پھر سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔

"اوہ۔۔۔ تو کیا تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ عدیل عمر نیازی کون ہے؟" وہ لفظ چبا کر پوچھ رہا تھا۔

"و۔۔۔ وہ تو میرے بھائی ہیں۔" مریم خود پہ کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

"ہوں تو اگر تمہیں یہ پتا ہے کہ عدیل عمر نیازی تمہارا بھائی ہے تو تمہیں یہ بھی پتا ہو گا کہ منصور حسین کون ہے اور ولی آور شاہ کون ہے؟" جودت کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں لگ رہا تھا اور ولی آور شاہ کے نام پہ مریم کا رنگ متغیر ہو گیا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔

"گاڑی میں بیٹھو۔۔۔" وکی اور کامی دونوں گاڑی ان کے برابر لا چکے تھے اور جودت نے تیور بدلتے ہی اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ! ہرگز نہیں۔" وہ بدک کے پیچھے ہٹی لیکن وہ ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھا اور جیب سے رومال نکال کر اس کے منہ پہ رکھ دیا تھا اور ساتھ ہی اس کی احتجاجی کارروائی سست پڑتے ہی وہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر گاڑی کے پچھلے دروازے سے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تھا اور مریم اس کے رحم و کرم پہ اس کی گود میں آ پڑی تھی اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔

"چلو۔۔۔" اس نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے وکی کو اشارہ کیا تھا اور اس نے گاڑی ہواؤں میں چھوڑ دی تھی اور پھر تینوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"مریم فاروق نیازی۔۔۔ !" جودت نے خباثت سے کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا تھا اور پھر اپنی انگلیوں سے اس کے گداز رخساروں کو چھونے لگا تھا۔

"بہت ترسایا ہے تم نے۔۔۔ تمہیں چھونے کے لیے بہت ترپا ہوں میں۔۔۔ اور آج تم میرے ہی بازوؤں میں میرے ہی رحم و کرم پر ہو اب میں چاہوں تو کیا کیا نہیں کر سکتا۔"

وہ بڑی کمینگی سے کہتا اس کے کانوں کے قریب سرگوشیاں سی کر رہا تھا اور وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔

"آج کیا کیا کرو گے۔۔۔؟" وکی نے گردن موڑ کر جودت کو دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ آج نہیں۔۔۔ آج کچھ نہیں کروں گا۔۔۔ کیونکہ آج میری مام کو میرے گھر سے نکلنے پہ شک ہو گیا ہے اس لیے آج کی رات میں گھر جاؤں گا اور اب جو بھی کروں گا کل رات کو ہی کروں گا۔" جودت نے فوراً" ہی نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تو پھر آج کی رات ہمیں دے دو۔۔۔" کامی نے آنکھ دبائی۔

"شکار میں پہلا نوالہ شیر کا ہی ہوتا ہے میرے یار۔۔۔ بچا کچھا کھانے کی عادت نہیں ہے۔" اس نے کافی سختی سے کہا تھا اس لیے وہ دونوں ہی چپ ہو گئے تھے اور جودت اسے سائم کے فلیٹ میں چھوڑ کر چابی اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ اسے ان کی ہوس پہ کوئی اعتبار نہیں تھا۔ اور وہ دونوں اس کی چالاکی پہ ہاتھ ملتے رہ گئے تھے' انہیں جودت آفندی سے اس قدر بے مروتی کی امید ہرگز بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بڑا فراخ دل آدمی تھا لیکن مریم فاروق نیازی کے معاملے میں نہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی کورٹ سے تھکا ہارا واپس آیا ہی تھا کہ اس کے گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ بجنے لگی تھی اور اس نے سیڑھیوں پہ قدم رکھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پلٹ کر فون ریسیو کر لیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔ !" اس کا لہجہ گمبھیر اور آواز بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ ! کیسے ہو؟" دوسری طرف کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا تھا اور یکدم فون سیٹ کی سی ایل آئی کی طرف دیکھا' نمبر بڑی حویلی کا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟ آسیہ آفندی بات کر رہی ہوں۔" آسیہ آفندی نے اس کی خاموشی فوراً" نوٹ کی

تھی۔
"جی۔۔۔ پہچان گیا ہوں آپ بتائیں کوئی حکم؟" اس نے بڑے تحمل اور بڑی شرافت سے استفسار کیا تھا۔
"میں نے تمہیں بڑی حویلی بلانے کے لیے فون کیا ہے۔" آسیہ آفندی بڑا ناپ تول کر بول رہی تھیں۔
"خیریت۔۔۔؟" وہ بھی صبر و برداشت کی حد کر رہا تھا۔
"ہوں! خیریت ہی ہے۔۔۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"
"ہونہہ۔۔۔ آپ نے اپنے ہزبینڈ سے پوچھا وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں؟" اس کے الفاظ نوکیلے ہونے لگے تھے۔
"وہ بول نہیں سکتے۔۔۔" آسیہ آفندی بھی تحمل کے دائرے میں رہ کر ہی بات کر رہی تھیں۔
"سن تو سکتے ہیں نا۔۔۔؟" وہ زہر خند ہوا۔
"سننے کے لیے ہی تو تمہیں بلا رہے ہیں۔"
"لیکن میں کچھ بھی سنانا نہیں چاہتا آپ نے جو مطالبہ وہاں کرنا ہے' وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔" ول آور نے جانے سے انکار ظاہر کر دیا تھا۔
"لیکن میں مطالبے سے پہلے کچھ الجھنیں سلجھانا چاہتی ہوں۔"
"مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ان الجھنوں کو سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ جائیں گی۔"
"یہ میرا مسئلہ ہے۔" وہ لاپروائی سے بولیں۔
"یہ آپ کا مسئلہ ہے' اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔" وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا۔
"بہرحال جو بھی ہے میں چاہتی ہوں کہ تم آج رات کا کھانا بڑی حویلی آکر ہی کھاؤ ہم انتظار کریں گے۔" آسیہ آفندی نے اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہا تھا۔
"ایم سوری" اس نے انتہائی مختصر سے الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔
"کیوں۔۔۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو تمہارے قدموں کو بڑی حویلی آنے سے روک رہی ہے؟" وہ کچھ عجیب سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔
"بھرم۔۔۔!" اس نے یک لفظی جواب دیا۔
"بھرم۔۔۔؟" وہ نا سمجھی سے بولیں۔
"ہاں بھرم۔۔۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے آنے سے بہت سارے بھرم ٹوٹیں گے اور جہاں بھرم ٹوٹتے ہیں وہاں دل تو بے آواز ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔" وہ طنزیہ سا بولا تھا۔
"میں جانتی ہوں کہ تم وکیل ہو۔" ان کا اشارہ اس کی باتوں اور اس کی دلیلوں کی طرف تھا۔
"اور آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ میں ہار بھی چکا ہوں۔" وہ استہزائیہ سا ہنسا۔
"تم نے اپنی ہار خود تسلیم کرلی ہے' کسی منصف نے فیصلہ نہیں سنایا ابھی تک۔" انہوں نے بھی دلیل دی تھی۔
"کیونکہ میں حقیقت پسند آدمی ہوں' وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہوں چاہے وہ میری ہار ہی کیوں نہ ہو؟" وہ کافی مضبوطی سے بول رہا تھا۔
"پھر بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو فیس کرنے سے گھبرا رہے ہو؟" وہ حیران ہوئیں۔
"انسان ہوں گھبرا بھی سکتا ہوں کیونکہ حقیقت بہت سفاک ہوتی ہے۔" وہ تلخ ہو رہا تھا۔
"لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم گھبراؤ مت اور حقیقت کو فیس کرو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے

کچھ ایسا جو تمہیں بہت اذیت دیے ہوئے ہے۔" آسیہ آفندی کے لہجے میں نرمی جھلکی تھی۔
"مجھے اذیت میں ہی رہنے دیں' ورنہ آپ اذیت میں آجائیں گی۔" اس نے سر جھٹکا۔
"کیا اگر زہرہ تمہیں اس طرح بلاتی تو تم تب بھی نہ آتے؟" یہ ان کا آخری پوائنٹ تھا جس کو انہوں نے بالآخر استعمال کر ہی لیا تھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ول آور کا دل جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں جا گرا تھا۔
"میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔۔۔ اللہ حافظ۔" انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور ول آور ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ آخر انہوں نے کس دعوے سے یہ بات کہہ کر فون بند کیا ہے۔
"آخر کس دعوے سے۔۔۔؟"
وہ سوچتا ہوا اور سلگتا ہوا سا اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا اور اپنی کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے سگریٹ بھی سلگا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نبیل ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا عدیل گاڑی میں بجتے میوزک اور نبیل سے ہلکی پھلکی گپ شپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔
اس نے موبائل نکال کر دیکھا شہریار کا نمبر تھا اور اس نے سی ڈی پلیئر کا والیوم کم کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی کیونکہ شہریار نے بہت دنوں بعد اسے کال کی تھی۔
"ہیلو استاد۔۔۔! کیسے ہو؟" شہریار کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔
"ٹھیک ٹھاک۔۔۔! اللہ کا بڑا احسان ہے یار۔" عدیل بھی جواباً خاصے فریش لہجے میں بولا تھا۔
"مجھے کچھ بتانا تھا اسی لیے فون کیا ہے۔" شہریار کی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔
"ہاں بتاؤ۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔" عدیل ہمہ تن گوش ہوا تھا۔
"مجھے جاب مل گئی ہے۔" اس نے فوراً خوشخبری سنائی۔
"او سچ۔۔۔" عدیل خوشی سے چہکا تھا۔
"ہاں استاد سچ۔۔۔" وہ بھی اپنی خوشی کا اظہار کافی کھل کے کر رہا تھا۔
"بہت بہت مبارک ہو یار' مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تمہاری جاب کا سن کر۔" عدیل کو واقعی بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اس کا اندازہ اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔
"خیر مبارک استاد! میرے گھر والوں کو بھی بہت خوشی ہو رہی ہے اور اسی خوشی میں میری اماں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔۔۔ یہ لیں اماں سے بات کریں۔"
شہریار نے باتوں باتوں میں آناً فاناً اپنا موبائل لے کر اپنی امی کو پکڑا دیا تھا اور عدیل سفر کے دوران نبیل کے ساتھ ماحول کی نزاکت کے خیال سے انکار کرتے کرتے رک گیا تھا کیونکہ تب تک فون ان کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔
"ہیلو۔۔۔" دوسری طرف سے شہریار کی امی کی آواز سنائی دی تھی۔
"السلام علیکم آنٹی۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟ بہت بہت مبارک ہو آپ کو' شہریار کی جاب کا مسئلہ حل ہو گیا۔" عدیل کو مجبوراً بڑی خوش اخلاقی اور خوش دلی سے پیش آنا پڑا تھا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو۔۔۔ اللہ نے بڑے عرصے بعد اتنی

بڑی خوشی دی ہے اور اسی خوشی میں ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ اگر ایک اور خوشی مل جاتی تو اس خوشی کا مزا دوبالا ہو جاتا۔" انہوں نے جیسے تمہید باندھی تھی۔

"ایک اور خوشی ... میں سمجھا نہیں؟" عدیل واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"وہ دراصل بیٹا ہم لوگ تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ ایمن بیٹی سے ملنے کے لیے۔" انہوں نے ایمن کا نام واضح کرو بنا ہی مناسب سمجھا تھا تاکہ عدیل بھی آسانی سے سمجھ جاتا۔

"ایمن بیٹی سے؟ آنٹی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔" عدیل اب بھی سمجھ اور نا سمجھی کے دائرے میں ہی ڈول رہا تھا۔

"ارے بیٹا! میں ایمن کے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہتی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ ایمن میرے شہریار کی دلہن بنے۔ اس لیے سوچا کہ تمہاری امی اور ابو سے بھی ملاقات ہو جائے' آخر ہم نے انہی کے در پہ تو سوالی بن کر جانا ہے۔" انہوں نے آخر صاف لفظوں میں کہہ ہی دیا تھا اور عدیل ان کے منہ سے ایمن کے رشتے کی بات سن کر خوشی اور حیرت سے بے یقین سا ہو گیا تھا۔

"ہیلو بیٹا! ... تم چپ کیوں ہو گئے ہو ...؟"

"ارے نہیں نہیں آنٹی ...! ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں دراصل اپنے آفس کے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا ہوں' راستے میں ہوں' اس لیے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا' البتہ آپ ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں تو موسٹ ویلکم آپ جب چاہیں آسکتی ہیں' باقی باتیں آپ آئیں گی تو وہ بھی ہو جائیں گی۔" عدیل نے فوراً ہی بات سنبھالی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا! تم اسلام آباد سے واپس آجاؤ تو ہم آجائیں گے' لیکن مٹھائی کے ساتھ آخر شہریار تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔" وہ بڑی اپنائیت سے بولی تھیں اور عدیل مسکرا کے رہ گیا تھا۔

"جی آنٹی! اگر اللہ تعالیٰ نے میری بہن کا نصیب شہریار کے نصیب سے جوڑا ہے تو میں اپنی بہن کو ایک خوش نصیب لڑکی سمجھوں گا۔ کیونکہ شہریار واقعی بہت اچھا لڑکا ہے اور میرا دیکھا بھالا بھی ہے۔ وہ باکردار ہے' دیانت دار ہے' محنتی ہے' غیرت مند ہے' اس لیے ہمیں اور کیا چاہیے' لیکن پھر بھی آخری فیصلہ امی اور ابو کا ہی ہو گا' میں ان سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گا۔" عدیل نے انہیں بھرپور تسلی دی تھی کیونکہ وہ زیادہ نخرے دکھا کر یا موڈ بنا کر انہیں بددل نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اللہ کے سامنے کوئی ناشکری دکھانا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ہم دوبارہ فون کرلیں گے۔ تم خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ اللہ حافظ۔" انہوں نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل اللہ کی اتنی کرم نوازی پہ دل ہی دل میں شکر گزار ہو رہا تھا کہ چلو شکر ہے کہ کوئی تو ابتدا ہوئی۔

"لڑکا کیسا ہے ...؟" نبیل بھی اس کی ساری گفتگو سن چکا تھا اور اس نے جان بوجھ کر ہی اس کی بات میں انٹرسٹ ظاہر کیا تھا۔

"اچھا ہے ... بلکہ بہت اچھا ہے میرے ساتھ ہی ورکشاپ میں کام کرتا تھا' جیسے ہی ورکشاپ بند ہوئی۔ ہم لوگ بے روزگار ہو کر رہ گئے' لیکن پھر بھی ہمت کسی نے بھی نہیں ہاری اور آج اسے بھی جاب مل گئی ہے۔ اچھی جاب ہے وہ مطمئن اور خوش ہے اور اس کے گھر والے اس کی اس خوشی کے بعد اس کا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔" عدیل بتاتے بتاتے آخر میں چپ ہو گیا تھا۔

"تمہاری سسٹر کے ساتھ؟" نبیل جان بوجھ کر ایسے سوال پوچھ رہا تھا۔

"جی!" وہ آہستگی سے بولا۔

"تو پھر کیا خیال ہے تمہارا اس رشتے کے بارے میں؟" اتفاقاً ہی یہ بات چھڑ گئی تھی تو وہ اس سے اس کے سارے خیالات جاننا چاہتا تھا۔

"میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ امی ابو بھی کوئی انکار نہیں کریں گے کیونکہ ایسے اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے کیا ہوا جو وہ مالی لحاظ سے تھوڑا ویک ہے' لیکن باقی ہر لحاظ سے تو بہت اسٹرانگ ہے نا ... نیت اور کردار کا کھرا ہے' جس میں اسی چیز پہ مطمئن ہوں اور مجھے پتا ہے کہ وہ میری بہن کو ہمیشہ بہت خوش رکھے گا اور اگر نہ بھی رکھ سکا تو اللہ مالک ہے' زندگی میں اپ ڈاؤن تو آتے ہی رہتے ہیں' ماں باپ کے گھر میں مشکل اٹھانا پڑے تو لڑکیاں برداشت کرلیتی ہیں تو سسرال جا کر کوئی مشکل آجائے تو انہیں وہ بھی برداشت کرنی چاہیے صبر اور ہمت کے ساتھ۔"

عدیل کی باتوں نے نبیل کے ذہن کی رہی سہی کشمکش بھی دور کر دی تھی اور وہ چند سیکنڈز میں ہی ریلیکس ہو گیا تھا۔

"ہوں ... اچھی سوچ ہے تمہاری' مجھے بہت خوشی ہوئی ہے سن کر' ہر ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ایسی ہی مثبت سوچ رکھنی چاہیے' ان شاء اللہ' اللہ نصیب اچھے کرے گا۔" نبیل نے اس کے خیالات اور اس کی سوچ کو سراہا تھا۔

"آمین دعا کیجیے گا۔" عدیل آہستگی سے بولا۔

"اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟" نبیل نے گردن موڑتے ہوئے اسے اک نظر دیکھا تھا۔

"کیا مطلب ...؟" عدیل ٹھٹکا۔

"یہی شادی وغیرہ کے سلسلے میں ... کیا پلاننگ ہے تمہاری؟" نبیل اپنے مطلب کی بات جاننا چاہتا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

"بولو نا ... کچھ تو سوچ ہی رکھا ہو گا؟" نبیل اسے بولنے پہ اکسا رہا تھا۔

"نہیں ... ابھی کچھ بھی نہیں سوچ رکھا' ابھی مجھے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا ہے اور ابھی مجھے اپنا گھر اسٹیبلش کرنا ہے اس لیے اپنے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا اور نہ ہی کبھی کوئی پلاننگ کی ہے۔" عدیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بارے میں بھی سوچو کیونکہ میں بھی اپنی بہن کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔"

نبیل نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا دیا تھا اور عدیل نے اس کرنٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یکدم نبیل کی طرف دیکھا تھا وہ ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا اور بہت پر سکون نظر آ رہا تھا۔

"یہ ... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" عدیل ہکلا گیا تھا۔

"میں جو بھی کہہ رہا ہوں بہت زیادہ سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔"

"مم مگر نبیل صاحب ...!"

"میں جانتا ہوں عدیل تم حدیبہ میں انٹرسٹڈ ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے' بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہو گا کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو ... اور محبت ایک بے اختیاری جذبہ ہے یہ کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں انسان کی اپنی کوئی مرضی اور کوئی کوشش شامل نہیں ہوتی' اس لیے تم دونوں کی کوئی غلطی نہیں ہے' آخر تم لوگ بھی انسان ہی ہو' لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ محبت ایک مضبوط رشتے میں بدل جائے تو زیادہ اچھا رہے گا اور ہمیں بھی کچھ سکون مل جائے گا۔"

نبیل نے بڑے ہی اچھے اور احسن طریقے سے ساری بات واضح کرتے ہوئے عدیل کو حیران پریشان چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے یکے بعد دیگرے دو جھٹکے لگ چکے تھے اور ان دو جھٹکوں نے ہی اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟"

نبیل نے ذرا کی ذرا سامنے اسکرین سے نظریں ہٹا کر عدیل کی سمت دیکھا تھا' عدیل نظریں جھکا گیا تھا۔

"لیکن میں فی الحال خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں سوالی بن کے آپ کے در پہ آسکوں۔" وہ بہت آہستگی سے بول رہا تھا۔

"تم کس قابل ہو اور کس قابل نہیں ہو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ باکردار ہو' دیانت دار ہو' محنتی ہو اور کیا چاہیے ہمیں؟ یہی ساری کوالٹیز ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے گنوائی ہیں اور یہی ساری کوالٹیز تم میں آل ریڈی موجود ہیں پھر تم کیوں ہمارے در پہ سوالی بن کے نہیں آسکتے؟ جبکہ میں نے تو تمہیں سوالی بننے کی مہلت ہی نہیں دی' تمہارا ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے اور وہ فیصلہ بیٹھے بیٹھے کر دیا ہے جس کو سوچنے میں اور کرنے میں لوگ سالوں اور مہینوں لگا دیتے ہیں' ماما سے مشورہ کیا ہے نہ ہی ڈیڈ اور... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ صرف وہی دونوں ہیں جو زیادہ انوالو ہیں اس معاملے سے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن کر انہیں بھی بہت خوشی ہوگی اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

نبیل بہت تحمل اور... انہایت سے بات کر رہا تھا اس لیے اب عدیل کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا آخر وہ مزید کیا کہتا...؟

"تم بے شک فی الحال بارات لے کر نہ آؤ' لیکن ایک رنگ پہنا کر دحیہ کو اپنے نام سے منسوب کر لو تو یہ بھی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہوگا اور دونوں فیملیز میں ایک نئے رشتے کی ڈور بھی بندھ جائے گی۔" اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔

"ٹھیک ہو میں امی اور ابو سے بات کروں گا' وہ باقاعدہ پرپوزل لے کر آئیں گے آپ کے گھر اور پھر کسی روز رسم بھی کر لیں گی۔" عدیل نے ہامی بھر لی تھی۔

"اوکے... تو پھر اب... صاحب نہیں بلکہ نبیل بھائی ہونا چاہیے کیونکہ مجھے بھی تمہاری شکل میں اپنا ایک بھائی نظر آ رہا ہے' چھوٹا بھائی' جو اب ہمیشہ ہر غم اور ہر خوشی میں میرے شانہ بشانہ اسی طرح قدم بڑھائے گا اور ہر طویل سفر میں میرا ساتھ دے گا۔"

نبیل نے اس کے اور اپنے درمیان کی اجنبیت اور غیریت مٹانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور عدیل اس کی بات پہ مسکرا دیا تھا۔

"ان شاءاللہ...!" عدیل نے بڑے صدق دل سے کہا تھا۔

کیونکہ آخر اللہ تعالیٰ نے بیٹھے بیٹھے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دی تھی اور اس کی زندگی کے دو مشکل ترین کاموں کو اس کے لیے آسان بنا دیا تھا اور اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔

"اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو رحیم و کریم تو جو چاہے کر سکتا ہے بن مانگے بھی مرادیں پوری کر دیتا ہے۔" عدیل کا رواں رواں اللہ کے حضور شکر گزار اور مشکور ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یونہی راستے سے ہی واپس لوٹ جائے اور امی ابو اور مریم کو یہ دونوں خوشخبریاں جا کر سنائے' لیکن کیا کرتا اسے سفر میں نبیل کا بھی ساتھ دینا تھا اور اسے اب کسی بھی مقام پہ اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔

☆ ☆ ☆

امی پلیز...! چپ ہو جائیں... اگر ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہمارے لیے مزید مسئلہ کھڑا ہو جائے گا' ان کی طبیعت بگڑ گئی تو بہت برا ہوگا۔"

ایمن اور ایمان دونوں ہی عابدہ خاتون کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں' کیونکہ شام حد سے زیادہ گہری ہو چکی تھی اور مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔

انہوں نے ایک بار پی سی او سے اور ایک بار ساتھ والی کلثوم کے گھر سے مریم کے نمبر پہ کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی آف ہی مل رہا تھا اور ہر بار مایوس اور پریشان سی گھر واپس لوٹ آئی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور شام گہری سے بھی گہری ہوتی جا رہی تھی تو ان کا دل واہموں اور خدشوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے آ رہے تھے۔ "تو کیا کروں... چپ ہو کر بیٹھ جاؤں؟ وہ نہیں آئی تب بھی سکون سے کھانا کھا کر اپنے بستر میں جا کر سو جاؤں...؟" انہوں نے روتے روتے سسکیوں کے درمیان پوچھا تھا۔

"ہم ایسا کب کہہ رہی ہیں امی... لیکن پلیز خود کو سنبھالیں اور میرے ساتھ چلیں' ہم دوبارہ فون ٹرائی کرتے ہیں۔" ایمن نے انہیں سمجھانے کی سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"اور کتنا ٹرائی کریں گے...؟ چار بجے سے فون ٹرائی کرنا شروع کیا ہے' لیکن ایک بار بھی رنگ نہیں گئی' کال نہیں ملی اور نہ ہی فون آن ہوا ہے' پتا نہیں کیا ہوا ہے میری بچی کے ساتھ؟ نجانے کس حال میں ہوگی اور کہاں ہوگی ایسا کون سا حادثہ پیش آیا ہے کہ اس کی کوئی خبر ہی نہیں مل رہی؟" عابدہ خاتون بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"تو پھر ایسا کریں کہ بھائی کو فون کریں اور انہیں گھر بلا لیں۔" ایمان نے دوسرا مشورہ دیا۔

"کیسے بلاؤں اسے؟ اتنے گھنٹے تو اس کے سفر میں ہی کٹ جائیں گے اور یہ شام آدھی رات میں ڈھل جائے گی اور اگر شام آدھی رات میں ڈھل گئی تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا' ہم لٹ جائیں گے برباد ہو جائیں گے' ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا' عابدہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں ایمن اور ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے اور اپنی ماں سے لپٹ کر وہ دونوں بھی خوب روئی تھیں۔

اور پھر بڑی ہمت اور حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹی عدیل کو فون کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں' پی سی او ان کے گھر سے خاصا دور تھا اس لیے وہ دونوں اندر سے ڈر بھی رہی تھیں' لیکن افسوس کہ قسمت نے اس دفعہ بھی ساتھ نہیں دیا تھا' نبیل اور عدیل دونوں ہی میٹنگ میں تھے اور فون سائلنٹ پہ تھے اس لیے عدیل کو پتا ہی نہ چلا کہ ایمن اور امی اسے کال کرتی رہی ہیں۔

اور عدیل کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تو عابدہ خاتون کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی' وہ پاؤں گھسیٹتی ہوئی گھر آئی تھیں اور چارپائی پہ گرنے کے ساتھ ہی ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اب تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے دل آور شاہ کو کال کی تھی؟ کیا کہتا ہے وہ...؟"

آذر نے آفس سے واپس آتے ہی استفسار... کیا تھا اور آسیہ آفندی نے سیڑھیوں پہ ٹھٹکنے والی کومل کی طرف دیکھا تھا جو اپنی شادی کے دنوں میں بھی ٹھیک طرح سے خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔

اور وجہ کیا تھی' آسیہ آفندی بھی جان گئی تھیں۔

"ہاں... کی تھی کال' آ جائے گا کچھ دیر تک۔" انہوں نے بہت نپے تلے سے لہجے میں بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے آجائے تو بہتر ہو گا۔۔۔ آخر کچھ تو فائنل ہو' یہ معاملہ یونہی تو نہیں لٹکائے رکھنا ہم نے۔"
آزر کے لہجے میں غصہ اور خفگی تھی۔ جس پہ آسیہ آفندی نے اک نظر ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔
"وہ اس گھر میں آپ لوگوں کی لڑائی جھگڑے کے لیے یا پھر دشمنی کے لیے نہیں آرہا۔ مہمان بن کر آرہا ہے' میں نے اسے کھانے پہ انوائیٹ کیا ہے' جو بھی بات ہو گی' کھانا کھانے کے بعد ہو گی اور ساتھ ساتھ تم سب لوگ یہ مت بھولو کہ علیزے اب بھی اس کے نکاح میں ہے' اس کا حق اور اختیار ہم سے زیادہ بنتا ہے تو اب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے' اس لیے پلیز ہم سب کو بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہو گا۔" انہوں نے آزر کے تیور دیکھ کر ہی اسے پہلے سے سمجھا دینا بہتر سمجھا تھا۔
جس پہ آزر خاموش ہو گیا تھا اور سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی کومل کو اندر ہی اندر بہت خوشی اور تسلی ہوئی تھی کہ چلو شکر ہے کہ ابھی کوئی تو امید باقی ہے نا۔
"امی! آپ بھی یہ جانتی ہیں کہ علیزے اس کے ساتھ خوش نہیں ہے' یہ سارا کھیل زبردستی کا کھیل ہے اور اس نے یہ کھیل کیوں کھیلا ہے بس یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں اور اسی لیے تو اسے یہاں بلا رہے ہیں' آخر ہمیں کچھ تو پتا چلے ہم کیوں اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں۔" آزر طیش میں آگیا تھا اور خاموش ہو جانے کے بعد بھی ایک بار پھر بول پڑا تھا۔
"صبر۔۔۔ اور صرف صبر۔۔۔ جہاں اتنا وقت گزر چکا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی' ورنہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔"
انہوں نے آزر کو کچھ جتایا تھا اور وہ ان کی بات پہ مزید کچھ بھی کہے بغیر ضبط کرتا۔۔۔ اور اندر ہی اندر سلگتا ہوا سا آگے بڑھ گیا تھا اور کومل کا دل چاہا تھا کہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لے' انہوں نے بہت حقیقت پسندی سے کام لیا تھا آخر۔

☼ ☼ ☼

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے اسے حشر پہ نہ اٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی

بالآخر اس نے بڑی حویلی کے گیٹ پہ رکتے ہوئے گاڑی کے ہارن پہ ہاتھ رکھ ہی دیا تھا اور اس کی گاڑی کے ہارن پہ جہاں چوکیدار عارف نے ایک دم الرٹ ہو کر گیٹ کھولا تھا وہیں پہ حویلی کے باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ پہ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں الرٹ سے ہو گئے تھے۔
اس کی چمکتی دمکتی سرف بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی حویلی کے طویل اور انتہائی کشادہ سے ڈرائیو وے پہ آرکی تھی اور چوکیدار عارف "منصور حسین" کی پرسنالٹی اور رعب دیکھتا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کے اس سے ملے' لیکن پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کا وہیں رک گیا تھا اور ولی آور شاہ گاڑی سے اتر کر اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا لیکن اس کا ایک ایک قدم اس کی ذات پہ عذاب ثابت ہو رہا تھا۔
اس کے جسم کی رگیں پھٹ رہی تھیں اور دماغ میں الگ ابال سے اٹھ رہے تھے
لیکن پھر بھی وہ قدم اٹھا رہا تھا اور محشر کے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا' کیونکہ اس وقت بڑی حویلی اس کے لیے محشر کے میدان سے کچھ کم نہیں تھی۔
اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش بھی بہت کی تھی مگر نہیں۔۔۔
اسے اس روز حساب کا سامنا کرنے پہ مجبور کیا گیا تھا اور اسے آنا ہی پڑا تھا!

اور جب وہ آہی گیا تھا تو دیکھنے والوں کو ایک دم پتھر اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔
شاید اسی لیے آسیہ آفندی اسے کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھ کر خود کوریڈور کے دوسرے سرے پہ ہی رک گئی تھیں اور وہ طویل کوریڈور اپنے مضبوط قدموں سے طے کرتا ان کے قریب آگیا تھا۔
"السلام علیکم۔" ان کے سامنے رکتے ہوئے اس نے اپنی نظریں جھکالی تھیں۔
"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔" وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات کی فارملیٹی نبھا رہے تھے اور یہ بات وہ دونوں ہی جانتے تھے۔
"آپ کیسی ہیں؟ اور آپ کی صحت۔۔۔؟" اس نے بات بڑھانے کی کوشش کی تھی۔
"الحمد للہ۔ ٹھیک ہوں اور صحت بھی اچھی ہی ہے "آؤ" ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھیں اور ولی آور نے چپ چاپ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھادیے تھے۔
"بیگم صاحبہ! عائشہ بی بی نے کہا ہے کہ ولی آور صاحب کو لے کر بڑے صاحب کے کمرے میں ہی آجائیں۔" ان دونوں کے بڑھتے قدم رجو کی آواز پہ ہی رک گئے تھے اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ ولی آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا جبکہ وہ ان کے منہ سے کچھ سننے کا منتظر کھڑا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے تم چلو ہم آتے ہیں۔" انہوں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے رجو کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تھا۔
"آؤ وہیں چلتے ہیں' وقار سے بھی ملاقات ہوجائے گی تمہاری۔۔۔" انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اسے اب وقار آفندی کے بیڈروم کی طرف چلنے کا کہا تھا۔
اور ولی آور نے پہلی بار ایک اذیت بھری سانس کھینچتے ہوئے سرخم کردیا تھا اور ان کے ساتھ چل پڑا تھا پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے وقار آفندی کے بیڈروم میں داخل ہوئے تھے اور داخل ہوتے ہی اس کے قدم [illegible] اپنی جگہ جم سے گئے تھے کیونکہ سامنے ہی وقار آفندی کے سرہانے اس کی دشمن جاں اس کی اپنی زوجہ [illegible] تھی اور اس نے بھی اندر آتے ہوئے اپنے "مجازی خدا" کو نظریں اٹھا کر سرتاپا دیکھا تھا اور نظروں کا تصادم [illegible] ہی وہ نظریں چرا گئی تھی' نہ سلام کیا تھا' نہ دعا کی تھی۔
بلکہ کچھ اس طرح سے پوز کیا تھا کہ جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ بھی جو اسے اک نظر دیکھ کر اندر ہی اندر یکدم موم کی طرح پگھلا تھا۔ اس کے نظریں چرا لینے سے فوراً" ہی کسی پتھریلے پہاڑ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ جس پہ اب کچھ بھی اثر نہیں ہوسکتا تھا۔
یہاں تک کہ علیزے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں۔
کیونکہ وہ اس سے اور اس کی موجودگی کے احساس سے انجان ہوچکا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے سے لہجے اور اونچی آواز میں سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟" عائشہ آفندی صوفے سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی تھیں اور اس کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا تھا۔
"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے بڑے مختصر سے الفاظ میں جواب دیا تھا۔
"آؤ بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
"تھینک یو۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
"السلام علیکم۔" اچانک دانیال اور جودت بھی اندر آگئے تھے اور دانیال نے ولی آور کو دیکھ کر خود آگے بڑھ کے اس سے باقاعدہ مصافحہ کیا تھا۔

البتہ آذر وہاں پہلے سے موجود تھا' لیکن اس نے ولی آور سے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور نہ ہی ولی آور نے خود ایسی کوئی کوشش کی تھی۔
"بیٹھیے۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیے۔" ولی آور نے آسیہ آفندی کو وقار آفندی کے بیڈ کے قریب ہی کھڑے دیکھ کر بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا۔
"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے' وہ بس میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تم پہلے کھانا کھالیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم بھی تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔" آسیہ آفندی بیڈروم کے ماحول کی کشیدگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔
"بڑی حویلی کی طرف سے دعوت کا سن کر ساری بھوک ہی اڑ گئی تھی اس لیے فی الحال کوئی بھوک نہیں ہے۔"
اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"تو ٹھنڈا منگوالیتی ہوں۔"
"نو تھینکس۔ میری پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔"
"تو پھر آئے کیوں ہو؟" عائشہ آفندی ناراضی سے بولیں۔
"عدالت میں پیشی کے لیے۔" وہ بھی ڈرنے اور جھجکنے والا نہیں تھا۔
"اور تم جانتے ہی ہوگے کہ فیصلہ بھی آج ہی ہوگا۔" یہ آواز آذر کی تھی اور ولی آور نے آذر کی طرف دیکھا تھا۔
"کیسا فیصلہ؟" اس نے جان بوجھ کر سوال اٹھایا۔
"علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔" آذر نے طلاق کے فیصلے پہ زور دیا تھا۔
"علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔ لیکن وہ کیوں؟" وہ جیسے سب کچھ ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔
"کیونکہ علیزے تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔" ان دونوں کے سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ علیزے میرے ساتھ کیوں نہیں رہنا چاہتی؟ کیا میں برا ہوں اس لیے؟" وہ آذر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھ رہا تھا۔
"ہاں شاید۔" آذر نے کندھے اچکائے۔
"شاید نہیں یقیناً" میں بہت برا ہوں' لیکن پھر بھی بدکردار نہیں ہوں اور اس چیز کو میرا خیال ہے کہ علیزے سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔" اس کی بات پہ علیزے کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا۔ کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔
"تم کتنے باکردار ہو' یہ بات علیزے ہی نہیں ہم سب بھی کافی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" آذر نے کمرے میں موجود تمام افراد کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"میں علیزے کو یہاں سے لے گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ میں بدکردار ہوگیا تھا' ہونہہ۔ اگر ایک لڑکی کو سب کے سامنے محض اپنے ساتھ لے جانا بدکرداری ہے تو ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دیں گے آپ لوگ؟؟"
اس نے کہتے ہوئے آذر اور باقی سب کو بھی ایک سرسری سی نظر سے دیکھا تھا۔ لیکن آذر کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
"بتاؤ آذر آفندی کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دوگے؟ برا یا بد سے بھی بدتر؟" اس نے آذر آفندی کو بولنے پہ اکسایا تھا۔
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔
"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آپ لوگوں نے صرف آپ لوگوں نے مجھے یہ سب

کہنے پہ مجبور کردیا ہے ورنہ آپ لوگوں کی نظر میں کسی دوسرے کو گرا کر خود سرخرو ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا' لیکن مجھے مجبور کیا گیا ہے کہ میں حویلی آؤں اور اپنی اس گستاخ زبان سے وہ سارے راز عیاں کروں جن کو میں صرف اپنے آپ کے سامنے عیاں کرتے ہوئے بھی رو پڑتا ہوں۔ اور جل اٹھتا ہوں۔"

دل آور کی شکستہ سی آواز بات کرتے کرتے انتہائی مدھم پڑ گئی تھی اور اپنے بیڈ پہ ساکت پڑے وقار آفندی کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ نکلے تھے اور ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

"لیکن میں اور کوئی راز نہیں جاننا چاہتی۔ مجھے بس اتنا بتادو کہ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا تھا۔ کس گناہ کی سزادی تھی مجھے؟ کیا قصور تھا میرا؟ کیا قصور تھا آخر؟ بتاؤ مجھے؟"

دل آور کی بات سنتے سنتے علیزے پھٹ پڑی تھی اور دل آور نے اس کے سوال پہ یکدم نظریں اٹھا کرا سے بہت ہی زخمی نظروں سے دیکھا تھا یوں جیسے وہ بہت اذیت میں ہو۔

"میں بتانا نہیں چاہتا علیزے! اس بات کو رہنے دو۔" وہ پھر بھی گریز سے کام لے رہا تھا۔

"کیوں رہنے دوں؟ اس لیے کہ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟ تم جھوٹے ہو بدکردار ہو۔ بدنیت ہو۔" آذر نے بھی سارے ہی نشتر چبھو ڈالے تھے۔

"تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو تم بتاتے کیوں نہیں ہو۔؟" یہ سوال عائشہ آفندی کی طرف سے آیا تھا۔

"کیونکہ مجھے پتا ہے کہ یہاں بہت سارے رشتوں کے بھرم ٹوٹیں گے" اس نے پھر بھی ان سب کو باز رکھنا چاہا تھا۔"

"لیکن پھر بھی ہم سب سچ سننا چاہتے ہیں۔" دانیال نے بھی مداخلت کی۔

"سچ سننے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔" دل آور انہیں بار بار روک رہا تھا۔

"اور سچ بولنے کے لیے ہمت کی اور جرات کی ضرورت ہوتی ہے' جو فی الحال تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"آذر آفندی! میری ہمت اور میری جرات کو مت آزماؤ' میں تمہاری اس پوری حویلی کا تختہ الٹ کے رکھ سکتا ہوں' لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ زبان سے کچھ نہ کہوں' جو خدا کی طرف سے سزا جھیل رہا ہے اسے وہی سزا جھیلنے دوں۔ اب کسی اور سزا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر میری طرف سے۔"

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم بتاؤ' تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ آخر تم نے ایسا کیا کیوں تھا؟"

آسیہ آفندی بھی کہے بغیر نہیں رہ سکی تھیں اور دل آور نے محض اک سرسری سی نظر آسیہ آفندی پر ڈالی تھی اور پھر وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنے شوہر وقار آفندی سے پوچھیے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کس لیے سزادی تھی؟ کیا قصور تھا علیزے آفندی کا؟" اس نے وقار آفندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"وقار آفندی سے؟ مگر ان سے کیوں؟" ان سب کو تعجب ہوا تھا۔

"کیونکہ یہ گناہ گار ہیں' یہ بدکردار ہیں' بدنیت ہیں' یہ جھوٹے ہیں۔ یہ نفس کی لپیٹ میں آنے والے زانی ہیں۔"

وہ یکدم دھاڑا تھا اور ان سب کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" آذر کو دھچکا سا لگا تھا۔

"ہونہہ۔ میں ہی تو ہوش میں ہوں آذر آفندی۔ اس لیے تو بے سکونی کی زندگی جی رہا ہوں۔ اور میری زندگی کو بے سکون کرنے والا شخص یہ ہے۔ یہ وقار آفندی۔ بڑی حویلی کی سب سے بڑی اور معزز شخصیت۔ تم سب کے سرپرست۔ تم سب کے آئیڈیل ڈیڈ اور اس ملک کے کامیاب بزنس مین۔" وہ وقار آفندی کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور چند سیکنڈز یونہی ان کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نظروں کا زاویہ دوبارہ بدل دیا تھا اور اب اس

کی نظروں کا مرکز علیزے تھی۔

"تم جاننا چاہتی ہو نا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ اور تمہیں کس گناہ کی سزا دی تھی؟ تو پھر سنو آج۔"

اس نے ڈائریکٹ علیزے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"زہرہ بتول شاہ اور بابر شاہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے' بابر شاہ کی شادی ہو چکی تھی' جبکہ زہرہ بتول شاہ کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ اور ابھی ان کے کالج کا پریڈ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دل آور شاہ کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور دل آور شاہ کی ساری ذمہ داری زہرہ بتول شاہ پہ آ گئی تھی۔ وہ دل آور شاہ کے لیے ایک پھوپھی نہیں بلکہ ماں کی طرح ثابت ہوئی تھیں۔ اور اس چیز کو ان کی بچپن کی سہیلی عائشہ آفندی سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

عائشہ آفندی نے ان دنوں ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھانے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور ساتھ ساتھ انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا' لیکن زہرہ بتول شاہ نے دل آور شاہ کی خاطر اپنی مزید تعلیم کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا' کیونکہ وہ اسے گھر میں ملازمہ کے حوالے کرکے خود یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے عائشہ آفندی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور انہی دنوں ملک وجاہت علی کے گھر سے عائشہ آفندی کے لیے پرپوزل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وقار آفندی اور ملک وجاہت علی کی دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی۔

دوسری طرف عائشہ آفندی' اسرار آفندی اور اظہار آفندی کو ملک وجاہت علی کی بہن آسیہ علی بہت پسند آئی تھی اور وہ اسے بھابی بنانے کا خواب سجا بیٹھے تھے۔

جبکہ وقار آفندی اس رشتے سے انکاری تھے' وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے' مگر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ملک وجاہت علی کی بھی یہی خواہش ہے تو وہ دوبارہ پھر انکار نہیں کر سکے تھے' اور شادی کے لیے ہامی بھرلی تھی' اور یوں دونوں حویلیوں میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اور اپنی دوست کی شادی میں شریک ہونے کے لیے اور ان کی ہیلپ کرنے کے لیے زہرہ بتول شاہ کو وقتاً فوقتاً بڑی حویلی آنا پڑتا تھا اور عائشہ آفندی کی ہر خوشی اور ہر کام میں شریک ہونا پڑتا تھا اور اسی شرکت نے ان کی زندگی برباد کر ڈالی۔" وہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے رکا تھا اور کمرے میں موجود تمام افراد کا دم گھٹنے لگا تھا ان کی سانسیں تک رک گئی تھیں۔

عائشہ آفندی اور زہرہ بتول شاہ دونوں آسیہ علی کے لیے شاپنگ کرنے گئی تھیں اور واپسی پہ زہرہ بتول شاہ بھی بڑی حویلی ہی آ گئی تھیں اور بڑی حویلی کے ڈرائنگ روم میں انہوں نے اپنی شاپنگ کا سامان پھیلاتے ہوئے آسیہ علی کے مایوں کے لیے لایا ہوا دوپٹہ اپنی دوست زہرہ بتول شاہ کے سر پر ڈال دیا تھا اور وہیں پہ وقار آفندی کی نظر کسی اور نظر میں بدل گئی تھی' اور اس کا احساس زہرہ بتول شاہ کو بھی ہو گیا تھا۔

وہ فوراً" واپس آ گئی تھیں لیکن وقار آفندی کی نظر واپس کیسے آ سکتی تھی؟

پھر انہوں نے بار بار زہرہ بتول شاہ کے راستے میں حائل ہونا چاہا تھا' اور وہ ہر بار دامن بچا جاتی تھیں' اور یونہی کتراتے کتراتے اور دامن بچاتے بچاتے شادی کے دن قریب آ گئے تھے' وقار آفندی اس شادی سے انکار کر دینا چاہتے تھے مگر عائشہ آفندی کا خیال آتے ہی وہ اپنی اس حرکت سے رک جاتے تھے۔ کیونکہ اب عائشہ آفندی' وقار آفندی' آسیہ علی اور ملک وجاہت علی ایک ہی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور اگر یہ ڈور ٹوٹ جاتی تو وہ چاروں ہی بکھر جاتے' جو کہ وقار آفندی کو منظور نہیں تھا' اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وقار آفندی کو یہ شادی کرنا پڑی تھی اور یوں عائشہ آفندی بیاہ کر بڑی حویلی سے ملک حویلی چلی گئی تھیں اور آسیہ آفندی ملک حویلی سے بڑی حویلی آ گئی تھیں' سب کچھ بظاہر ٹھیک چل رہا تھا لیکن وقار آفندی کا ذہن اب بھی شادی سے پہلے والی خواہش میں اٹکا ہوا

تھا اور اس خواہش میں چار سال گزر گئے تھے۔

اور ان چار سالوں میں ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی البتہ عائشہ آفندی کے ہاں دانیال کی آمد ہو چکی تھی اور وہ تین سال تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ تب دل آور شاہ کی عمر ساڑھے چار سال ہو چکی تھی اور زہرہ بتول شاہ نے بابر شاہ سے مشورہ کرکے دل آور شاہ کو اسکول میں ایڈمٹ کروا دیا تھا اور خود فارغ رہنے لگی تھیں اور اسی فراغت سے تنگ آکر انہوں نے دوبارہ سے تعلیم کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ جس کی خبر وقار آفندی تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ عائشہ آفندی میکے آئی ہوئی تھیں اور کبھی کبھار زہرہ بتول شاہ بھی چکر لگا لیتی تھیں اور اسی دوران وقار آفندی نے ایک بار پھر زہرہ بتول شاہ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار زہرہ بتول شاہ نے کافی بری طرح سے انہیں جواب دیا تھا اور کافی عزت افزائی سے کام لیا تھا جس کو وقار آفندی پی گئے تھے اور اندر ہی اندر لاوے کی طرح ابلتے رہے تھے۔ اور یہ لاوا اگلے چار سالوں میں اتنی بری طرح سے پک چکا تھا کہ وہ انسانیت اور حیوانیت کا فرق بھول گئے تھے۔"

دل آور بڑے بے حس سے انداز میں سب کچھ کہتا جا رہا تھا لیکن بات جب دکھ کی جڑ تک پہنچی تھی تو اس کا کلیجہ مٹھی میں آگیا تھا۔ اور آسیہ آفندی ——— بیڈ کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پہ ہی بیٹھ گئی تھیں۔ جبکہ علیزے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور نور جویت اور دانیال وغیرہ کے چہروں پہ ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ اور کانوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"وہ دن بہت ہی بدبخت دن تھا جب دانیال اور زین کا عقیقہ رکھا گیا تھا۔ اور اس شاندار عقیقہ کی رسم میں حویلی کے تمام افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا لیکن صرف وقار آفندی تھے جو اس رسم میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ سنگاپور گئے ہوئے تھے اور واپس گھر آئے تو گھر خالی پڑا ہوا تھا اور خالی گھر میں چکراتے ہوئے انہیں کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے ڈرنک کا انتظام کر لیا کیونکہ ان کے ذہن پہ زہرہ بتول شاہ کا خیال سوار تھا۔

اور اپنے خیال کو ایک گندہ اور غلیظ عمل بخشتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے بہانا کرکے فون کروایا اور زہرہ بتول شاہ کو بڑی حویلی بلا لیا یہ کہہ کر کہ عائشہ آئی ہوئی ہے۔

زہرہ بتول شاہ نے سوال اٹھایا کہ عائشہ کے بیٹوں کا تو عقیقہ ہے' لیکن ملازمہ نے بہانا کر دیا کہ عائشہ آفندی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے عقیقہ چند دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔" وہ پھر رکا تھا اور علیزے کے چہرے کو دیکھا تھا جہاں زردیاں اتر رہی تھیں۔

"زہرہ!" عائشہ آفندی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تھے کیونکہ ان کے منہ سے بے ساختہ اک سسکی سی ابھری تھی۔

"دل آور شاہ اس وقت ساڑھے آٹھ سال کا تھا جب زہرہ بتول شاہ کو عائشہ آفندی کے نام پر دھوکا دے کر حویلی بلایا گیا تھا' حالانکہ حویلی بالکل خالی پڑی تھی' لیکن اس خالی حویلی میں ایک درندہ دل آور شاہ کی پھوپھی کے لیے تاک لگائے بیٹھا تھا۔

اور دل آور شاہ کو خبر ہی نہیں ہو سکی تھی' وہ بڑی حویلی کے لان میں چکراتا رہا اور اپنی پھوپھی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اس انتظار میں اس کی بے چینی بھی شامل تھی' وہ بار بار ملازمہ سے استفسار کرتا رہا کہ اماں کب آئیں گی اور ملازمہ ہر بار اسے اپنی باتوں میں بہلا پھسلا کر کسی اور چیز کی طرف متوجہ کر دیتی تھی' لیکن آخر کار دل آور شاہ تنگ آکر اندر آگیا تھا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

البتہ سیڑھیوں کے نیچے بیسمنٹ سے رونے کی اور چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر دل آور شاہ پہ لرزہ وار ہوا تھا۔ دل آور شاہ۔ یعنی میں۔ میں۔ دل آور شاہ۔ اپنی ماں کی آواز سن کر میرے

جسم میں کرنٹ بھر گیا تھا اور میں سیدھا بیسمنٹ میں جا پہنچا تھا' مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری ماں سب کچھ گنوا چکی تھی' اس کا دامن داغ دار ہو چکا تھا اس کی حرمت لٹ چکی تھی۔ درندہ اپنی درندگی آزما گیا تھا۔

اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کی حالت دیکھتا رہ گیا تھا جو بیسمنٹ کے فرش پہ بیٹھی رو رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔"

کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں یوں جیسے اس کی آنکھوں سے خون چھلک رہا ہو' اور زندگی کے اس اذیت ناک مرحلے پہ وقار آفندی نے سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں اور شدت دل سے اپنی موت کی دعا کی تھی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے ان کی سانسیں ہی ان کے لیے سزا بنا ڈالی تھیں۔

"میں نے ان ہاتھوں سے اپنی اماں کے بکھرے ہوئے وجود کو سنبھالا تھا اور ان سے لپٹ کر انہیں چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور پھر بڑی مشکلوں سے انہیں اپنے ساتھ لے کر بڑی حویلی سے نکل آیا تھا لیکن بڑی حویلی سے نکلتے ہوئے میں نے دعا کی تھی کہ اللہ وقار آفندی کو بھی بیٹی دے' اور اس کی بیٹی کا بھی وہی حشر ہو جو آج میری ماں کا ہوا ہے۔

میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن میری عقل' میری سمجھ اور میری سوچ بہت بڑی تھی' مگر میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اس ایک دن میں میرا پورا گھر برباد ہو کے رہ جائے گا۔" دل آور سے اب مزید بولنا مشکل ہو چکا تھا' اس کے گلے میں پھندا سا لگنے لگا تھا۔

"میں اماں کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوا تھا اور سامنے کھڑے بابا (بابر شاہ) کو دیکھ کر میرا ابھی پورا جسم کانپ گیا تھا' وہ اماں کی حالت دیکھ کر بڑی تیزی سے قریب آئے تھے اور اماں کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر انہوں نے اماں کو اس قدر جھنجوڑا کہ اماں کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

اور وہ ان کے قدموں میں گر کر رو پڑی تھیں' ان کی کوئی بہن نہیں تھی' ماں نہیں تھی' بھابھی نہیں تھی جس سے وہ اپنا دکھ کہتیں۔ صرف اور صرف ایک بھائی تھا اور اس بھائی سے وہ یہ دکھ کیسے چھپا سکتی تھیں' اس لیے سب کچھ کہہ دیا تھا اور بابر شاہ جیتے جی مر گئے تھے انہوں نے بہن کو سنبھالا' اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور انہیں ان کے بیڈ روم میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گئے' اپنا ریوالور نکالا اور گھر سے نکل گئے تھے لیکن گھر سے نکلنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہہ گئے تھے کہ اگر وہ آج کی تاریخ میں وقار آفندی کو نہ مار سکے تو خود کو مار ڈالیں گے۔" وہ ذرا توقف کے لیے رکا تھا۔

"اور پھر ایسا ہی ہوا تھا' وہ بڑی حویلی پہنچے تو پتا چلا کہ وقار آفندی کراچی چلے گئے ہیں اس لیے وہ ناکام اور مایوسی سے واپس لوٹ آئے تھے لیکن شدت غضب سے دماغ میں اس قدر ابال اٹھ رہے تھے کہ ان سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا اور انہوں نے راستے میں چلتے چلتے خود کو گولی مار دی تھی۔ اور زندگی سے رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔

بابر شاہ کی میت گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر جہاں اماں پاگلوں کی طرح چیخی تھیں' وہاں میرا بھی برا حال ہو گیا تھا' اور ہم ایک دن میں ہی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ اور اکیلے ہو گئے تھے۔

بھری دنیا ہمارے لیے کسی جنگل سے کم نہیں تھی' ویرانی تھی' سناٹا تھا' اور درندوں کی غراہٹ تھی وہ دن کیسے گزرے یہ صرف ہم جانتے تھے۔

لوگوں نے اماں پر الزام تراشی کرنا اور بہتان لگانا شروع کر دیا تھا' اسی لیے مجبوراً انہوں نے گھر بیچ دیا' اور بابا کا سارا کاروبار بند کروا کے اسلام آباد چلی گئیں اور لاہور شہر سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ دیا تھا' اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی اور مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

www.paksociety.com

لیکن اس واقعے کے ٹھیک تین مہینے بعد وہ پھر سے ایک عذاب سے گزری تھیں اور جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے زہر کا پیالہ پیتے ہوئے وقار آفندی کے آفس میں فون کیا تھا اور ان سے ان کا نام مانگا تھا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اس بچے کے لیے جو نا جائز تھا' ناپاک تھا' حرام تھا۔"

عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو اک تواتر سے بہہ رہے تھے اور آسیہ آفندی کے جسم پہ ایک کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔

"لیکن وقار آفندی نے انتہائی سفاکی سے انکار کر دیا تھا' یہ کہہ کر اگر وہ ایسا کچھ کریں گے تو ان کی بہن عائشہ کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی' میں آسیہ پہ کوئی سوتن نہیں لا سکتا اور نہ ہی آسیہ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہوں' اور ویسے بھی میرا ایک اسٹیٹس ہے اسٹینڈرڈ ہے' میں اپنے مقام سے نیچے نہیں آنا چاہتا۔ ہمارے درمیان جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ' اور ابارشن کروا دو' اسپتال کا سارا خرچہ میں افورڈ کروں گا۔" دل آور ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا کیونکہ اس سے بات کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا' بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

" اور ان کے اس جواب پہ اماں پہ کیا گزری یہ میں جانتا ہوں۔

اور ٹھیک دو دن بعد ملک وجاہت علی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وقار آفندی کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو گئی' وہی زندگی جس کو وہ تباہ کرنے کا بہانا کر رہے تھے پھر عائشہ آفندی پہ کیا گزری یہ وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے' ملک وجاہت علی کے چالیسویں کے بعد ملک شرافت علی کی بری نظر عائشہ آفندی پہ جا پڑی تھی۔ انہوں نے بھاوج سے شادی کا شوشا بھی چھوڑا تھا مگر عائشہ آفندی نے انکار کر دیا تھا۔

اور اسی انکار سے مشتعل ہو کر انہوں نے عائشہ آفندی کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی' لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملک شرافت علی کی بیوی نے انہیں بچا لیا تھا اور وقار آفندی کو فون کر کے عائشہ آفندی کو یہی حویلی لے جانے کا کہا تھا اور ساری سچویشن بھی بتائی تھی تب وقار آفندی بہن کو حویلی لے آئے تھے اور حویلی آکر ہی انوشہ پیدا ہوئی تھی' لیکن ملک شرافت علی نے ملک وجاہت علی کے بچوں کو جائیداد سے عاق کر دینے کا فیصلہ سنایا تھا جس کو وقار آفندی نے فوراً" قبول کر لیا تھا اور آسیہ آفندی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہیں؟ اپنے گھر والوں کے پاس یا وقار آفندی کے پاس؟

تب آسیہ آفندی نے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وقار آفندی کا ساتھ دیا تھا' اور اپنی نند اور بھاوج عائشہ کی جی بھر کے دلجوئی کی تھی' کیونکہ وہ بہت بڑے حادثے سے گزری تھی اور اسی دکھ کے عالم میں انہوں نے زہرہ کو بھی یاد کیا تھا مگر وقار آفندی ٹال گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ انہوں نے بہت ڈھونڈا مگر زہرہ بتول شاہ کا کچھ پتا نہیں چلا' شاید وہ بھائی کی ڈیتھ کے بعد گھر بیچ کر کسی سے شادی کر کے ملک سے باہر چلی گئی ہیں' اور عائشہ آفندی نے ان کے کہے پہ اعتبار کر لیا تھا' لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ زہرہ بتول شاہ سے کیا کیا چھن گیا ہے۔

ان سب باتوں کی معلومات مجھے بہت سالوں بعد لاہور آنے پہ ملی تھی اور میں نے اندر ہی اندر ملازمین سے بہت کچھ جانا تھا۔

"لیکن وہ بچہ۔؟" آسیہ آفندی کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

"مردہ پیدا ہوا تھا۔" وہ بہت پتھریلے لہجے میں بولا تھا۔

وقار آفندی نے تو ابارشن کا کہہ دیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی تھیں' وہ بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں اور اس بچے کے ذریعے وقار آفندی کا گریبان پکڑنا چاہتی تھیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اسی لیے وہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ اور اماں زندگی کا ایک اور بھیانک اور اذیت ناک رخ دیکھ کر رہ گئی تھیں اور خود کو اللہ کی رضا پہ چھوڑ دیا تھا۔

پھر ان کی زندگی کا مرکز دل آور شاہ کی ذات تھی اور انہوں نے اپنا غم' اپنی خوشی' اپنے خواب' اپنی خواہش سب دل آور شاہ سے وابستہ کر لیے تھے۔

حالانکہ وہ پہلے بھی بہت پیار کرتی تھیں' اور بہت توجہ دیتی تھیں مگر اب اس پیار اور توجہ میں شدت آگئی تھی' ان کی رات اور ان کے دن کا محور ہی دل آور شاہ تھا۔

اور میں بھی سب کچھ بھول کر صرف انہی کی ذات کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ اور انہوں نے میرے لیے بہت زیادہ جدوجہد بھی کی تھی' پہلے ایک کالج میں لیکچرار رہیں' پھر اس کالج میں اپنا پیسہ انویسٹ کر کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا' گھر سیٹ کیا' مجھے پڑھایا لکھایا' اور پھر میرے بابا کا شوق پورا کرنے کے لیے مجھے لندن بھیج دیا' وہیں پہ میری نبیل اور عبداللہ سے دوستی ہوئی' اور زندگی کے پانچ سال اماں سے دور گزارنے کے بعد میں پاکستان آیا تو میرے دل میں صرف ایک ہی عزم تھا لاہور جانا اور وقار آفندی سے انتقام لینا۔

اماں کو جب میرے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی تھیں انہوں نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں قسم کھا چکا تھا کہ اگر میں بابر شاہ کا بیٹا ہوں تو ایک بار' وقار آفندی کو وہ اذیت دے کر ہی رہوں گا جس اذیت سے بابر شاہ اور زہرہ بتول شاہ گزرے تھے۔ تب انہوں نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور یوں میں لاہور آیا' یہاں گھر لیا' نئے سرے سے لاہور شہر میں اپنا مقام بنایا اور وقار آفندی کو اذیت دینے کے تمام انتظامات بھی کر لیے۔

اور اس انتظام میں پہلا کام یہ کیا کہ مبارک خان کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا' مبارک خان اسلام آباد میں میٹرک تک میرا کلاس فیلو رہا تھا پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا اور اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کام کرنا شروع کر دیا تھا' وہ کب اور کیسے لاہور پہنچا یہ میں نہیں جانتا' لیکن اسے وقار آفندی کے خاص ملازم کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی' وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوا تھا' مگر اس نے میرے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا' لیکن جب اسے وقار آفندی کی اصلیت کا پتا چلا تو اس نے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یوں خیرو بابا کو پیش آنے والا حادثہ' اور میرا نوکری تلاش کرنے کے لیے آنا سب ایک پلان تھا۔ ایک کامیاب پلان۔ اور میں بطور ڈرائیور بڑی حویلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو علیزے آفندی کو کڈنیپ بھی کروا سکتا تھا' اس کے ساتھ بُرا بھی کر سکتا تھا۔ مگر میری ماں کا حکم تھا کہ وقار آفندی مت بننا۔ وقار آفندی بنوں گا تو وہ مجھے کبھی بخشیں گی نہیں۔ ہاں البتہ وقار آفندی کو اذیت جتنی بھی دوں وہ کم ہے۔

لیکن میں کیا کرتا؟ میں جب جب علیزے آفندی کو دیکھتا تھا میرا خون کھولتا تھا' میرے اندر غضب کے ابال اٹھتے تھے مگر میں بے بس تھا' میں پابند تھا' اس لیے صبر اور برداشت سے کام لیتا رہا' اور اسی دوران مری میں علیزے کے بیڈروم میں' میں نے علیزے کے ساتھ کچھ فوٹوگراف بنوائے تھے' ان فلیٹ میں علیزے اور وقار آفندی دونوں کو ہی بے بس کر دینا چاہتا تھا' میں چاہتا تھا کہ علیزے میرے پاس سے بھاگنے کی' احتجاج کرنے کی اور میری بات سے انکار کرنے کی کوشش نہ کرے' اس لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے کنٹرول کیا جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا' علیزے کی برتھ ڈے کی نائٹ میں اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ وہ میری بیوی ہے۔ وہ حیران ہوئی تھی' احتجاج بھی کرنا چاہا تھا اور انکار بھی۔

مگر اس کی نیند اور اس کی بے ہوشی میں بنوائے گئے فوٹوگراف اسے چپ کروا دینے کے لیے کافی تھے۔ اور میری یہ دھمکی بھی کافی تھی کہ میں ان فوٹوگراف کے پوسٹر بھی بنوا سکتا ہوں' اور پورے شہر میں چھپوا بھی سکتا ہوں اس لیے جو میں کہوں وہ کرتی جائے۔ سو ایسا ہی ہوا تھا اور علیزے نے بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ ہی دیا کہ وہ میری

بیوی ہے۔
اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں اسے آپ سب لوگوں کے سامنے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن وہاں جاکر میں نے اسے اپنے گھر کے بیسمنٹ میں ڈال دیا تھا۔

علیزے کے بارے میں پتا چلا تو اماں بھی اسلام آباد سے آگئی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے مجھے یہ تنبیہہ کرتی رہی تھیں کہ کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے کا کبھی سوچنا بھی مت اگر سوچو گے تو ایک بار میرے بارے میں ضرور سوچ لینا۔

عورت قابل احترام ہستی ہے' عورت محبت کا پیکر ہے' عورت اس دنیا کا زیور ہے' عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کا غصہ سہنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی' اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے آفندی سے لو' اور اس کی سزا اسے دو۔

وہ ایک عورت ہے اور ایک عورت کا دکھ مجھ سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جان سکتا۔"
دل آور نے آذر' جودت اور دانیال کی طرف دیکھا تھا جو دم بخود سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہنوز دل آور شاہ کو ہی دیکھے جا رہے تھے۔

"زہرہ بتول شاہ ظالم نہیں تھیں۔ بلکہ ایک مضبوط' اعلا ظرف اور غیرت مند عورت تھیں۔
زندگی سے اتنے زخم اٹھانے کے باوجود بھی انہوں نے سر اٹھا کر زندگی گزاری تھی' اور اپنی محرومیوں اور تکلیفوں کا بدلہ علیزے آفندی سے ہرگز نہیں لیا تھا اور جب علیزے نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے نکاح کرلو اور مجھے اپنا نام دے دو تو خدا گواہ ہے کہ میں وقت کے اس ہیر پھیر اور اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی پہ دنگ رہ گیا تھا۔
علیزے نے میرے پاؤں بھی پکڑے تھے لیکن میں پھر بھی کچھ نہیں سکا تھا۔ البتہ روح تک کانپ ضرور گیا تھا۔ کیونکہ میں زہرہ بتول شاہ کا بیٹا تھا اور زہرہ بتول شاہ نے مجھے ہمیشہ عورت کی عزت کرنا سکھایا تھا' احترام کرنا سکھایا تھا' کسی عورت کا سر اپنے قدموں میں جھکانا نہیں سکھایا تھا۔

اسی لیے میں نے جب یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم اسے لے کر آئے ہو' تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے لو تم ہی اسے اپنا نام دے دو' نکاح کرلو اس سے۔ تم مرد ہو' وہ عورت ہے' اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے' مرد سے ہی نام مانگتی ہے' جو نام نہیں دیتے وہ نامرد ہوتے ہیں' بے غیرت ہوتے ہیں' عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔
اور تب میں خاموش ہوگیا تھا' واپس لاہور آگیا تھا' ان سے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا' اور وہ مطمئن ہوگئی تھیں' پھر وہ لاہور آئیں' اور یونہی ایک روز اسپتال میں وقار آفندی سے سامنا ہوتے ہی وہ خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں اور ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔

لیکن اس ایکسیڈنٹ کے باوجود اپنی آخری سانسوں کے دوران انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے تاکہ میں علیزے سے نکاح کرلوں اور میں نے سر جھکاتے ہوئے ان کا کہا مان لیا تھا۔
کیونکہ میں ان کا کہا کبھی ٹال ہی نہیں سکتا تھا' اور وہ علیزے آفندی سے کیا ہوا وعدہ پورا کرگئی تھیں وہ جاتے جاتے وقار آفندی کو معاف بھی کرگئی تھیں۔ اور میرے لیے ایک "اپنے" کا انتظام بھی کرگئی تھیں۔
ایک ایسا "اپنا" جو سب سے زیادہ پرایا نکلا۔ اور جس نے یہ ثابت کردیا کہ اس کی رگوں میں واقعی "وقار آفندی" کا خون ہے۔"
دل آور شاہ کا یہ جملہ کوئی اور وقت ہوتا تو علیزے کے لیے قابل فخر ہوتا' لیکن اس وقت یہ جملہ اس کے لیے

کسی گالی یا کسی طمانچے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔
اس لیے علیزے نے یکدم اس طمانچے سے بلبلا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ تھا کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے اس دیکھنے میں کیا کچھ نہیں تھا آخر' طنز' تمسخر' کلفت اور تلخی۔ سب کچھ ہی تو تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا' شکایتیں تھیں' اور ایک بیگانہ پن بھی تھا۔
"بتاؤ علیزے! کسی کو معاف کرنا اور اعلا ظرف ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔"
دل آور نے ڈائریکٹ علیزے سے سوال کیا تھا مگر علیزے کے پاس الفاظ ہوتے تو وہ جواب دیتی نا' "کتنا فرق ہے تم میں اور زہرہ بتول شاہ میں۔
میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی تم مجھے معاف نہیں کرسکیں۔ اور وقار آفندی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا' پھر بھی انہوں نے اسے معاف کردیا۔
میں نے اپنے غصے اور انتقام کے جذبات میں آکر جو کچھ بھی کیا وہ سب برا سہی' لیکن پھر تمہاری عزت رکھ لی' اور تمہیں اپنا نام دے دیا' مقام دے دیا' اپنے دوستوں میں اور اپنے جاننے والوں میں تمہاری عزت بنائی' تمہارا احترام کیا' تمہارا بھرم رکھا' لیکن تم سے وفا نہیں ہوسکی' اور نہ ہی تم وفا کو سمجھ سکیں۔
شاید تمہیں نہیں پتا کہ عورت ہونا تو بہت آسان بات ہے' لیکن عورت ہونے کو نبھانا بہت مشکل کام ہے' عورت تو بہت حساس ہوتی ہے' لیکن تمہیں تو نہ زہرہ بتول شاہ کی کوئی بات یاد رہی اور نہ ہی دل آور شاہ کی۔" وہ تمسخر سے کہتا ہوا پھر رکا تھا۔
"تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ تو میری جان میں نے وہ سچ کہا تھا' یہ تمہاری سمجھ کی بھی چیز نہیں ہے کیونکہ تم بھی تو اس حویلی کا حصہ ہو' اس لیے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے' اور نہ ہی تم سے کوئی شکوہ ہے۔
تم اس حویلی میں رہنا چاہتی ہو' رہو۔ تم اپنے پاپا کے ساتھ رہنا چاہتی ہو' رہو۔
میری طرف سے آزاد ہو' میں تمہیں کل ہی طلاق بھجوادوں گا' کیونکہ تم جانتی ہو نا کہ میں واقعی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں' جو ہے وہ ٹھیک ہے' جو نہیں ہے وہ بھی ٹھیک ہے' بس میری تو یہی سوچ ہے اور یہی عمل ہے' البتہ جانے سے پہلے تم سے اتنا ضرور پوچھوں گا کہ بتاؤ۔
اس سارے قصے میں دل آور شاہ کہاں کہاں غلط ہے؟ اور کہاں کہاں برا ہے؟ اور آج اس قصے کے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر؟"
اس نے آخر میں علیزے کو اپنے سوالوں کی زد میں رکھ لیا تھا اور سوال بھی ایسے تھے جن کے جواب علیزے کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے تھے اور وہ اپنی جگہ پہ گنگ سی بیٹھی رہی تھی۔
"بولو علیزے آج تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر۔" اس نے اپنے سوال پہ زور دیتے ہوئے علیزے کو بولنے پہ اکسایا تھا لیکن علیزے تو جیتے جی زمین میں زندہ گڑ گئی تھی' وہ بولنے کی سکت کہاں سے لاتی؟
"ہونہہ! مجھے بھی پتا ہے اور مجھے کل بھی پتا تھا کہ حویلی والوں کے پاس کوئی انصاف نہیں ہے۔" وہ انتہائی تلخی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"اور ہاں آذر آفندی! میری بدکرداری اور بدبختی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا "باکردار' معزز اور عزت دار" نہیں ہوں' ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا' ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں' وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہے' اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف

کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا' حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا' مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا' کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔" دل آور نے آخری بات کہی تھی اور سب پہ ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی' ہر چہرے پر دکھ تھا' اذیت تھی' بے یقینی تھی اور سب سے بڑی بات کہ سب کے چہروں پہ آنسو تھے۔

مگر ان کا یہ دکھ' یہ اذیت' اور یہ آنسو اس کے کس کام کے تھے بھلا۔ اسے کیا فائدہ تھا آخر۔ اب سب کچھ بے کار تھا اسی لیے وہ لاپروا تھا۔

"اینی وے۔ آپ لوگوں نے دعوت دی' بلایا' کٹہرا سجایا' بہت اچھا لگا' میں تو پہلے ہی عدالتوں کا اور کٹہروں کا عادی ہوں' ایک عدالت اور سہی۔ خیر اب چلتا ہوں۔ تھینک یو۔"

اس نے الوداعی کلمات ادا کیے تھے اور علیزے نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی دل آور اسے ہی دیکھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ علیزے کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھیں۔ "اللہ حافظ۔" اس نے دروازے کا ہینڈل تھما کر دروازہ کھولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا مگر جس نظر سے اسے دیکھ کر گیا تھا۔

وہ نظر علیزے کو علیزے سے ہی بیگانہ کر گئی تھی۔ توڑ کر لے گئی تھی اسے اور اس کے یوں سامنے سے ہٹ جانے پہ علیزے کو ایسا لگا تھا جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہو' اور ہر سو تاریکی سی چھا گئی ہو' جس سے گھبرا کے وہ بے ساختہ پکاری تھی۔

"ڈرائیور!" آواز اتنی مدھم تھی جیسے وہ بڑبڑائی ہو۔

"ڈرائیور!" لیکن اب کی بار اس کی آواز بہت بلند تھی اتنی کہ وہ سب بھی ہڑبڑا گئے تھے۔

"ڈرائیور! رکو۔ میری بات سنو ڈرائیور۔ پلیز رکو۔" علیزے اسے زور زور سے پکارتی ہوئی یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور بیڈ روم سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔

اور اس کا یہ بھاگنا کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگی تھی۔ اور اندھا دھند بھاگی تھی۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

حویلی کے کھلے گیٹ سے دل آور کی گاڑی باہر نکل رہی تھی فاصلہ بڑھ چکا تھا' گاڑی کے دروازے اور شیشے بند تھے' اس تک آواز پہنچنا مشکل تھا' مگر پھر بھی وہ پکار رہی تھی' چیخ رہی تھی' اور اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

"ڈرائیور پلیز! رکو یہاں۔ پلیز ڈرائیور مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ پلیز ڈرائیور۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مر جاؤں گی۔ مجھے لے جاؤ۔ پلیز۔"

وہ اس کی گاڑی کو آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر بے ساختہ تھک کے رک گئی تھی اور وہیں کوریڈور کے مین ڈور کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔ لیکن آج کوئی بھی اسے چپ کروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

کیونکہ آج سب کے دل رو رہے تھے' اور سب کے ضمیر پہ ایک اذیت ناک سا بوجھ آپڑا تھا۔ آج کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا' بلکہ سب کی سماعتوں میں دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی' اور سب کا ہی ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ انہیں بار بار دل آور کا خیال آ رہا تھا۔

میں تو اسی واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
اور تو سمجھتا ہے کہ مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

☼ ☼ ☼

نہ چھیڑ قصہ الفت بڑی لمبی کہانی ہے
میں زمانے سے نہیں ہاری کسی کی بات مانی ہے

رات خاصی گہری ہو چکی تھی اور وہ بہت دیر سے ٹیرس پہ کرسی ڈالے بیٹھی کرسی کی بیک سے ٹیک لگائے سیاہ آسمان کے بدن پہ چمکتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی جو آسمان پہ چاند کی غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آرہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود چاندنی کی اپنی جگہ ہنوز تھی کیونکہ ستارے چاندنی کی کمی کو دور نہیں کرسکتے تھے جس پہ اس کی آنکھوں میں بھی اداسی رات کی طرح ——— گہری ہوتی جارہی تھی۔ لیکن کمرے میں اس کے بیڈ پہ پڑے موبائل کی رنگ نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

رات کے اس پہر فون۔ یہ خیال آتے ہی وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی تھی اور دھیمے قدم اٹھتی اندر آگئی تھی' کیونکہ ابھی اسے بھی اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی اس نے اپنے آپ کو بہت جلدی کور کیا تھا لیکن پھر بھی ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ کچھ وقت چاہیے تھا ابھی۔

"انوشہ۔" وہ انوشہ کا نمبر دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"کیسی ہیں زری آپی؟" انوشہ کی آواز بہت سست اور سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔

"الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ سب خیریت ہے نا ؟" اس وقت فون کیوں کیا۔؟" زری اور عبداللہ کے تعلقات اپنے چچازاد کزنز سے بہت اچھے تھے

کیونکہ دانیال' زین اور انوشہ تینوں ہی انھیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ان سے ملنے کے لیے گھر بھی آئے تھے اسی لیے تب سے آپس میں کانٹیکٹ بھی بڑھ گیا تھا اور بے تکلفی تھی۔"

"نیند نہیں آرہی۔" انوشہ نے بہانا تراشا۔

"نیند نہ آنے کی وجہ؟" زری تھک گئی تھی بیڈ پہ ٹک گئی۔

"دل آور شاہ۔!" انوشہ کے لہجے میں اس کے نام کے ساتھ دکھ جھلکا تھا۔

"دل آور شاہ۔ کیا مطلب؟" وہ الجھی۔

"وہ آئے تھے یہاں۔" انوشہ خود ہی جیسے بتانا چاہتی تھی' دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

"اوہ اچھا۔ پھر؟" زری کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔

"وہ آئے اور ہمیں ہماری ہی نظروں میں گرا کر چلے گئے اور علیزے۔ وہ تو اب تک رو رہی ہے۔" انوشہ رفتہ رفتہ کھل رہی تھی اور زری یونہی رفتہ رفتہ مزید الجھتی جارہی تھی کیونکہ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ "علیزے رو رہی ہے۔ مگر کیوں۔ کیوں رو رہی ہے وہ؟" زری نے پھر الجھ کر پوچھا تھا۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

سارا گھر نئے انداز سے فرنشڈ کروایا تھا۔ اس نے جھلملاتی آنکھوں سے ماضی کے عکس سے نگاہ چرائی گیٹ پار کر کے وہ اور ربیع سوٹ کیس گھسیٹتی اندر آئیں۔

عاصم نے شوقیہ اطلاعی گھنٹی بجائی بچوں نے مسکرا کر باپ کی شکل دیکھی۔ جبکہ وہ وہیں شرمندہ سی مسکراہٹ لیے کھڑی رہ گئی۔

مسکراہٹ میں چھپی ندامت کسی صورت کم ہونے کو نہ آرہی تھی۔ ندامتوں اور حماقتوں کی طویل فہرست 'چاہے جانے سے بھی زیادہ چاہ کی ضرورت ـــ انسانی فطرت میں کنڈلی مارے نا آسودہ خواہشوں کے سانپ نے اس کا تن من نیلا کر دیا تھا وہ "وہیں سے" اور "ویسے ہی" زندگی کی شروعات نہیں کر سکتی تھی۔

پہلے اسے شیشے میں نظر آجانے والے اس بال کو مدھم کرنا تھا۔ جو اس کی اہمیت کو گھٹانے کا باعث بنا تھا۔

وہ چودہ دسمبر کی ایک گیلی رات تھی۔ جب اس نے چوری چھپے عاصم سے شادی کی تھی۔ ماں باپ نے دوسرے ہی دن دونوں کو بلوا کر دنیا والوں کے لیے ایک شادی کو ارینج کروایا تھا۔ صد شکر خاندان کے ہی دونوں چشم و چراغ تھے۔ جو اندر کی بات اندر ہی دفن ہو گئی۔ ورنہ جگ ہنسائی ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی تھی۔

دونوں کو زندگی کی خواہشوں میں مگن دیکھ کر ماں باپ نے پچھلی رنجشیں بھلا دیں۔ عاصم سے شادی کے بعد صحیح معنوں میں بھاگ جاگ گئے تھے۔ صدر میں چلنے والی کپڑے کی دکان اب امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس تک کی رسائی حاصل کر چکی تھی۔ وہ اس کا ذمہ دار سراسر ندا کو سمجھتا تھا۔ جس کے آنے سے اتنی ریل پیل ہو گئی تھی۔ جبکہ ندا محبتوں اور قدروں کے ساون میں بھیگتی چلی جاتی۔

عاصم کو کاروبار کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لیے جدہ قیام کرنا تھا' وہ چاہتا تھا کہ ایک دو سال لگا کر وہ مزید ترقی کی منازل طے کر لے۔ اتنے میں ربیع بڑی ہو جائے گی اور اس کے لیے شاندار سے اسکول میں تعلیم کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے پھر ریان اور حنظلہ کی باری آجاتی تھی۔

ندا کے سسرال والوں نے ابھی تک لاتعلقی کا لیبل نہیں اتارا تھا۔ بظاہر عام معافی مل چکی تھی۔

عاصم نے جاتے ہوئے اپنے دوست ہمایوں کو ندا کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ وہ دوست بھی تھا اور قریبی رشتہ دار بھی ـــ ندا اور بچوں سے بہت سارے وعدوں کے ساتھ وہ رخصت ہوا۔

وہ سارا دن یونہی گھر میں بور ہوتی رہتی۔ ملازم بچوں تک کے کام کر دیتے۔ جبکہ وہ صرف نگرانی کے حد تک محدود تھی۔ کبھی ٹی وی دیکھ لیا ـــ کبھی عاصم سے فون پر بات کر لی۔ روز روز تیار ہو کر وہ شیشے کے آگے یونہی بے مقصد کھڑی رہتی۔ تعریف کرنے کے لیے کوئی تھا ہی نہیں ـــ

عاصم نے اکیلے سیر و تفریح کرنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔ وہ ہمایوں بھائی کے گھر چلی جاتی۔ ان کی بیگم اور ان کا خلوص قابل دید ہوتا۔

"بھابھی! آپ پر میرون سوٹ کے ساتھ سندھی کڑھائی والی شال کتنی خوب صورت لگتی ہے۔" ایک دن اچانک کھانے کے دوران ہمایوں بھائی نے تعریف کر ڈالی۔ ان کی بیگم نے بھی مسکرا کر تائید کی۔

ندا اتنے عرصے کے بعد کھل کر مسکرائی تھی۔ گھر واپسی پر بھی یہی فقرہ اس کے دماغ میں گونجتا رہا۔

پھر ہر ویک اینڈ ہمایوں بھائی کے گھر گزارا جانے لگا۔ بچوں کا بھی ان کے بچوں کے ساتھ دل لگ گیا۔

"آپ کی چوائس بھی اچھی ہے اور آپ کے بچوں کی بھی۔" ایک دن وہ سب پارک میں تفریح کرنے گئے تھے۔ ربیع نے بلیک میکسی پہن رکھی تھی۔ اس کے لیے سکی بال ـــ وہ آٹھویں کلاس کی بچی کی بجائے دسویں کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی۔ ہمایوں بھائی کی اچانک توصیف پر اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی جھینپ سی گئی۔

ربیع "تھینک یو انکل!" کہہ کر پھر بچوں کے ساتھ مگن ہو گئی۔ جبکہ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کب سے

ہمایوں بھائی کے گھر آرہی ہے۔ مجال ہے جو ان کی بیگم اور بچوں کے لیے کوئی تحفے تحائف لائی ہو۔

اس نے فون پر عاصم سے بات کرتے ہوئے بھی یہ بات دہرائی۔

"ہاں تو تم اکیلی تو شاپنگ پر جا نہیں سکتیں ایسا کرو ہمایوں اور اس کی بیگم کے ساتھ کسی دن مارکیٹ کا چکر لگا آؤ۔ انہیں بھی کچھ لے دینا۔ آج کل اتنے پرخلوص لوگ کہاں ملتے ہیں۔ میرے جانے کے بعد تمہارا اور بچوں کا کتنے اچھے انداز سے خیال رکھ رہے ہیں۔"

عاصم کی بات اس کے دل کو بھی لگی تھی۔

"بھابھی! میں سوچ رہی ہوں ہم آج شاپنگ پر چلتے ہیں میں نے سنا ہے بڑی اچھی کپڑوں کی ورائٹی آئی ہوئی ہے۔" اگلے اتوار ان کے گھر صوفے پر براجمان ندا نے باتوں ہی باتوں میں کہا۔ وہ سنتے ہی فوراً" مان گئی۔ ہمایوں نے اپنے آفس سے گاڑی بھیج دی۔ ندا نے اپنے اور بچوں کے لیے کپڑے لیے۔ آفرین اور اس کے بچوں کے لیے بھی خریداری کی۔ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ہزاروں کی شاپنگ کر کے گھر لوٹیں۔

"ارے بھابھی! آج تو آپ نے حد ہی کر دی۔ اتنے مہنگے مہنگے کپڑے اور جوتے ـ لے کر دے دیے میرے بچوں کو ـــ" آفرین اپنے براؤن بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے قدرے فکر مندی سے بولی۔

ہمایوں نے بھی چونک کر ڈھیروں شاپنگ بیگز لاؤنج میں بکھرے دیکھے۔

"بھابھی! پلیز آگلی دفعہ یہ تکلف مت کیجیے گا۔" ہمایوں سنجیدگی سے بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنا ہی نہیں سمجھتے ـــ" ندا نے خفگی سے کہا۔

"ارے نہیں' نہیں آپ ہماری اپنی ہیں پر اتنی مہنگی شاپنگ ـــ"

"آپ کے خلوص کے سامنے تو یہ کچھ بھی نہیں ـــ" وہ آفرین کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے بولی۔

"لیکن ـــ" ہمایوں ابھی بولنے ہی لگا تھا۔

"لیکن ـــ ویکن کچھ نہیں ہمایوں بھائی ـــ سیدھی طرح کہیے کہ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی ـــ"

"اوفوہ! سوری بھئی ـــ غلطی ہو گئی' آپ جو چاہیں مرضی لے کر آئیں۔ آج سے آپ کو انکار نہیں ـــ" ہمایوں نے مسکرا کر اس کی خفگی کم کرنے کی کوشش کی۔

جبکہ اب وہ آفرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آفرین! بھابھی کے لیے چائے وغیرہ کا انتظام کرو ـــ تھکن ہو گئی ہو گی ـــ"

آفرین مسکرا کر اٹھ گئی۔ جبکہ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"میں سوچتا ہوں کہ عاصم نے آپ سے شادی کا فیصلہ بالکل صحیح سوچ کر کیا۔ اتنی ذہین اور خوب صورت بیگم تو ایک نعمت ہے ـــ" ہمایوں کی بات پر اس نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"تو کیا آپ کی بیگم خوب صورت نہیں ـــ؟"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ یونہی مسکرا کر بولا۔

"بس میں سمجھتا ہوں کہ عاصم پھر بھی مجھ سے زیادہ خوب قسمت ہے۔" ہمایوں کی شوخی نے اس کی آنکھوں کی چمک بڑھا دی تھی۔

بعض عورتیں تعریف کو حق سمجھ کر وصول کرتی ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ تعریف کرنے والا کس قبیل کا مسافر ہے۔ بس ان دیکھی دیوار کے پیچھے منظر لوبھی زندگی کے غائب ہوتے جاتے ہیں اور باتیں لمحوں کو بھی حوصلہ بخشتی ہیں۔ وہ بھی عجیب لطافت اور سرور دے کر ہی سرکتے ہیں۔

"ہمایوں بھائی آج میں بازار گئی تو سوچا آپ کے لیے فیض کی شاعری کا مجموعہ ہی خرید لوں۔ آپ کے بقول آپ کو شاعری بڑی پسند ہے اور آفرین بھابھی کے لیے میں نگینے کے کام سے مزین یہ سبز غرارہ بھی لائی ہوں۔ آج کل یہ فیشن ہے ـــ" وہ شوخی سے لاؤنج میں آتے

ہوئے بولی۔

آفرین تو غرارے کو دیکھتے ہی ندا کی فیاضی پر مر مٹی جبکہ ہمایوں بمشکل مسکرایا تھا۔

"کیا آپ خوش نہیں ہوئے؟" وہ بڑی ادا سے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

"خوش تو ہوں۔۔۔ بس ذرا آفس پرابلم ہے۔۔۔"

"کون سی آفس پرابلم۔۔۔ ہمایوں بھائی؟" وہ فکر مندی لہجے میں سموتے ہوئے بولی۔

"تم کھانا کھاؤ گی۔۔۔ ندا!" آفرین نے غرارہ دوبارہ سے غرارہ پیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ضرور۔۔۔ کیا بنا ہے؟"

"آج میں نے تمہاری پسند کی نہاری بنائی ہے۔" آفرین جوڑے کو پاکر خوشی سے دمکتے ہوئے بولی۔

"تو پھر دیر کس بات کی۔۔۔ فٹافٹ کھانا لے آیئے۔۔۔" اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ ہمایوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

اس نے آج کاجری رنگ کا بیڈز کے کام والا سوٹ پہنا تھا۔ وہ تو بالوں کی ہائیٹ بھی بنا کر آئی تھی۔

"ممّا! آج آپ بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔۔۔" ربیح نے بھی بے ساختہ تعریف کی تھی۔

پر ہمایوں شاید کافی الجھا ہوا تھا۔ اسے اس کی ڈریسنگ نظر ہی نہ آرہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی تعریف کرے۔

"ہمایوں بھائی! آج آپ زیادہ ہی پریشان ہیں۔" وہ خود ہی مخاطب کرکے بولی۔

"پریشان۔۔۔ چھوڑیے بھابھی! پریشانیاں تو بس یونہی چلتی رہتی ہیں۔ میں کون سا عاصم کی طرح اتنا خوش قسمت ہوں جو اتنے مقدروں والی عورت حاصل کرسکوں۔ جس کے آتے ہی دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ میری تو جب سے شادی ہوئی ہے۔ کاروباری ساکھ ہی خراب ہو کر رہ گئی ہے۔"

ایک بڑا معتبرانہ احساس دل میں جاگزیں ہوا تھا اس کے۔

"آپ مجھ سے پیسے لے سکتے ہیں۔ آپ کو اگر میری مدد درکار ہے تو میں آپ کی مدد ضرور کرنا چاہوں گی۔" وہ حاتم طائی کی بڑی شان بے نیازی سے بولی۔

خوشامد ایسی بلا ہے۔ جس سے کچھ ہو نہ ہو بس ریبا ٹائٹس کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ جو خاموش قاتل بن کر آپ کے جگر کو تباہ کر دیتا ہے۔ اور جگر ہی تو سارے جسم کا سربراہ ہوتا ہے۔ یونہی خوشامد عقل کو ختم کر دیتی ہے۔ جو پورے شعور اور لاشعور کو کنٹرول کرتی ہے۔

"نہیں، نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عاصم کیا سوچے گا۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"عاصم! کو میں بتاؤں گی ہی نہیں۔۔۔ اگر آپ کو لگتا ہے کہ اس طرح سے آپ کی عزت نفس یا وقار کا مسئلہ بنتا ہے۔ تو بے فکر رہیے۔ میں خود سے آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔"

وہ ایک ایک کرکے بہت سے خدشے اس کے سر سے نکال باہر کر رہی تھی۔

"تم خوب صورت و ذہین ہی نہیں۔۔۔ انتہائی ہمدرد اور پرخلوص عورت ہو۔۔۔" طرز تخاطب آپ سے تم ہو گیا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ آپ سے تم تک کا فاصلہ کتنی بے تکلفیوں کو ہوا دیتا ہے۔ جس میں تیلی چھینکی جا چکی تھی اور بھڑکنے والی آگ میں کیا کچھ جل سکتا تھا۔

شہر کے مشہور پلازہ سے شاپنگ۔

ریسٹورنٹس سے نت نئے کھانے۔

مشہور تفریح گاہوں پر روز روز پکنک کے منصوبے

۔۔۔

آفرین۔۔۔ ندا، ہمایوں بچے مزاج کے چاروں کونے پورے تھے۔۔۔ عاصم کے بغیر۔۔۔

"ربیح کو گہری سبز گھاس کے رنگ کا اوور کوٹ دلوا دو۔ تمہاری بیٹی، تمہاری طرح بے حد سفید رنگ کی سی ہے۔" آفرین سے نظر بچا کر زرا ہولے سے ندا کے پاس جاکر ہمایوں نے تعریف کی۔

وہ ایک ادا سے مسکرا کر پیسوں کی نمائش کرتے ہوئے دکاندار سے سبز اوور کوٹ پیک کرنے کا آرڈر کرنے لگی۔

دن رات کی تقسیم کے بغیر ندا اور بچے۔۔۔ ہمایوں اور آفرین کے گھر پائے جاتے اور ہمایوں، آفرین ندا کے گھر۔

انہیں دنوں اماں بھی ندا کے ہاں رہنے آگئی تھیں۔ جاڑے کے موسم میں خرابی طبیعت کے باعث وہ ایک دو دن رہنے کی بجائے پچھلے ایک ہفتے سے مستقل یہیں پر قیام پذیر تھیں۔

"ندا! بیٹا مجھے تمہارا یوں بار بار آفرین کے ہاں جانا اور ان کا تمہارے ہاں آنا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔" اماں نے بمشکل ناگواری چھپائی۔

"اماں آپ بھی نا بس۔۔۔ عاصم کے بہترین دوست ہیں ہمایوں بھائی۔۔۔ میں کیوں نہ آؤں جاؤں۔۔۔ عاصم کے بعد سے یہ لوگ اتنا خیال کرتے ہیں۔ سسرال میں تو کسی کو اتنی توفیق نہیں۔" وہ کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے عجلت سے بولی۔

"لیکن مجھے وہ ہمایوں ذرا چھچھورا سا لگتا ہے۔" اماں پھر بھی باز نہ آئیں۔

"ہائیں، وہ کہاں سے چھچھورے ہو گئے۔ اتنے اچھے تو ہیں۔۔۔ ہمایوں بھائی۔"

"ہاں بڑے اچھے ہیں ہمایوں بھائی۔" اماں منہ بگاڑ کر اس کی بات پر بدمزا ہوتے بولیں۔

اگلے اتوار ان کا ارادہ ہیز اہٹ جانے کا تھا۔ اس نے صبح ہی صبح سارے بچوں کے کپڑے پریس کر دیے تھے۔ ربیح کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی۔ مگر سیر و تفریح کا پلان یونہی خراب ہو تو اس کی طبیعت بوجھل سی ہونے لگی۔ وہ گھر پلو دوائی دے کر ربیح کو ساتھ لیے آفرین کی طرف آگئی۔

آفرین اور بچے بھی تیار بیٹھے تھے۔ وہ صرف ساتھ جاتے مفت۔۔۔ باقی پیسہ تو ہمیشہ اسی کا لگتا تھا۔

"کیا ہوا؟ ربیح کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔۔۔" آفرین نے پنک میکسی میں ملبوس ربیح کے گلابی پڑتے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہلکا ہلکا بخار ہے۔۔۔"

"نہیں، مجھے لگتا ہے کہ بخار تیز ہو رہا ہے۔ تھرمو

حذیفہ سے کہہ کر تھرمامیٹر منگواتی ہوں۔ پھر چیک کرتے ہیں۔" آفرین کو تشویش سی ہوئی تھی۔
جبکہ اب وہ بھی ربیع کو اپنے پاس بلا کر ہاتھ لگا لگا کر چیک کرنے لگی۔ جسم گرم ہوا جا رہا تھا۔ تھرمامیٹر سے چیک کیا تو ایک سو ایک ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔
"کیا ہو رہا ہے بھئی ـــ" ہمایوں اپنے سلکی بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے اندر آتے ہوئے بولا۔
"ربیع کو بخار ہو رہا ہے۔" جواب آفرین نے دیا تھا۔
"ایسا کرتے ہیں کہ میں تم لوگوں کو پرہاؤس چھوڑ کر، ربیع کو ڈاکٹر سے چیک کروا کے رسول بی بی کے پاس گھر چھوڑ جاؤں گا۔ یہ ریسٹ کرلے گی۔" ہمایوں نے تجویز دی۔
"نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم جاتے ہی نہیں ـــ" وہ گڑبڑا کر بولی۔
"ارے بھابھی! گھبرا کیوں گئیں۔ اتنا سا بخار تو ہو ہی جاتا ہے۔ ہمایوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو چیک کروا کر یہ ربیع کو رسول بی بی کے پاس گھر ڈراپ کردیں گے۔" آفرین بولی۔
"ویسے بھی میں نے ٹیبل ریزرو کروالی ہے اور خوب صورت پل کون سے بار بار آتے ہیں اتنی تھکی ہوئی زندگی میں ـــ" ہمایوں نے بطور خاص اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تم بھی کبھی بھابھی کی چوائس کی ڈریسنگ کرلیا کرو۔" وہ آفرین کو مذاق میں ڈانٹتے ہوئے اس کا موڈ بحال کرنے لگا۔
جبکہ وہ محض مسکرا کر رہ گئی۔ بھابھی کے شوز ـــ بھابھی کا سوٹ ـــ بھابھی کی مسکراہٹ ـــ آنکھوں کی چمک ـــ خوب صورتی ـــ غرض ہر طرح سے تہذیب کے ریپر میں لپٹی ہوئی کوڈ ورڈ تعریف کی جاتی رہی۔
ہمایوں انہیں ڈراپ کرکے خود ربیع کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کروانے کے لیے لے گیا۔

پرہاؤس میں تقریباً" ایلیٹ کلاس میں شامل افراد زیادہ تر آئے تھے۔ وہ بھی آفرین کے ساتھ نئی نئی دولت لٹانے چلی آئی۔ دولت کا خمار بھی عجیب خمار تھا۔ اس خمار میں سدھ بدھ گم ہوجاتی ہے۔
اس نے ماں کے گھر کبھی اتنا پیسہ نہیں دیکھا تھا۔ وہاں سوچ کر لگانا پڑتا یہاں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ لٹائے کس طریقے سے ـــ
ان کی واپسی رات بارہ بجے جاکر ہوئی تھی۔ تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ آفرین نے تھکن اور ربیع کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے ہاں ہی رکنے کی دعوت دے دی۔ جسے بخوشی قبول کرلیا گیا۔
وہ بے سدھ ہوکر سوئی۔ رات کے پچھلے پہر سسکیوں کی آواز نے اس کی نیند ڈسٹرب کی تھی۔ اس نے بمشکل سوئی جاگی آنکھوں کو کھولا۔
ربیع گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھی۔
"ربیع! کیا ہوا بیٹا ـــ؟" اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔
وہ گھبرا کر اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ یوں ہی لگاتار روئے گئی۔
"کیا بخار زیادہ ہوگیا ہے؟" وہ اس کے ماتھے پر سے بال سمیٹتے ہوئے پیار سے بولی۔
"مما ـــ مما! انکل ہمایوں اچھے نہیں ہیں ـــ"
ربیع کے الفاظ نے اس کے دل کی دھڑکن تیز کردی۔

"کیا کہا انہوں نے ـــ؟" اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔
"مما! وہ میرا بخار بار بار چیک کرتے تھے۔ کبھی کہاں ہاتھ لگاتے تو کبھی کہاں ـــ میرے گلے میں بلاوجہ پانی ڈالا تھا انہوں نے ـــ" وہ سسکاریاں بھرنے لگی۔
جبکہ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
"مما! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مما! انکل بہت برے ہیں ـــ" وہ روتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
جبکہ وہ پتھرا سی گئی تھی۔ اسے پتا نہیں کیا ہوا تھا؟ وہ جھٹکے سے اٹھی تھی اور آفرین کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا

وہ دونوں میاں بیوی حیران پریشان جاگے۔
"مجھے ابھی گھر چھوڑ آئیں ہمایوں بھائی! ربیع کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
"بھابھی! رات کے دو بجے ـــ" آفرین بمشکل مسکرائی۔
"ہاں، بس ابھی ـــ میں بچوں کو لے کر آتی ہوں۔" وہ جھٹکے سے کہتی واپس پلٹ آئی جبکہ ہمایوں اور آفرین نے غصے و بے زاری سے اسے واپس پلٹتے دیکھا۔
سارے راستے وہ پتھر کا بت بنی رہی۔ اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی ہمایوں کی بے تکی باتوں پر بھی نہ ٹوٹی تھی۔ وہ بھی نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں و ذہن کے ساتھ کوئی خاص توجہ نہ دے سکا۔ گھر آکر اس نے عاصم کو کال کرکے ساری بات بتائی تھی۔ اب اسے پکا یقین تھا کہ عاصم ہمایوں کی خوب خبر لے گا۔ آئندہ سے وہ ان کے گھر بھی نہیں جائے گی۔ غصے اور اشتعال کی لہر نے اسے اپنے وجود میں لپیٹا ہوا تھا۔
دوسرے دن عاصم نے اسے کال کی تھی۔
"ندا! بچوں کو لے کر اپنے گھر چلی جاؤ۔ تمہیں میں طلاق کے کاغذات بھجوادوں گا۔ بچوں کا خرچہ ملتا رہے گا ـــ"
"کیا؟" وہ چیخ پڑی۔
"عاصم! تمہارا دماغ درست ہے؟ کیا کہہ رہے ہو تم ـــ"
"میں جو کہہ رہا ہوں ـــ وہ کرو ـــ میں مزید تم سے بات نہیں کرنا چاہ رہا۔" اس نے اپنی سنا کر فون منقطع کردیا۔ جبکہ وہ وہیں صوفے پر چیخیں مار مار کر رونے لگی۔
"مما! مما کیا ہوا؟ ـــ" بچے پریشان ہوگئے اس کے موبائل پر اب ہمایوں کی کال آرہی تھی۔
"تم نے میرے لیے جو زہر اگلا تھا نا اپنے خاوند کے دل میں ـــ میں نے بھی جوابی کارروائی کردی ہے۔ کہو کیسی لگی؟ تمہارے کنفشن ـــ تمہاری ادائیں ـــ میں نے ایک ایک لفظ عاصم کو بتایا ہے۔ میرے ساتھ آفرین نے بھی اس بات کی گواہی دی ہے۔

آفرین اور عاصم میں صرف اتنا فرق ہے کہ آفرین میری بات پر اندھا اعتماد کرتی ہے اور عاصم کو شاید ہی تم پر یقین آئے۔
میں نے عاصم کو بتا دیا تھا کہ یار خود دل لگی کرنے والی خاتون ہیں ماشاء اللہ سے تمہاری بیگم صاحبہ!"
"تم اپنی بکواس بند کرو۔" وہ پوری قوت سے چیخ کر بولی۔
"بلاوجہ کی فضول تعریفیں کر کرکے تم دونوں میاں بیوی میرے پیسے بٹورتے رہے ـــ"
"ہاں تو تمہیں بھی تو ہر وقت اپنے حسن کے لیے ستائش کی ضرورت پڑی رہتی تھی۔ ہر وقت فلمی ایکٹرسوں کی طرح بنی سنوری، اپنی نمائش کروانے ہمارے ہاں چلی آتیں۔ دنیا کا کوئی اندھا مرد ہی ہوگا۔ جس کے سامنے عورت خود دلربا ـــ دلنشیں بن بن کر آئے اور وہ تعریف و توصیف کے ڈونگرے نہ برسائے تمہارے جیسی عورتیں اگر [illegible] سے پہلے

گھروں سے بھاگ کر شادی کرتی ہیں تو شادی کے بعد بھی انہیں دل لگی کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چاہیے ہوتا ہے۔"

وہ مزید پتا نہیں کیا کچھ بولتا رہا۔ جبکہ وہ وہیں سن رہ گئی۔

اسے یہ دل لگی مہنگی پڑی تھی۔ عاصم کے چلے جانے کے بعد کچھ سال اس نے جس طرح گزارے تھے باقی کے بھی اسی طرح گزار دیتی۔ اس نے دل کا کہا ضرور مانا تھا مگر وہ بے وفا نہ تھی۔۔۔ بے وفائی کی اصطلاح بھی اس کی نظر میں خوب تھی۔

وہ تو صرف وقت کو خوشگوار کرنے کے لیے وقت گزاری کر رہی تھی۔ وہ کون سا ہمایوں یا ہمایوں جیسے مردوں کے ساتھ بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ مگر خبیث انسان نے اس کی بیٹی کو ہی۔۔۔ وہ جتنا سوچتی اتنا ہی دماغ اسے پھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔

وہ بچوں کے ساتھ گھر آگئی تھی۔ وہ گھر جسے اس نے ہمایوں کے لیے نہیں "عاصم" کے لیے چھوڑا تھا۔ مگر ہمایوں کے ساتھ اسکینڈلائز ہو گئی۔

گھر میں اس کا استقبال کون سا اچھا ہوا تھا۔ زندگی جہنم بن گئی تھی۔ بھابھیوں کا۔۔۔ماں کا سب کا رویہ بدل گیا۔ وہ ندا عاصم۔ جو پانچ ہزار سے کم کا سوٹ بھی زیب تن کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ اب کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئی۔ تعلیم بھی بس ایف اے۔۔۔

مقامی اسکول میں آیا گیری کرنے لگی۔ کلاسز کی صفائی اور بچوں کی دیکھ بھال۔۔۔ پھر بس رونا دھونا۔۔۔ طعن و تشنیع۔۔۔ اسے سمجھ نہ آئی ذرا سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔۔۔ اس نے اپنی فرسٹریشن ٹیچر طلعت کے سامنے نکالی تھی۔ جو اپنے اخلاق و کردار میں سب سے منفرد تھیں۔

"ندا! بے شک تم گھر سے بھاگی نہیں۔ تم عاصم کے ترغیب دلانے پر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئیں مگر تم نے اپنا اعتبار تب ہی کھو دیا تھا۔ جب تم نے یہ سب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔۔۔ بے اعتبار شخص کو چاہیے پھر عمر بھر اعتبار کے کچے دھاگے کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے ورنہ ہلکی سی ضرب پر بھی وہ ٹوٹ جاتا ہے مگر تم نے غلطی پر غلطی کی۔۔۔ تمہیں ہمایوں کی تعریف کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرنی چاہیے تھی کہ دل لگی کیا ہوتی ہے؟۔۔۔ بدکاری کی طرف بڑھایا جانے والا پہلا قدم۔۔۔ اور اگر پہلا قدم ہی برے راستے پر پڑ جائے تو ساری منزل کا گناہ لکھا جاتا ہے۔

بے شک اس نے ربیع کے ساتھ یہ سب کیا مگر تمہارے اعتبار کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ ساری بات اس نے تم پر الٹ دی۔

اب تم ربیع کی عاصم سے بات کرواؤ اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگو۔ اللہ ہی عاصم کا ذہن بدلے ورنہ زندگی بڑی طویل بھی ہو سکتی ہے اور تمہاری مشکلات میں اضافہ بھی۔" طلعت نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

اس نے دسمبر کی اسی گیلی رات میں رب کے حضور معافی طلب کی تھی۔ ربیع نے باپ کو ساری بات سمجھائی۔ اللہ کی مہربانی سے وہ اگلی فلائیٹ سے پاکستان آیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے اپنے بچوں اور بیوی کو گھر لے جانے کے لیے۔ سب بھلا کے۔

"کنواری لڑکی جب غلطی کرے تو دنیا پھر بھی کبھی نہ کبھی معاف کر دیتی ہے۔ مگر شادی شدہ عورت۔۔۔ ایسا کر بیٹھے تو معافی کی گنجائش بمشکل نکلتی ہے۔ عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں بیٹی! اب سنبھل جاؤ ربیع اب جوان ہو رہی ہے۔"

اماں نے آتے سے اس کے کان میں نصیحت کی تھی۔ جسے اس نے آنکھ سے لڑھکتے آنسو کے ساتھ پلو سے باندھ لیا تھا۔ کچھ نصیحتیں ٹھوکریں کھا کر ہی سمجھ آتی ہیں۔

☼ ☼

دل کا آسمان

عنبرین ولی

رات گہری ہوتی جارہی تھی۔ چہار سو گہری خاموشی کا راج تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا ایک ٹک چھت کو گھور رہا تھا۔ ذہن و دل غیر حاضر تھے۔ نگاہیں چھت پر جمی ہوئی تھیں اور تصور میں بس ایک ہی چہرہ دکھائی دے رہا تھا اور دل اس کے نام کی مالا جپنے میں مصروف۔

ہر انسان کو اپنی پوری حیات میں ایک بار تو ضرور ہی محبت ہوتی ہے اسے بھی ہوگی۔ مگر نہ جانے کیوں جب اسے محبت کا ادراک ہوا تو وہ بہت حیران ہوا ساتھ ہی ساتھ خوشی کے بے پایاں احساس نے بھی اس کے وجود کو تراوٹ بخشی تھی۔ اسے محبت بھی تو ایسی ہوئی تھی کہ بریرہ ارمان کے تصور میں کھو کر اسے بھوک لگتی نہ ہی پیاس کا احساس ہوتا۔ پوری پوری رات وہ اس کے تصور سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کی تمام تر سوچیں بریرہ کے گرد گھومنے لگی تھیں۔

بریرہ کا نام اس کے لیے زندگی بن چکا تھا مگر بریرہ۔ ایک تکلیف دہ احساس نے اسے کروٹ بدلنے پر مجبور کردیا۔ وہ جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا وہ اتنا ہی اس سے کتراتی تھی اور جب سے اس نے اظہار محبت کیا تھا تب سے تو وہ اس کے سائے سے بھی دور بھاگنے لگی تھی۔ وہ کئی دنوں سے بس یہی ایک بات سوچ رہا تھا کہ اس کے اظہار محبت پر اس نے اتنا شدید رویہ کیوں ظاہر کیا۔ وہ اس پر بہت بری طرح برسی تھی۔ بریرہ اس سے محبت نہیں کرتی اسے یہ بات معلوم تھی وہ آرام سے بھی انکار کرسکتی تھی۔ اس کا شدید رویہ اسے بری طرح الجھا رہا تھا۔ وہ جتنا اسے سوچتا رگ و پے میں اتری بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا۔ اسے کسی پل قرار نہ ملتا تھا۔ وہ اس کی محبت مسترد کرچکی تھی۔

"کاش بریرہ تم جان سکتیں کہ میں تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔" وہ درد بھرے لہجے میں اس کے تصور سے مخاطب ہوا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

☼ ☼ ☼
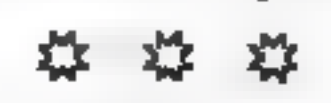
احتشام عزیز نے جب پہلی بار بریرہ کو دیکھا تھا تو اسے دیکھ کر وہ حیرت میں مبتلا ہوگیا۔ ارحمہ کے ساتھ وہ شاپنگ سینٹر آیا تھا اور وہیں خریداری کرتی بریرہ پر اس کی نگاہ پڑی تھی۔ سانولی رنگت کی مالک بریرہ جس کی خوب صورت آنکھوں پر نظر کا موٹا چشمہ لگا ہوا تھا۔ لمبی قمیص اور کھلی شلوار سر پر بڑا سا دوپٹا۔ اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"آج کے دور میں بھی کیا ایسے حلیے والی لڑکیاں موجود ہوتی ہیں۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑی ارحمہ سے پوچھا وہ کیا کہتی شانے اچکا کر رہ گئی۔ احتشام کی توجہ شاپنگ سے ہٹ چکی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے خود بھی وجہ معلوم نہیں تھی بس وہ اس لڑکی کو آبزرو کرنے لگا۔

اس کے انداز میں عجیب سی بے نیازی درحقیقت بے زاری تھی۔ اس کے ساتھ موجود لڑکی کافی اسٹائلش سی تھی۔ جدید فیشن سے آراستہ لباس میں وہ ٹھیک ٹھاک خوب صورت لگ رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس بڑے بڑے چشمے پہنے ہوئے لڑکی کو زبردستی شاپنگ کے لیے لایا گیا ہے۔

"زونی اب بس بھی کرو۔" اسے دھڑا دھڑ خریداری کرتے دیکھ کر وہ اسے ٹوک بیٹھی۔

"یار مجھے آج تک ایک بات سمجھ نہیں آئی اور وہ یہ کہ تجھے معلوم ہے کہ شاپنگ کرتے وقت تم بندے کو عاجز کردیتی ہو اور بس کرو بس کرو کی رٹ لگا کر ناک میں دم کردیتی ہو مگر پھر بھی میں ہمیشہ تمہیں ہی کیوں اپنے ساتھ لے کر آتی ہوں۔" وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرا اٹھی اور پھر کچھ کہنے کے لیے اس نے لب کھولے تھے کہ۔

"احتشام بھائی۔" وہ جو ان پر توجہ مرکوز کیے کھڑا تھا ارحمہ کی آواز پر چونک گیا۔ ارحمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی حرکت نوٹ کرچکی تھی۔ وہ نظرباز نہیں تھا اسی لیے اسے عجیب محسوس ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی احتشام نے فوراً اس کی توجہ خود پر سے ہٹانے کے لیے بولنا شروع کردیا۔ واپس آجانے کے بعد بھی وہ اس انجان لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور اچھی فیملی کی فرد لگ رہی تھی پھر اس کا حلیہ۔ اس کا حلیہ احتشام کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے کچھ دن بعد بھول جاتا جو اگر وہ اسے دوبارہ دکھائی نہ دے جاتی۔

☼ ☼ ☼

ارحمہ کی نظر کمزور تھی اور اس کا چشمہ ٹوٹ گیا تھا۔ دو روز پہلے وہ آرڈر دے چکی تھی اور اب وہ اس شاپ پر آیا تھا کہ چشمہ لے سکے اور وہیں وہ موٹے چشمے والی لڑکی اسے دکھائی دی آج بھی وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وہی اسٹائلش سی لڑکی موجود تھی۔ جسے اس نے زونی کے نام سے پکارا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں اسے کچھ سمجھا رہی تھی جبکہ وہ سرخ چہرہ لیے بن رہی تھی۔ وہ کاؤنٹر پر کھڑی تھیں اور ان کے سامنے قیمتی اور بے حد اسٹائلش گلاسز رکھے ہوئے تھے۔ نہ جانے زونی نے کیا کہا تھا کہ وہ ایک دم سے باہر نکلنے لگی۔

"بریرہ رکو تو 'بریرہ پلیز رکو۔" وہ اس کے قریب سے گزری تھی اور احتشام نے اس کی آنکھوں کو بھیگتے ہوئے دیکھا تھا۔ زونی اسے آوازیں دیتی اس کے پیچھے گئی تھی۔ وہ دونوں شاپ سے باہر نکل چکی تھیں۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر کاؤنٹر کے پاس آگیا۔

"کیا ہوتا جو بریرہ بی بی ان کی بات مان کر ذرا اسٹائلش گلاسز لے لیتیں۔" سیلزمین افسردگی سے بڑبڑایا۔ تو ساری بحث اس وجہ سے ہوئی۔

وہ پوری بات سمجھ گیا۔ یقیناً" زونی نے اس کے موٹے چشمے تبدیل کروانے کے جتن کیے ہوں گے اور ہزاروں کوششیں دی ہوں گی کہ وہ ساراتی ان کی بات مان لیں اور پھر غصے میں وہ صاحبہ اسے چھوڑ کر ہی چلی گئیں۔ عجیب لڑکی ہے۔ نمونہ بن کر گھومنے کے شوق میں مبتلا۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا اور اپنا سامان لینے لگا اور پھر صرف تین دن بعد وہ اسے یونیورسٹی میں دکھائی دی۔ اس تیسرے اتفاق پر وہ چونک کر رہ گیا۔ ہر جگہ یہی لڑکی۔ مسئلہ کیا ہے؟ اسے دیکھ کر وہ بے وجہ غصے میں آگیا۔ اس نے دونوں دفعہ جب اسے دیکھا وہ لمبی قمیص اور بے حد کھلی شلوار میں ملبوس تھی اور کپڑوں کے رنگ بھی ذرا ڈھنگ کے تھے۔ لیکن آج اس نے مردانہ رنگ پہن رکھا تھا ہلکا سرمئی رنگ بڑا سا دوپٹا سر پر لپیٹا تھا۔ سانولے رنگ اور موٹے چشموں کے ساتھ وہ ٹھیک ٹھاک عجیب لگ رہی تھی۔

"اس سے تو کوئی دوستی کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔" وہ مستقل اسی کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے نادر خیالات سے خود ہی مستفید ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اردگرد سے بے نیاز تھی۔ وہ تیسری مرتبہ اسے دیکھ رہا تھا اور احتشام کو یقین تھا کہ اس نے ایک بار بھی اسے نہیں دیکھا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں اسے یہ خبر بھی ہوگئی کہ وہ اسی کے ڈیپارٹمنٹ کی ہے مگر جونیئر۔ بہت سے نئے آنے والوں کی طرح نہ تو وہ کنفیوژ تھی اور نہ ہی پریشانی سے یہاں سے وہاں گھوم رہی تھی۔

کچھ ہی دن میں اس کی یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی کہ اس جیسے حلیے والی لڑکی سے کوئی بھی دوستی نہ کرے۔ بریرہ کی ذہانت اور اس کی بے حد خوب صورت آواز کے چرچے پورے ڈیپارٹمنٹ میں ہونے لگے۔ سینئر ہو کہ جونیئر ہر ایک اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ بریرہ ارمان 'ایک بے حد ہمدرد اور اچھی لڑکی ہے' بریرہ ارمان انتہائی ذہین لڑکی ہے اور اسی طرح کے بہت سے تعریفی جملے اس کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ وہ اکثر اسے دیکھتا تھا اور پھر بے وجہ ہی اسے سوچے چلا جاتا۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ اس سے مخاطب ہو مگر مخاطب ہونے کی وجہ اسے درکار تھی اور پھر اسے وجہ بھی مل گئی۔

وہ اسے لائبریری جاتا دیکھ چکا تھا سو اس کے پیچھے پیچھے لائبریری پہنچ گیا۔ وہ لائبریری میں موجود کتابیں دیکھ رہی تھی اور پھر ایک کتاب منتخب کرکے وہ پلٹی تو اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ اس کے چہرے پر ناگواری پھیلی مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ قریب سے گزرنے لگی تو احتشام نے اسے پکار لیا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے

اسے دیکھنے لگی۔ شاید منہ سے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا رکھی تھی اس نے۔

"مس بریرہ۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا آپ مجھے یہ کتاب دے سکتی ہیں۔ اصل میں میری چھوٹی بہن ارحمہ کو یہ کتاب چاہیے تھی۔ مارکیٹ میں بھی ڈھونڈی مگر دستیاب نہیں ہوئی۔ آپ کے پاس دیکھی تو میں نے سوچا آپ سے مانگ لوں۔" وہ اطمینان سے جھوٹ بول رہا تھا۔ بریرہ نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

"آپ کی بہن کو کون سی کتاب چاہیے تھی؟" اس کی آواز واقعی بہت سحر انگیز تھی مگر وہ اس خوب صورتی کو تب محسوس کرتا جب اس کا کیا گیا سوال اس کے ہوش نہ اڑاتا۔ کتاب کا سرورق اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ اب اسے کیا جواب دے۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا مگر خود کو سنبھال لیا۔

"یہی کتاب چاہیے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔" اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ بریرہ نے مزید کچھ کہے بغیر کتاب اسے تھما دی۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" احتشام نے شکر کا سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بنا کچھ بولے لائبریری سے باہر نکل گئی۔ وہ کتاب ہاتھ میں پکڑے کھڑا رہ گیا۔

"نہ جانے کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں؟ دل ہی دل میں اترا رہی ہوگی کہ میرے جیسا ہینڈسم لڑکا اس سے بات کرنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے اور اوپر سے نخرے۔" اس نے اپنے گزشتہ مشاہدات کو ذہن میں لاتے ہوئے اس کے بارے میں بھی رائے قائم کرلی۔ وہ اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے بریرہ کو دیکھنے اسے سوچنے کی عادت ہو گئی تھی اور اب بریرہ جب اور جہاں اسے دیکھتی وہاں سے ہٹ جاتی۔ اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی بریرہ کے حلیے میں، انداز و اطوار میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ اس کا رویہ ہر ایک سے دوستانہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بہت ریزرو تھی مگر ہر ایک سے بات کرنا اس کی کوشش نہ تھی۔ اس کی بات چیت صرف کلاس فیلوز سے تھی اور وہ بھی تب جب ضرورت ہوتی۔ بے وجہ قہقہے لگانا ہنسنا اسے پسند نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ احتشام کا اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنا اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹ ویک کیا شروع ہوا۔ ہر ایک بریرہ کے آگے پیچھے گھومنے لگا۔ احتشام بھی ان میں سے ایک تھا۔ اسے کسی سے معلوم ہوا تھا کہ بریرہ کسی رسالے میں لکھتی بھی ہے۔ وہ اس سے ڈرامہ لکھوانا چاہ رہا تھا۔ ان کا آخری سال تھا احتشام سمیت سب چاہتے تھے کہ یہ اسٹوڈنٹ ویک یادگار بن جائے۔ اسی لیے وہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہ دی۔ کسی سے پوچھنا بھی اسے عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے پورا ڈیپارٹمنٹ چھان لیا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ تھک کر کینٹین کی طرف ہو لیا اور اپنے لیے چائے لے کر باہر آگیا۔ کوریڈور سے گزرتے کھڑکی سے اندر اس کی اڑتی اڑتی نگاہ گئی اور اسے وہاں بریرہ بیٹھی دکھائی دے گئی۔ آنکھوں پر سے گلاسز ہٹے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر کلاس روم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

وہ دس منٹ سے کلاس روم کے دروازے میں کھڑا تھا اور ان دس منٹوں میں اس لڑکی نے ایک بار بھی یہاں وہاں گردن ہلا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ اپنے سامنے کھلے لنچ باکس پر تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اس بھرے ہوئے لنچ باکس کا صفایا کر رہی تھی اور اس کام میں اتنا مصروف و مگن تھی کہ دروازے میں کھڑے احتشام کی موجودگی اسے محسوس نہ ہوئی۔ کھانا کھا کر اس نے سب سمیٹا اور ٹیبل پر رکھے اپنے پرس میں سے پانی کی بوتل نکالنے کے لیے مڑی تو لمحے بھر کو ٹھٹک گئی۔ پھر کوئی بھی رسپانس دیے بغیر اس نے پرس میں سے بوتل نکال کر منہ سے لگائی پھر بوتل کو واپس اسی مقام پر رکھ کر اپنے بڑے سے پرس میں سے سیب نکال کر کھانے لگی۔ اسے خود پر احتشام کی نظروں کا ارتکاز محسوس ہو رہا تھا۔

"کھائیں گے؟" اس نے سیب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جب کھانا نہیں ہے تو یہاں کھڑے میرے نوالے کیوں گن رہے ہیں؟ میرے پیٹ میں درد کرنے کا ارادہ ہے کیا۔" وہ ذرا بگڑے لہجے میں بولی۔ احتشام مسکراتا ہوا اندر آگیا۔

"تمہاری صحت دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ تم اتنا کھاتی ہو۔" وہ اطمینان سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بریرہ جز بز سی ہو گئی۔ کلاس روم خالی تھا اگر کوئی ان دونوں کو یوں آمنے سامنے بیٹھا دیکھتا تو لمحے میں افسانہ بن جاتا۔ یہ سوچ آتے ہی وہ اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا ہوا؟ میری بات کا برا مان گئیں۔" وہ اس کی سوچ سے انجان پوچھنے لگا۔

"میں کسی ایرے غیرے کی بات کو اتنی اہمیت نہیں دیتی کہ مجھے وہ اچھی یا بری محسوس ہو۔ سو آپ اطمینان رکھیے۔" اپنی بات کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ جبکہ احتشام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ اس کی بے عزتی کر کے گئی ہے۔

"لعنت ہے مجھ پر میں اس کے آگے پیچھے گھومتا رہتا ہوں اسی لیے تو یہ مجھے اتنی باتیں سنا کر چلی گئی۔" وہ غصے سے کھولتا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

"یہ مجھے باقی لڑکوں کی طرح کا سمجھتی ہے۔ جو وقت گزاری کے لیے یونیورسٹی آتے ہیں اور لڑکیوں کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ میں تو کام کی وجہ سے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ چکی ہوگی۔" وہ اداس ہو گیا۔ دل یکدم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ تب ہی اس کی نگاہ ٹیبل پر پڑی وہاں اس کا موٹے فریم والا چشمہ پڑا ہوا تھا۔ چشمہ دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے خاموشی سے وہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ڈرامے کو وہ مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ اب بریرہ ارمان میرے پیچھے پیچھے آئیں گی۔ یہ سوچ اسے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔

اسے یہ بات سوچے محض دس منٹ ہی گزرے تھے کہ بریرہ اسے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

"سنیے۔" اس نے اپنی خوب صورت آواز میں ذرا جھجکتے ہوئے اسے پکارا۔ وہ اسی پکار کا تو منتظر تھا۔ اپنی خوشی چھپائے وہ سنجیدہ ہو کر اس کی طرف پلٹا۔ بنا چشمے کے وہ کافی معقول لگ رہی تھی۔ وہ بے حد غور سے اسے دیکھنے لگا۔ بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اف۔ اس کا دل ڈول کر رہ گیا۔

"وہ میں کلاس روم میں اپنے گلاسز بھول آئی تھی آپ نے اٹھائے تو نہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ احتشام آنکھیں پھاڑے اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ آخری جملے پر وہ ہوش میں آیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں چشمہ چور ہوں۔" وہ بگڑ کر بولا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ۔"

"سب جانتا ہوں میں۔ حد ہے۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ یوں میری بے عزتی کرو۔ خدا کا خوف ہے بھی کہ نہیں۔ مجھے چشمہ چور کہہ دیا۔" وہ باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر بولا۔ بریرہ شدید پشیمان ہو گئی اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ احتشام یکدم چپ ہو گیا۔ وہ بنا کچھ کہے پلٹ گئی اور احتشام نے اسے روکا بھی نہیں اور وہ پوری رات اس نے بریرہ کے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ پوری رات سو نہیں پایا تھا۔ اس کی بھیگی آنکھیں، گھبرایا لہجہ اس پر اثر کر چکا تھا۔ وہ تو بس اس سے بات کرنے کے چکر میں بولتا چلا گیا۔ اس کا تیز لہجہ بریرہ کو برا لگ سکتا ہے۔ یہ اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"میں کل صبح ہی اس سے سوری کرلوں گا۔" اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ اگلی صبح بریرہ غیر حاضر ہو گئی۔ وہ پورا دن بے چینی سے اس کا منتظر رہا۔

اسے اپنے سامنے دیکھنے کی خواہش نے اس شدت سے اس پر حملہ کیا تھا کہ وہ حیران ہو گیا۔ نہ تو اس نے کوئی کلاس لی اور نہ ہی عادت کے مطابق کینٹین کا چکر لگایا۔ اس کی غیر حاضری بہت بری طرح کھل رہی

تھی۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا اور یہ خواہش شدید ترین تھی۔ وہ بنا سوچے اس کی دوست کے پاس پہنچ گیا۔ اس سے بریرہ کے گھر کا ایڈریس مانگا اور وجہ یہی کہ اسے گلاسز واپس کرنے ہیں۔ اس نے اسے ایڈریس تھما دیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں وہ ان کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس کی مما سے بات کر رہا تھا۔ نگاہیں بے چینی سے یہاں وہاں اسے تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اپنا تعارف کروا چکا تھا اور اپنے آنے کی وجہ بھی بتا دی تھی۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکر ہے کہ بریرہ نے بھی کوئی دوست بنایا۔" وہ ان کی آواز پر چونکا۔ وہ اس کی مما کی ڈریسنگ دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ ان کی پوری فیملی میں بس بریرہ ہی عجوبہ ہے۔ وہ آزاد خیال گھرانے کی لڑکی تھی مگر اس کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اس کا نہ صرف مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ ہے بلکہ گھر کے افراد کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔

کچھ ہی دیر بعد اسے بریرہ دکھائی دی۔ وہ یقیناً" اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ وہی ڈھیلے ڈھالے بدرنگ کپڑے، دوپٹا سر کے بجائے کندھوں پر پھیلا تھا اور بال بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس پر نگاہ پڑی اور وہ بس ساکت سا رہ گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے نہ جانے کتنی صدیوں بعد وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"بریرہ۔" اس کی بے خود پکار پر وہ چونک کر پلٹی اور اسے دیکھ کر وہ جیسے حیران ہی رہ گئی۔

"آپ۔" وہ منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ احتشام اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

"بریرہ تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ یونیورسٹی میں تم نے دوست بھی بنا لیے۔ یقین مانو مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔" وہ حقیقتاً" بے حد خوش لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بریرہ کی مما نے کچھ دیر اور اسے کمپنی دی پھر وہ معذرت کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ یہاں میرے گھر؟" ان کے جاتے ہی اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"میں ــــــ سوری کرنے آیا ہوں۔" وہ اس کے ناگوار لہجے پر فوراً" سنجیدہ ہو کر بولا۔

"کل تمہارے جانے کے بعد مجھے وہ گلاسز وہاں رکھے دکھائی دیے تھے۔ میں نے اٹھا لیے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میرے پاس آؤ گی۔ میں نے تو بس اتنا سوچا تھا کہ تم سے ذرا شرارت کر کے تمہیں تمہاری امانت واپس لوٹا دوں گا۔ مگر کل تمہیں میرا مذاق بے حد ناگوار گزرا اور مجھے شرمندگی ہوتی رہی۔ یہ شرمندگی اتنی شدید تھی کہ میں رات بھر سو نہیں پایا۔" اس کے آخری جملے پر بریرہ نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں واقعی سوجی ہوئی اور سرخ ہو رہی تھیں۔ لہجے میں سچائی کی خوشبو تھی مگر وہ تو قسم کھا چکی تھی کہ اسے مرد ذات کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا۔

"آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا۔" اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنی جینز کی پاکٹ سے اس کے بھدے سے چشمے نکال کر اسے تھمائے۔

"اب میں چلتا ہوں۔" وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ بیٹھیے۔ روزینہ چائے لاتی ہوگی۔" وہ آداب میزبانی نبھانے کو بولی تھی۔ مگر وہ تو جیسے اس دعوت کا منتظر تھا فوراً" بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کے درمیان تعلقات خوشگوار تو نہیں ہوئے تھے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ آتے جاتے اگر وہ اسے دیکھ لیتی تو سلام دعا کر کے خیریت دریافت کر لیتی۔ وہ اسی میں خوش ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ معمولی سی لڑکی اس کے لیے بہت خاص ہو گئی ہے۔ نگاہیں ہمہ وقت اسی کو ڈھونڈتی، کان بس اس کی آواز سننے کو بے تاب ہوتے۔ اس کی رات بریرہ کے خیالوں میں گزرتی۔ اب جب سے اسے یہ ادراک ہوا تھا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے اپنی محبت سینے میں چھپا کر رکھنا اسے بے حد مشکل لگنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس میں انٹرسٹڈ نہیں مگر وہ اسے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہے اسے یہ بات اس روز معلوم ہوئی جب اس نے بریرہ سے اظہار محبت کیا۔

اس دن موسم بے حد خوشگوار تھا یا اسی کو خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی پہنچا تو اسے بریرہ کو ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ وہ لائبریری سے ملحق لان میں براجمان تھی۔ وہ تیر کی طرح اس کی طرف لپکا تھا۔

"ہیلو بریرہ کیسی ہو؟" وہ بے حد خوشگوار موڈ میں اس سے مخاطب ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر احتشام کو دیکھا جو معمول سے ذرا ہٹ کر تیار ہوا تھا اور کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں؟" وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کرتے ہوئے بولی۔ احتشام اب سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اپنی خیریت بتا کر وہ چپ ہو گیا۔ بریرہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"بریرہ میں تم سے ضروری بات کہنے آیا ہوں۔" سنجیدہ لہجے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ بے حد پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بریرہ آئی ــــ آئی لو یو۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہو گئی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اس نے بے حد صاف لہجے میں اس سے اظہار کر ڈالا۔ بریرہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں مگر مجھے امید ہے کہ تم بھی میری محبت میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ وہ دن دور نہیں جب تم بھی میرے بنا اپنی زندگی ادھوری تصور کرو گی۔" احتشام کے الفاظ اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

"تم بھی تو کچھ بولو۔" وہ اس کی مسلسل خاموشی اور سفید پڑتے رنگ کو دیکھ کر پریشان ہو کر بولا۔

"مسٹر احتشام مجھے آپ سے محبت نہیں یہ بات آپ جانتے ہیں۔ مجھے آپ اور آپ جیسے مردوں سے نفرت ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں معمولی شکل و صورت کی لڑکی آپ کے اظہار محبت کے بعد خود کو خوش قسمت تصور کرنے لگوں گی۔ آپ کو کیا لگتا تھا کہ آپ جو مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔ ان تمام رویوں سے میں اندر ہی اندر اتراتی تھی' خوش ہوتی تھی کہ آپ جیسا ہینڈسم لڑکا میری طرف متوجہ ہے۔ لعنت ہے آپ پر اور آپ کی سوچ پر۔ آپ یہ سوچ کر میری طرف بڑھے کہ مجھے کسی نے لفٹ نہ کرائی ہوگی تو آپ کے اظہار محبت کے بعد میں آپ کی طرف دوڑی چلی آؤں گی۔ آپ اپنی ڈگڈگی پر مجھے نچاتے رہیں گے تو آپ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ نہ تو مجھے کسی کا حسن متاثر کرتا ہے' نہ پیسہ اور نہ ہی ذہانت اب ایک نیک کام کیجیے کہ یہ الفاظ کسی اور لڑکی کی جھولی میں ڈال کر اپنے وقت کو رنگین بنائیں اور مجھے بخش دیجیے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بریرہ تیزی سے اپنی جگہ چھوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ تین دن سے یونیورسٹی سے غائب تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے انتظار سے جل اٹھی تھیں۔ اب تو وہ اس کے گھر جا سکتا تھا اور نہ ہی اس سے کسی طرح کانٹیکٹ کر سکتا تھا کیونکہ ان کی آخری ملاقات بے حد تلخ تھی۔ وہ اسے بہت برا سمجھتی تھی۔ اس کی کسی پیش رفت پر وہ مزید بپھر سکتی تھی۔ ناراض ہو سکتی تھی۔ جبکہ وہ اپنے بے چین دل کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔

اس کا دل یونیورسٹی میں لگا نہیں تو گھر آ گیا۔ اپنے کمرے میں وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ ایسا کیا کرے کہ بریرہ کو اس کی محبت پر یقین آ جائے۔ وہ اس کی محبت قبول کر لے۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا اور بیڈ پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بند پلکوں کے پار ایک بے حد خاص لڑکی۔

"احتشام۔" مما اس کے قریب بیٹھی تھیں۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو؟" وہ اس سے پوچھنے لگیں۔ احتشام نے ان کی گود میں سر رکھ لیا۔ اس کا جی چاہا کہہ دے کہ وہ ٹھیک نہیں۔ جب تک بریرہ اس کی زندگی میں شامل نہیں ہوجاتی، مگر ٹھیک ہوں کہہ کر خاموش ہوگیا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے بال سہلانے لگیں۔

"احتشام میں تمہاری ماں ہوں نا اور دوست بھی۔" وہ تمہید باندھنے لگیں۔

"مجھے بتاؤ آخر وہ کیا بات ہے جو تمہیں اتنا بے چین کیے ہوئے ہے۔ کیوں اتنے اداس اور اتنے پریشان ہو۔" وہ پوچھ رہی تھیں اور وہ تو جیسے ان کے لمس سے ہی پگھل گیا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ کسی کو خبر بھی نہیں ہونے دے گا کہ وہ ایک سنگدل کی محبت میں گرفتار ہوچکا ہے۔ مگر اپنی ماں کے سامنے وہ جیسے کسی ٹرانس کی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔

"مما میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ مگر وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ مجھ سے اس کی یہ نفرت برداشت نہیں ہوتی۔ اس کا روکھا رویہ مجھے بہت درد دیتا ہے۔" وہ ان کی گود میں چہرہ چھپا گیا۔ وہ چپ چاپ اس کا سر سہلانے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں انہیں اندازہ ہوا کہ وہ سو گیا ہے۔ بے اختیار ہی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔ ماں کی گود کا سکون اسے اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ان سے اظہار تو کرچکا تھا اب ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔ مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے کب تک ان کا سامنا نہ ہوتا۔

"احتشام میں سوچ رہی ہوں کہ بریرہ کو دیکھنے اس کے گھر چلیں۔ تم کیا کہتے ہو۔" وہ انہیں جیسے ہی دکھائی دیا۔ انہوں نے اس سے پہلی بات یہی کی۔ وہ حیران ہوگیا۔ اس کی مما حسن پرست خاتون تھیں اور فیشن کی دلدادہ۔ بریرہ انہیں پسند نہیں آئے گی اسے معلوم تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو یہی نا کہ بریرہ مجھے پسند نہیں آئے گی۔ تم ہینڈسم ہو پڑھے لکھے ہو تمہیں ایک سے ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے مگر ان لڑکیوں کا حسن بریرہ کی شرافت اور سادگی کے سامنے ماند پڑجائے گا۔ اگر مجھے چوائس دی جائے کہ حسن یا کردار میں سے ایک منتخب کرو تو میں کردار کو چنوں گی تو پھر تمہارے معاملے میں میں صرف خوب صورتی کو اہمیت کیسے دے سکتی ہوں اور سب سے اہم بات کہ وہ تمہیں پسند ہے۔ سو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم بریرہ سے پوچھ لو ہوسکتا ہے یہ سن کر کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو اور اظہار محبت کا مقصد وقت گزاری نہیں تھا تو اس کے رویے میں کچھ نرمی آجائے اور وہ اس معاملے میں اپنی رضا کو اوالو کرے۔" وہ تفصیل سے بولیں۔ احتشام کا جی چاہا کہ وہ ان کے گلے لگ جائے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

اگلے روز وہ اسے یونیورسٹی میں دکھائی دے گئی۔ بریرہ کا شمار ریگولر اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ اس نے آج سے پہلے شاید ہی چھٹی کی ہو۔ اسی لیے اس کی بنا اطلاع کے طویل غیر حاضری پر سب ہی حیران اور پریشان تھے اور اب اسے دیکھ کر ہر ایک اس سے وجہ دریافت کررہا تھا۔ وہ مضمحل اور بیمار لگ رہی تھی احتشام اسے دور سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے لائبریری جاتی دکھائی دی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے وہیں آگیا۔ بریرہ نے اسے دیکھ کر کوئی رسپانس نہ دیا۔

"بریرہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ جواب دیے بنا وہاں سے جانے لگی۔

"بریرہ پلیز رکو۔ میں تم سے بات کیے بغیر ٹلنے والا نہیں۔ تمہیں ہر صورت میری بات سننی پڑے گی۔" وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"اگر میں ایسا نہ کروں تو کیا آپ یہاں ڈرامہ کری ایٹ کریں گے۔" وہ بے حد اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھ کر مخاطب ہوئی۔ وہ اس کی سوچ پر حق دق رہ گیا۔

"بریرہ۔" اس کے لہجے میں کچھ تو تھا کہ وہ نگاہیں جھکا گئی۔

"آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کردیا ہے کہ تم نے مجھ سے کیا کیا ہے؟ تم سے محبت کی ہے تو کیا یہ اتنی بڑی غلطی ہے؟ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کون سی ناجائز بات کہہ دی۔ میں نے کب کہا کہ مجھے تمہیں گرل فرینڈ بنانا ہے یا لو افیئر چلانا ہے۔ مجھے غلط سمجھتی ہو اور برملا اس کا اظہار بھی کر ڈالتی ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ مجھے تمہارا رویہ کتنی تکلیف دیتا ہے۔" وہ دھیمے مگر دکھ بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ بریرہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تمہارے بنا اپنی زندگی نہیں گزار سکتا اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرلوں۔ میں اپنے گھر والوں سے بات کرچکا ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ میں کب تمہارے گھر رشتہ بھیجوں؟" اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے وہ بولتا چلا گیا۔ بریرہ نے بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ امید لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے محبت نہیں۔ میں آپ کے بغیر بہت اچھی زندگی گزار رہی ہوں اور مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت نہیں نہ ہی میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہشمند ہوں۔ اس لیے آپ اپنے پیرنٹس کو زحمت نہ دیں تو بہتر ہوگا۔" جتنے اطمینان سے وہ بول سکتی تھی بول کر چلی گئی۔ وہ غم و غصے کی حالت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ اپنے انکار کی وجہ بھی بتانے پر رضامند نہیں تھی۔ احتشام کا جی چاہا اسے جھنجوڑ کر پوچھے کہ وہ اتنی پتھر دل کیوں ہے؟ وہ کیوں اس کے ساتھ یہ سب کررہی ہے؟ وہ خود پر قابو پاتا وہاں سے نکل آیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بریرہ کو ہی اپنائے گا۔

وہ یونیورسٹی سے سیدھا گھر آیا اور اتفاق سے مما بھی گھر پر موجود تھیں۔ وہ تو بریرہ کے گھر جانے کی خواہش لیے بیٹھی تھیں۔ اس کے کہنے پر وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ بنا اطلاع اور بغیر اجازت کے وہ ان کے گھر کیسے جاسکتے تھے۔ احتشام انہیں حقیقت بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اگر وہ اس کی اور بریرہ کی حالیہ گفتگو جان لیتیں تو کبھی ان کے گھر نہ جاتیں۔ احتشام نے جلدی جلدی کا شور مچا کر انہیں تیار کر رکھ دیا۔

بریرہ اسے انکار کرچکی تھی۔ رشتہ لے جانے کے بعد بھی اس کی طرف سے انکار لازمی تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات موجود تھی۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی اس کی مما کو پسند آچکا ہے۔ یہ بات وہ جانتا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کی سچائی ضرور ان پر اثر کرے گی اور وہ بریرہ کو مجبور کریں گی اور ایک بار بریرہ اس کے نام ہوگئی تو اسے یقین تھا کہ وہ اس کے دل میں اپنی محبت روشن کردے گا۔ اس سوچ نے اسے اطمینان دلایا تھا۔

وہ جب ان کے گھر پہنچے تو کھانے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی تھی۔ مما مزید شرمندہ ہوگئیں مگر وہ بے حد مطمئن لگ رہا تھا۔ بریرہ کی مما انہیں اچانک دیکھ کر نہ صرف حیران ہوئیں بلکہ خوش بھی۔ احتشام انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ رہی اس کی مما کی بات تو دونوں خواتین چونکہ ایک جیسے شوق رکھتی تھیں تو فوراً ہی گھل مل گئیں۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ مطلب پر آگئیں۔

"ہم یہاں خاص مقصد کے لیے آئے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ بریرہ کی والدہ کو کچھ اندازہ تو ہو ہی چکا تھا۔

"احتشام کو آپ کی بریرہ بے حد پسند آئی اور اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواہشمند ہے۔ میں بریرہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور اسی وقت بریرہ تھکے ہارے انداز میں داخل ہوئی تھی۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ بریرہ کو بھی سمجھائیں ہمیں جواب ہاں میں چاہیے۔" ان کے آخری الفاظ اس کی سماعتوں میں اترے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"بریرہ کو کیا سمجھائیں؟" وہ حیران سی بولتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ احتشام پر نگاہ پڑتے ہی وہ پوری بات سمجھ گئی مگر اخلاق نبھانا ضروری تھا۔ سو طریقے سے سلام کرکے خیریت دریافت کرلی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا

کہ وہ کھڑے کھڑے اسے بے عزت کردے۔

"احتشام اور ان کی مما آپ کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔" مما نے ان کے آنے کی وجہ بتائی۔

"میرا رشتہ۔ مگر میرا تو نکاح ہو چکا ہے۔" وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں بے حد اطمینان تھا۔ احتشام تو احتشام، بریرہ کی مما بھی اپنی جگہ سے اچھل کر رہ گئیں۔

"کیا بکواس کر رہی ہو بریرہ۔" غصے اور حیرت سے ان کی آواز پھٹنے کے قریب ہو گئی تھی۔ احتشام کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

"مما میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آج سے چار سال پہلے ابا نے میرا اور میرے پھوپھی زاد زبیر کا نکاح کروایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے آپ کو اتنی بڑی حقیقت سے کیوں بے خبر رکھا۔ اگر آپ کو یہ لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو میں نکاح نامہ بھی دکھا سکتی ہوں اور تصاویر بھی۔" وہ یوں بول رہی تھی جیسے کوئی بے حد معمولی بات کر رہی ہو۔ اس کی مما سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ احتشام اور اس کی مما چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئے۔ احتشام کے شکستہ قدموں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بریرہ کو دلی سکون محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آکر کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ جبکہ مما شدید غصے میں تھیں۔ انہیں بریرہ کی یہ حرکت سخت طیش میں جلا کر چکی تھی۔ شام میں انہوں نے پوری بات عزیز صاحب کے بھی گوش گزار کر دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔

"مجھے تو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے اور یہ بات اس کی ماں کو بھی معلوم نہیں۔ احتشام کے سامنے تو اس نے اپنے آپ کو بے حد نیک اور پاکیزہ ظاہر کر رکھا تھا اور حقیقت میں۔۔۔ ہونہہ۔" انہوں نے عزیز صاحب کی موجودگی کے باعث بہت سے نازیبا الفاظ کو اپنے لبوں پر ہی روک لیا تھا مگر اس کے باوجود وہ غصے میں آگئے۔

"بیگم صاحبہ دوسروں کی بیٹیوں کو کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ آپ کی بھی ایک بیٹی ہے۔ رہی بات بریرہ کی تو تمہاری پوری گفتگو سے مجھے یہی لگا ہے کہ وہ واقعی اچھی لڑکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یقیناً" بریرہ کی ماں اور ان کے شوہر کے درمیان اختلافات رہے ہوں گے اسی لیے بریرہ کا نکاح انہوں نے نہ صرف اپنی مرضی سے کروایا بلکہ اس بارے میں انہیں اطلاع تک نہ دی اور یقیناً" انہوں نے بریرہ کو بھی خاموش رہنے کو کہا ہو گا اور وہ اسی لیے احتشام کے جھکاؤ کو دیکھنے کے باوجود اسے انکار تو کرتی رہی مگر حقیقت نہ بتا سکی اور جب آپ لوگ ان کے گھر پہنچ گئے تو اسے مجبوراً" ساری بات بتانی پڑی ہو گی۔" وہ نرمی سے بول رہے تھے۔ ان کی ہر بات جیسے مسز عزیز کے دل کو لگی وہ چپ ہو گئیں۔

"اب احتشام کا کیا کیا جائے؟ اس کی تو بہت بری حالت ہو گئی تھی اور جب سے وہاں سے واپس آیا ہے اس نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"چوٹ لگی ہے ابھی تکلیف میں ہے وہ جذباتی بھی ہو رہا ہو گا مگر آہستہ آہستہ اسے سمجھ آجائے گا کہ بریرہ اس کے لیے نہیں بنی۔ پھر خود ہی سنبھل جائے گا۔ اسے وقت درکار ہے' اسے وقت دو۔۔۔ وہ سنبھل جائے تب اس کی شادی کردیں گے۔ شادی کے بعد بریرہ کون تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہے گا۔" وہ انہیں تسلی دینے کو بولے۔ دونوں چپ چاپ اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

بریرہ کا نام کسی اور کے نام سے جڑا ہے۔ یہ خبر بجلی بن کر اس پر گری تھی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ بے چینی اس کے وجود کے ایک حصے کو تکلیف میں مبتلا کر دیتی۔ وہ اس کے وجود میں لہو بن کر دوڑنے لگی تھی اب اسے پانے کی امید کھو چکا تھا۔ اس نے خود پر پہرے بٹھا لیے تھے۔ بریرہ کو دیکھ کر وہ رخ ہی موڑ

لیتا اور ایسا کرتے بے شمار اذیتیں اس کی روح کو گھائل کر دیتیں۔ بظاہر وہ اس سے الگ ہو چکا تھا۔ مگر یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بریرہ کے لیے اس کی محبت میں بس اضافہ ہی ہوا ہے۔ مگر اب اس محبت کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھنا ہے' یہ اس نے سوچ لیا تھا۔

حتیٰ کہ اس روز کے بعد اس نے گھر میں بھی اس بات کو دوبارہ ڈسکس کیا تھا اور نہ ہی اپنی مما کو یہ بات ڈسکس کرنے دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے بستر پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب زونی بے حد غصے میں آئی۔ زونی کے تیور دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ جلدی سے کتاب بند کی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آؤ زونی' بیٹھو۔" اس نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں سائیڈ ٹیبل پر رکھتی زونی نے غصے میں اس کے ہاتھ سے چشمہ جھپٹ لیا اور زور سے دیوار سے دے مارا۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے خود کو آخر سمجھ کیا رکھا ہے؟" وہ چلا کر بولی تھی۔ بریرہ حیرانی اور صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ زونی کا اتنا شدید رویہ۔۔۔ وہ سمجھنے سے قاصر ہو گئی۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟" وہ چند دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی جبکہ زونی اب تک کھڑی تھی اور بے حد غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پلیز زونی' بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"احتشام اپنی مما کو لے کر آیا تھا اور تم نے۔۔۔" اس نے تو ہی بات ادھوری چھوڑ دی۔ بریرہ نے تیزی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔

"ہم آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں نا' پلیز تم بیٹھو۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ زونی کے تیور خطرناک تھے اور بریرہ بے حد پریشان۔

"میری ایک بات تو تم کان کھول کر سن لو بریرہ' میں تمہیں بے وقوفوں پہ بے وقوفیاں کرنے نہیں دوں گی۔ میں ساری حقیقت مما کو بتا دوں گی۔" وہ بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم کبھی بھی ممی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔" جواباً" وہ بھی بگڑے لہجے میں بولی۔

"ہاں کیا تھا وعدہ مگر ساتھ ہی ساتھ ایک شرط بھی رکھی تھی اور تب تم نے مجھ سے بھی یہ وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔"

"میں نے وعدہ نہیں توڑا۔"

"تم وعدہ توڑ چکی ہو بریرہ۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ احتشام اول روز سے ہی مجھ پر نظریں فوکس کیے ہوئے تھا اور وہ۔۔۔"

"تم کب مثبت طریقے سے سوچنا شروع کرو گی' ہاں۔۔۔ تمہیں تمام مرد زبیر جیسے کیوں لگتے ہیں۔" وہ بے حد غصے میں تھی۔ بریرہ تھک کر بیٹھ گئی اور اپنا سر جھکا لیا وہ رو رہی تھی۔ زونی ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم آگے کیوں نہیں بڑھتیں؟ کیوں اپنے آپ کو وہیں اسی ایک لمحے میں قید کیے ہوئے ہو۔ جو ہونا تھا ہو چکا آگے بڑھو' اس خوف سے خود کو آزاد کرو۔" اب وہ اسے پھر سے نرمی اور محبت سے سمجھا رہی تھی۔

"تمہاری اس خاموشی کو میں کیا سمجھوں؟" زونی بے حد سنجیدہ تھی۔ بریرہ نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔

"اگر تم ممی کو ساری حقیقت بتانا چاہتی ہو تو بتا دو مگر پھر مجھ سے کوئی گلہ مت کرنا۔" اس نے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری اس بات کا میں کیا مطلب سمجھوں۔"

"میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"کہاں جاؤ گی؟ زبیر کے گھر؟" اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی طنز در آیا۔

"میں جہاں بھی جاؤں یہ تمہارا سر درد نہیں۔" وہ بے رخی سے بولی۔

ہتھ چاہے جو بھی دھمکی دو دیرو لیکن اب میں سوچ چکی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ بریرہ نے غصیلی نظروں سے دیکھا۔

"میں زونیو کچھ بھی کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ تمہاری کسی بھی حرکت کے بعد میرا رویہ تمہاری برداشت کے قابل ہوگا کہ نہیں۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے ہی نکل گئی جبکہ زونیو اس کے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا دماغ بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ جو کچھ سوچ رہی تھی کرنا بے حد مشکل اور خطرناک تھا مگر بریرہ کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

وقت کا کام گزرنا ہے وہ ہر حالت میں گزرتا ہے۔ مگر ہماری زندگی کی موجودہ حالتیں ہمیں وقت کی تیزی یا سست رفتاری کا احساس دلاتی ہیں۔ اس کی زندگی بھی گزر رہی تھی۔ اسے یہی لگتا تھا کہ خوشیوں کی عمر کم ہوتی ہے۔ بریرہ نے اپنی زندگی اپنے بابا کے سنگ گزاری۔ بچپن لڑکپن اور پھر جوانی کے دنوں میں بھی ماں کی محبت نہیں ملی اور اسے کبھی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس کے بابا اس سے پوری کائنات سے بھی کہیں زیادہ محبت کرتے تھے اور وہ ان کی محبت سے ہی مطمئن تھی۔ ارمان صاحب کی موجودگی میں اسے کبھی بھی کسی رشتے یا کسی دوست کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ اس کا سب کچھ تھے اور وہ ان کا سب کچھ تھی۔

اس کی مما ایک پڑھی لکھی اور ماڈرن گھرانے کی خاتون تھیں۔ ان کا تعلق ہائی سوسائٹی سے تھا۔ اس کے بابا بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھے مگر ان کا خاندان دین دار تھا۔ دونوں نے محبت کی اور پھر شادی بھی کرلی۔ ارمان صاحب کو ان کے حلیے' ان کے بے نقاب آنے جانے پر اعتراض نہ تھا۔ مگر ان کی فیملی کو ضرور تھا اور اسی وجہ سے جھگڑے شروع ہو گئے۔ ان کے خاندان کے لوگ خوب باتیں بناتے۔ ارمان صاحب کو پٹیاں بھی پڑھاتیں مگر وہ چاہتے تھے کہ ان کے شریک حیات اپنی مرضی سے مذہب پر عمل کریں۔ مذہب میں جبر نہیں' وہ نہ صرف اس بات کو مانتے تھے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھے۔

پہلی بیٹی زونیو پیدا ہوئی وہ ہو بہو ماں جیسی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں' لمبی ناک' گلابی ہونٹ' چمکتی گندمی رنگت' پہلی بیٹی کی پیدائش سے ان کے درمیان گھریلو جھگڑوں کے باعث جو ہلکی پھلکی ناچاقی تھی وہ بھی ختم ہو گئی مگر ارمان صاحب کی بہن مائدہ کو بے وجہ ہی اپنی بھاوج سے چڑ تھی۔ وہ جان بوجھ کے اپنے لفظوں' جملوں سے آگ لگاتیں۔ زونیو کی پیدائش کے بعد انہیں ایک مضبوط جواز مل گیا۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے یہی بات کہتیں کہ جو عورت خود بے پردہ اور شتر بے مہار گھومتی ہے وہ اپنی اولاد کی کیا خاک تربیت کرے گی اور اسی طرح کے بہت سے جملے ان کے منہ سے ادا ہوتے رہتے۔ مائدہ خود بھی کوئی بے حد سخت پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ثروت بھی چادر لینے پر راضی ہونے لگی تھیں۔ ارمان صاحب سے انہیں محبت تھی اور وہ ان کی یہ بات ماننا چاہتی تھیں مگر جب ان کی اس طرح کی باتوں کے جواب میں وہ خاموش رہتے تو وہ غصے اور ضد میں آجاتیں۔ ان کا ضدی رویہ ارمان صاحب کو بھی طیش میں مبتلا کر دیتا۔

دوسری بیٹی بریرہ کی پیدائش ہوئی تب تک ضد اور انا کے باعث ان کے درمیان تعلقات کافی خراب ہو چکے تھے۔ بریرہ سانولی سی' بڑی بڑی آنکھوں والی پیاری سی بچی تھی۔ زونیو اگر ماں جیسی تھی تو بریرہ اپنے باپ کا پرتو تھی۔ پیدائش کے بعد بیمار ہونے کے باعث وہ کمزور ہوتی چلی گئی اور رنگت مزید سنولا گئی۔ وہ ان دونوں میں ذرا بھی فرق نہ رکھتی تھیں مگر مائدہ کو یہ لگتا کہ وہ اپنی گوری چٹی بچی کو زیادہ پیار کرتی ہیں۔ ایک' دو بہت ہی بے ضرر واقعات جن میں انہوں نے بے تحاشا روتی زونیو کو پہلے کھانا کھلا دیا تھا اور بریرہ کو اس کے بعد۔ انہی باتوں کو بڑھا چڑھا کر انہوں نے ارمان صاحب کے خوب کان بھرے۔ وہ ان سے پہلے ہی بدظن تھے مائدہ کی مسلسل برین واشنگ نے انہیں

مزید متنفر کر دیا اور جب انہوں نے اس بات کو ایشو بنا کر دل کی ساری بھڑاس نکالی' ان پر خوب برسے تو وہ چپ چاپ دونوں بچیوں کو لے کر گھر سے جانے لگیں مگر ارمان صاحب نے بریرہ کو ان سے چھین لیا یہ کہہ کر وہ اپنی دونوں بچیوں میں فرق رکھیں گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا چلا گیا۔ وہ کانوں کے کچے تھے۔ غلطی دونوں کی تھی مگر معاملہ بگاڑنے میں سارا ہاتھ ان کا اپنا تھا اور پھر مائدہ جو بھابھی کی موجودگی میں تو خوب ہی پیار جتایا کرتی تھیں اب بریرہ کے وجود سے بے زار دکھائی دیتیں۔ ان کی تمام تر توجہ زبیر پر ہوتی۔ وہ کوئی بے وقوف تو تھے نہیں' ان کی مصنوعی محبت کا ادراک انہیں جلد ہو گیا اور انہی دنوں مائدہ کے شوہر بھی بیرون ملک سے واپس آگئے۔ تو وہ ان کے ہمراہ اپنے گھر چلی گئیں۔ اب صحیح معنوں میں انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ کیا غلطی کر چکے ہیں۔ صلح صفائی کی کوشش کی مگر ثروت نے طلاق مانگ لی اور ارمان صاحب نے بھی ہمیشہ کی طرح انہیں منانے یا روکنے کی بجائے ان کی بات مان لی۔

بریرہ بڑی ہوتی جارہی تھی۔ کمزور نظر کے باعث بچپن سے ہی موٹے چشمے لگ گئے تھے۔ جو بچپن کے دور میں تو اس پر خوب جچتے تھے' مگر لڑکپن میں اسے بوجھل سی لڑکی ظاہر کرتے۔ اس نے کبھی اپنا اسٹائل تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مائدہ اکثر اسے فون کرتیں اور اس کی مما کی بے ہودہ ڈریسنگ ہی ان کا پسندیدہ موضوع ہوتی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ وہ بھی اپنی ماں جیسی ہے۔ اس نے خود کو ہر شے سے دور کر دیا۔ اس کے دل میں یہ خوف بس چکا تھا کہ اگر وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح بنے سنورے گی۔ جدید انداز کے لباس پہنے گی تو اس کے پاپا بھی اسے خود سے دور کر دیں گے۔ جس طرح سے مما کو اپنی زندگی سے نکالا تھا بالکل اسی طرح سے وہ اسے بھی اپنی زندگی سے نکال دیں گے۔ جبکہ ارمان صاحب کو تو وہ اس حلیے میں بھی اتنی ہی پیاری اور عزیز تھی۔ انہوں نے کبھی اس کی ڈریسنگ پہ توجہ ہی نہیں دی۔ ان کے محلے کی دو دن جیسے کپڑے سی کر دیتی وہ پہن لیتی۔ یہ نہیں تھا کہ اس میں ڈریسنگ سینس نہ تھا مگر وہی مائدہ کی باتوں نے اسے ہر فیشن حتیٰ کہ سادہ سی فٹنگ والی قمیص تک پہننے سے باز رکھا تھا۔ ارمان صاحب کی طلاق کے محض تین سال بعد ہی مائدہ اپنی فیملی کے ہمراہ دوسرے شہر جا بسی تھیں۔ سال کے سال چکر لگاتیں زبیر بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ بریرہ کسی سے بھی گھلتی ملتی نہیں تھی۔ اپنی اکلوتی پھپھی کی طنزیہ باتوں کے خوف سے وہ خود کو کام میں الجھائے رکھتی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ میٹرک کے بعد فارغ تھی۔ مائدہ پھر سے اپنے شہر واپس آگئیں۔ زبیر بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس کا یہی ارادہ تھا کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اپنا ماسٹرز مکمل کرے اور رہائش ماموں کے گھر ہی تھی۔ وہ ان کی آمد سے بے سکون ہونے لگی۔ زبیر اسے خوب ہی گھور گھور کر دیکھتا ——— خوب صورت سا زبیر اسے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا اور وہ اس سے اجتناب برتتی اور اس بار تو مائدہ نے بھی اپنا رویہ بہت تبدیل کر لیا تھا۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں' گھریلو کاموں میں مدد' ان کی آمد نے اسے دھیرے دھیرے ہی سہی اعتماد بخشا تھا۔ ان کا یہ رویہ اس پر بہت تیزی سے اثر کر رہا تھا وہ خوش رہنے لگی۔

ارمان صاحب اس کے چہرے پر پھیلی خوشی دیکھ کر بے حد مطمئن ہو گئے تھے اور مائدہ نے جو مانگا تھا ان سے' ان کے حوالے کرنے میں وہ جس جھجک اور گھبراہٹ کا شکار تھے وہ بھی ختم ہو گئی۔ ان کی بیٹی شادی کے بعد خوش اور مطمئن رہے گی۔ اپنے خاندان میں ہی رہے گی۔ اس سوچ نے انہیں زبیر اور بریرہ کا نکاح کرنے پر اکسایا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بار اس کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ انکار نہیں کرے گی اور یہی ہوا وہ چپ

چاپ سر جھکا گئی۔ بے حد سادگی سے نکاح کا فریضہ ادا کیا گیا اور پہلی بار اسے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ جبکہ ارمان صاحب تو ہر ہر لمحہ انہیں یاد کرتے تھے۔ نکاح کے بعد تو جیسے زبیر پگھل ہی گیا۔ بہانے بہانے سے اسے بلاتا' باتیں کرتا' وہ جھجکتی تھی' اسے یوں اس کا بلانا' رومانی باتیں کرنا اچھا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اسے اچھا لگنے لگا۔ وہ اسے ان کے رشتے کی اہمیت کا خوب ہی احساس دلاتا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے' اس کی نیک فطرت سے متاثر ہے اور اب وہ اس کی زندگی بن چکی ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے جملے وہ موقع دیکھتے ہی اس کے کانوں میں انڈیلتا اور وہ خود کو خوش قسمت تصور کرتی۔ حقیقت کیا ہے' اسے بہت بعد میں خبر ہوئی اور تب جیسے سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا۔

✡ ✡ ✡

زبیر کو آج کل کے ہر لڑکے کی طرح اسٹائلش' خوب صورت اور بااعتماد لڑکیاں پسند تھیں مگر ماں کے مجبور کرنے پر وہ بریرہ کو اپنانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اتنا بھی فرماں بردار بیٹا نہیں تھا کہ ایک معمولی سی لڑکی کو اپنانے کے لیے راضی ہو جائے۔ جبکہ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی اس کے اشارے کی منتظر تھی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر بریرہ کو اپنایا تھا۔ وہ اپنی ماں کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر کوئی اور لڑکی اس کی ماں کی بہو بنی تو گھر ہر وقت جنگ کا میدان بنا رہے گا اور گھر کا سکون برباد ہو جائے گا۔

اور بریرہ وہ تو تھی ہی اللہ ـــ کی گائے' مائدہ سے دبتی بھی بہت تھی۔ صرف بریرہ ہی مائدہ کے لیے بہترین بہو ثابت ہوتی' مگر وہ اس کے لیے بہترین بیوی نہیں ہے یہ بھی اسے معلوم تھا' اسے ماڈرن' بے باک لڑکیاں پسند تھیں اور وہ سوچ چکا تھا کہ وہ ایسی ہی لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس کے پاس پیسہ' خوب صورتی اور شاطر دماغ موجود تھا۔

اسے ایسی عورت درکار تھی جو اسے گھر کا سکون بھی مہیا کرے اور اس کے ساتھ ہائی سوسائٹی میں بھی موو کر سکے اور ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں تھا' اسی لیے وہ اپنی ماں کے لیے بریرہ کو منتخب کر چکا تھا اور اب اپنے لیے لے تلاش تھی۔ مائدہ اس کی سوچ سے لاعلم تھیں۔ بہت سالوں بعد ہی سہی مائدہ کو بریرہ سے محبت محسوس ہونے لگی تھی مگر اب جو کچھ ان کا بیٹا سوچ چکا تھا۔ اس کی سوچ رشتوں میں دراڑ ڈالنے والی تھی۔

✡ ✡ ✡

پڑھائی مکمل ہو جانے کے بعد اسے نوکری بھی مل گئی۔ اس کی جاب دوسرے شہر میں تھی۔ مائدہ رخصتی کروانا چاہتی تھیں مگر اس نے مزید دو سال کا وقت لے لیا تاکہ بریرہ اپنی پڑھائی مکمل کر لے۔ پہلے پہل ہر روز اس کے فون آتے تھے پھر آہستہ آہستہ رابطے میں کمی ہونے لگی۔ گزرے وقت میں وہ اس کے بے حد قریب آچکی تھی۔ اب بریرہ اسے پسند تھی۔ مگر اس پسند کو وہ پسند ہی رکھنے کا خواہش مند تھا۔ اس کی عادات تھیں ہی ایسی کہ کوئی بھی اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن وہ بریرہ جیسی لڑکی کو اپنے دوستوں میں متعارف کروا کر اپنا مذاق کیسے بنواتا؟ اس نے خود کو اس سے دور کرنا شروع کر دیا۔ اسے بس چند دن ہی لگے تھے۔ بریرہ کی کمی اسے پھر محسوس ہی نہ ہوئی۔

اب اس کی زندگی میں ثانیہ تھی۔ وہ بالکل ویسی تھی جیسی اسے خواہش تھی۔ وہ اسے اپنے نکاح کی جھوٹی سچی داستان سنا کے شادی کے لیے راضی کر چکا تھا۔ ثانیہ کی تسلی کے لیے اس نے بریرہ کی تصویر بھی اسے دکھا دی' تاکہ اس کے تمام خدشات سرے سے ختم ہو جائیں۔ تصویر دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ زبیر کو زبردستی نکاح کے بندھن میں باندھا گیا ہو گا۔ مگر اس کی شرط تھی کہ وہ اسے طلاق دے اور وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر اسے بریرہ کو طلاق ہی دینی ہوتی تو وہ اس سے نکاح ہی کیوں کرتا۔

حقیقت تو وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا البتہ ثانیہ کی ضد کا حل بھی اس نے ڈھونڈ لیا۔ مزید ایک بہانہ جس میں

کچھ حقیقت بھی تھی اور وہ یہ کہ اگر وہ بریرہ کو طلاق دے گا تو ثانیہ کو مائدہ کبھی قبول نہیں کریں گی۔ البتہ اگر وہ ثانیہ سے شادی کر لیتا ہے تو اسے قبول کر لیا جائے گا اور پھر آہستہ آہستہ بریرہ کو اپنی زندگی سے نکال دے گا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور بریرہ کو آج ہی چھوڑ دے تو ان دونوں کی زندگی عذاب ہو جائے گی۔ مزید دو چار باتیں لگا کر وہ ثانیہ کو منا چکا تھا۔ وہ خود کوئی بے وقوف لڑکی تو تھی نہیں۔ اپنا تمام نفع نقصان دیکھنے کے بعد اس نے زبیر کو منتخب کیا تھا اور اب اسے محض بریرہ کی وجہ سے چھوڑنا سراسر بے وقوفی لگتی تھی۔ بریرہ کا پتہ تو وہ آرام سے صاف کر سکتی تھی اور اس نے یہی کیا۔ اپنے اور زبیر کے ولیمے کے محض پندرہ دن بعد اپنی اور اس کی تمام تصاویر بمعہ نکاح نامہ کی فوٹو کاپی کے بریرہ کے پتے پر ارسال کر دی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ تم مجھ سے سوال جواب کرو؟ شکر کرو کہ تمہارے نام کے ساتھ میرا نام لگ گیا ہے۔ ورنہ تم جیسی احمق اور بدشکل لڑکی کو کون پوچھتا؟ تمہیں نہ پہننے اوڑھنے کا پتا ہے اور نہ ہی یہ پتا کہ ہائی سوسائٹی میں کیسے موو کیا جاتا ہے۔ تم اور تم جیسی لڑکیاں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں۔ میری مما کو تم پر ترس آگیا تھا۔ بس اسی لیے میں نے ہاں کر دی اور تم۔ تم خود کو نہ جانے کیا سمجھنے لگیں۔

ثانیہ میری بیوی ہے' وہ میری محبت ہے' تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں اور ہاں ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے کسی کو حقیقت بتائی تو میں لمحے کا انتظار کیے بغیر تمہیں طلاق دے دوں گا اور پھر سوچ لو کہ کیا ہو گا۔ تمہارے پیارے ابا یہ صدمہ برداشت کر سکیں گے؟ اگر وہ یہ بات برداشت کر بھی لیں تو بتاؤ کون ہے جو تم جیسی لڑکی سے شادی کرے گا؟ کون تمہیں اپنائے گا؟ بہتری اسی میں ہے کہ اپنا منہ بند رکھو۔" وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ فون کان سے لگائے حق دق سن رہی تھی۔

پارسل اسی نے وصول کیا تھا۔ ارمان صاحب تو دیر سے گھر آتے تھے اور مائدہ سوئی ہوئی تھیں۔ پارسل کھولنے کے بعد سے اس کی حالت بہت بری تھی اور پھر اس نے کانپتی انگلیوں سے زبیر کا نمبر ملایا تھا۔ وہ اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ یہ تصاویر جھوٹی ہیں۔ کسی نے ان کے خلاف سازش کی ہے۔ مگر زبیر نے تو جیسے شکر ادا کر کے کڑوی سچائی اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ وہ بہت دیر تک خالی خالی نظروں سے آئینہ دیکھتی رہی۔ زبیر نے جو دیدہ دلیری دکھائی تھی اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ طلاق کے ڈر سے اپنا منہ بند رکھے گی مگر اس بار وہ غلط ثابت ہوا۔ اس نے چپ چاپ تصاویر کا انبار اپنے بابا اور مائدہ کے سامنے رکھ دیا تھا۔

قیامت آچکی تھی' ایک اور غلط فیصلہ ہو گیا تھا۔ پہلے انہوں نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں برباد کی اور اب ان کی بیٹی کی زندگی بھی برباد ہو گئی۔ وہ ظالم ہیں انہوں نے ہمیشہ غلط فیصلے کیے۔ یہ سوچ انہیں چین نہ لینے دیتی۔ بریرہ کی خاموشی ان کا دل چیرتی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بولے' روئے' مگر وہ چپ تھی۔ مائدہ خود حیران اور بے تحاشا شرمندہ تھیں۔ زبیر سے انہوں نے قطع تعلق کر لیا اور وہ مصر تھیں کہ زبیر بریرہ کو طلاق دے دے۔ مگر وہ ڈھٹائی پر اتر آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ نہ تو وہ بریرہ کو چھوڑے گا اور نہ ہی ثانیہ کو' جبکہ ارمان صاحب بیمار رہنے لگے۔ ایک ماہ کے اندر ہی وہ ختم ہو گئے اور بریرہ پھر سے تنہا ہو گئی۔

ان کے جانے کے بعد اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل ہی ہو جائے گی۔ انہوں نے ماں بن کر اس کی پرورش کی تھی۔ دوستوں کی طرح ہر مسئلہ سنتے تھے۔ ہر ہر لمحے میں وہ اس کے ساتھ تھے اور اب۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ زبیر آگیا تھا۔ چالیسویں کے بعد اس کی ایک ہی ضد تھی کہ رخصتی کر دی جائے۔ بریرہ کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اسے قتل ہی کر دے۔ اسے اس شخص سے بے تحاشا نفرت تھی۔ بریرہ کا انکار اور اس کی نفرت وہ برداشت کیسے کرتا؟ وہ اسے سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔

آج تک اسے یہی لگا کہ بالکل چپ اور ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی اس بار بھی ڈر کر اس کی بات مان لے گی۔ وہ حقیقتاً "اس کا احسان" سمجھے گی۔ اس کے سامنے کبھی سر نہیں اٹھائے گی۔ زبیر کے ذہن میں یہ سوچ اتنی پختہ تھی کہ اس کی ہٹ دھرمی "اس کا انکار" اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ بھی ضد پر آچکا تھا۔

مائدہ بریرہ کی ڈھال بن گئی تھیں۔ بھائی سے انھیں محبت تھی اور بیٹے کی حرکت کے باعث وہ دنیا سے منہ موڑ گئے تھے۔ زبیر کو وہ کبھی معاف نہیں کریں گی۔ یہ انھوں نے سوچ لیا تھا اور ایک روز بے حد خاموشی سے وہ بریرہ کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آئیں۔ بریرہ کی ہی ضد پر انھوں نے زبیر اور اس کے نکاح کی بات ان سے چھپائی تھی۔ جبکہ زبیر کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ سائدہ نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ خود ہی گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ مگر ثانیہ کی بے شمار فون کالز نے اسے واپس جانے پر مجبور کردیا۔ اگر وہ ثانیہ کے فون پر واپس نہ جاتا تو بریرہ کا پتا اسے چند دن میں ہی مل جاتا۔

☼ ☼ ☼

اس کی مما نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ ارمان کے انتقال کی خبر پر وہ بہت دن گم سم اور روتی رہیں۔ بریرہ نے انھیں سچائی نہیں بتائی تھی۔ اس کے دماغ میں بھی یہی بات آگئی تھی کہ وہ بھی بابا کو ہی قصوروار سمجھیں گی اور اسی سوچ کے باعث وہ اب تک زبیر کے نکاح میں تھی۔ وہ اپنا نام اس کے نام سے الگ کرنا چاہتی تھی مگر یہ اتنا آسان تو نہیں تھا۔ اسے ساری بات اپنی مما کو بتانا پڑتی اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس کے پیارے بابا کو یا ان کے فیصلے کو کوئی غلط کہے۔ البتہ زونیو سے وہ ڈسکس کرچکی تھی۔ زونیو نے جب جاب ساری بات سنی تھی اور اس کی یہ بات بھی مان لی تھی کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ مگر اس نے بھی ایک وعدہ لیا تھا کہ جب کوئی اچھا انسان اس کی زندگی میں شامل ہونے کی خواہش کرے گا تو وہ اسے منع نہیں کرے گی۔ تب تو وہ چاروناچار ہاں بول گئی تھی۔ مگر احتشام کے پرپوزل پر اس نے جان بوجھ کر اپنے نکاح کا بتا دیا تھا۔ وہ اس سے چڑتی تھی۔ پہلی بار اس نے مارکیٹ میں اسے خود کو گھورتے پایا اور وہ اسے پہلی بار میں ہی زہر لگا۔ دوسری مرتبہ زونیو اس کے گلاسز تبدیل کروانے لے گئی تھی۔ وہ اسے اسٹائلش بنانے کے چکر میں تھی مگر اسے ضد تھی کہ وہ اپنا حلیہ تبدیل نہیں کرے گی۔ زونیو کی لاکھ منتوں کے باوجود وہ نہیں مانی تھی اور اس شاپ پر بھی وہ اس پر نگاہیں فوکس کیے رہا تھا اور اسی طرح ہر بار وہ اسے گھورتا ہوا پائی۔

احتشام کے دیکھنے کے انداز سے ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ بھی باقی مردوں کی طرح سوچتا ہے۔ وہ بھی اس کی ظاہری شخصیت کو دیکھ کر برے برے منہ بنانے والوں میں سے تھا اور پھر اس نے احتشام کو زبیر جیسے مردوں کی صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ اب احتشام لاکھ سر پٹختا مگر وہ اس کے بارے میں مثبت نہیں سوچ سکتی تھی اور اس نے غیر ارادی طور پر ہی سہی زبیر کی بے وفائی کا بدلہ اس سے لیا تھا۔ رہی بات زبیر اور اس کے نکاح کی تو چونکہ زونیو خاموش تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ کوئی بھی بہانہ بناکر، کوئی بھی جھوٹی سچی کہانی سناکر وہ اس سے اس طرح خلع لے لے گی کہ مما کو حقیقت کا پتا نہ چلے۔ یہ اس کی بے وقوفی کی انتہا تھی۔ اس نے اس کام کو بہت آسان سمجھ لیا تھا۔ جبکہ زونیو نے بے حد خاموشی سے مما اور احتشام کو اس کی بے وقوفی کی داستان سنا ڈالی۔ وہ دونوں سر پکڑ کر بیٹھے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ ذہن یادوں کی آندھی سے گرد آلود ہو رہا تھا۔ اسے اپنے بابا یاد آرہے تھے۔ آنکھوں کے کنارے گیلے ہونے لگے۔ اس نے بہ مشکل چیخنے سے گریز کیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

"بریرہ۔" نوفی نے اسے نرمی سے پکارا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہورہے تھے۔

"بابا یاد آرہے تھے؟" اس نے نرمی سے اس کے گال چھو کر کہا تو آنسو چہرے پر پھسلنے لگے۔ نوفی نے محبت سے بریرہ کو خود سے لگالیا۔ کچھ دیر وہ سسکتی رہی پھر خود ہی اس سے الگ ہوگئی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

"تم آج میری ایک بات مانوگی؟" وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"دیکھو میں جو کہوں گی اسے غور سے سننا اور سمجھنے کی کوشش کرنا۔ اور میری نیت پہ شک مت کرنا۔" وہ بہت محتاط انداز میں بات کررہی تھی۔ بریرہ حیران سی ہوگئی۔

"تم تو گھر پر ہوتے ہوئے بھی گھر کے معاملات سے دور اور بے خبر رہتی ہو۔ کل دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان آئے تھے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

"کیسے مہمان؟" وہ چونک گئی۔

"میرے رشتے کے لیے مگر مجھے نہیں لگتا کہ میرا رشتہ اس گھر سے جڑے گا لگتا ہے میں تمام عمر سعد کی یادیں لے کر اپنی زندگی گزاروں گی۔" اس کا لہجہ دکھی تھا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو نوفی؟ کون سعد؟ اور تم نے مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں۔" وہ حیران پریشان سی سوال کرنے لگی۔

"اصل میں سعد کی مما بے حد حسن پرست خاتون ہیں اور۔۔۔ اور انھیں سعد کے لیے ایسا خاندان چاہیے جس کا ہر فرد گورا چٹا ہو۔ سعد نے انھیں میری تصویر دکھائی۔ میں تو انھیں پسند آگئی لیکن۔۔۔" وہ آدھی بات کرکے چپ ہوگئی۔ بریرہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"لیکن اگر وہ تمہیں دیکھیں گی تو۔۔۔ تو وہ کہیں انکار نہ کردیں کہ کہیں آنے والی نسل تم پر نہ چلی جائے اور سانولی اولاد پیدا ہو۔" نوفی نے بے حد مشکل سے ہی سہی پر جملہ مکمل کر ہی لیا تھا۔ بریرہ کا رنگ مارے خفت اور شرمندگی کے سرخ ہوگیا۔ اس کے حلق میں آواز پھنس کر رہ گئی۔ نوفی نے بے اختیار بریرہ کے ہاتھ پکڑے۔

"بریرہ پلیز۔۔۔ میرے لیے تم ایک کام کرلو۔" وہ بے حد لجاجت سے بولی تھی۔

"ہاں بولو۔" وہ آنسو ضبط کرتے بمشکل بولی۔

"سعد کی مما اب دس دن بعد ہمارے گھر آئیں گی۔ تم بس ان دس دنوں میں پارلر سے اپائنٹمنٹ لے لو۔ یقین مانو محض ذرا سی توجہ سے تمہارا رنگ کھل اٹھے گا اور اگر کپڑے ذرا ڈھنگ کے پہنوگی تو قابل قبول لگوگی۔ بس میری شادی ہوجانے تک تم اپنے آپ کو تھوڑا تبدیل کرلو تاکہ مجھے مسئلہ نہ ہو۔ میں اور سعد ایک ہوسکیں اس کے بعد تم بھلے ہی پرانے حلیے میں آجانا مگر شادی ہوجانے تک۔۔۔ پلیز بریرہ۔"

"ٹھیک ہے نوفی جیسے تمہاری خوشی۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔ نوفی شکریہ ادا کرکے کمرے سے نکل گئی۔ کمرہ بند کرکے وہ خوب زور و شور سے روئی۔ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔

"سب ایک جیسے ہیں ظاہری حسن کے دلدادہ۔" اس نے نفرت سے سوچا۔

"مگر احتشام تو ایسا نہیں۔" نہ جانے کیوں اس کا دل بولا۔

"احتشام کا یہاں کیا ذکر؟" اس نے بگڑ کر سوچا۔

"تمہارے بابا کے بعد وہی تو واحد فرد ہے جسے تم اسی حلیے اور اسی شکل میں ہی عزیز تھیں۔"

"ایسی باتیں تو زبیر بھی کیا کرتا تھا پھر کیا ہوا؟" اس نے خود کلامی کی۔

"تمہیں زبیر اور احتشام میں فرق نہیں لگتا؟ کیا تم اتنی پاگل ہو؟" دل اسے ڈپٹ کر بولا۔

"کوئی فرق نہیں احتشام کا بھی کوئی مقصد ہوگا۔" وہ اپنے دل کی سننے پر راضی نہ تھی۔

ہاں اس کا ایک ہی مقصد تھا تم سے شادی کرنا اور تمام عمر تمہاری محبت میں مبتلا رہنا۔" دل شرارت سے بولا۔ وہ جھنجلا گئی۔ پہلی بار وہ احتشام کے بارے میں

سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زونیو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ذرا سی گرومنگ سے وہ بالکل ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ بہت دیر تک وہ اپنے آپ کو یوں آئینے میں دیکھتی رہی جیسے وہ کسی اور کو دیکھ رہی ہو۔ چشمے کی جگہ لینس لگائے گئے تھے۔ بالوں کی بے حد خوب صورت کٹنگ جو اس کے چہرے کو مزید پرکشش بنا رہی تھی۔ مگر بالوں کی لمبائی کو زیادہ نہیں چھیڑا گیا۔ خوب صورت اور جدید انداز کے لباس نے اس کی شخصیت کو نیا روپ دے ڈالا تھا۔ اسے خود یہ تبدیلی اچھی لگ رہی تھی۔ مما بھی اس تبدیلی پر حیران مگر خوش تھیں۔ انہوں نے تبدیلی کی وجہ پوچھی تھی مگر وہ ٹال گئی۔ کیا کہتی کہ نولی کی شادی اس کے حلیے کی وجہ سے رکنے والی تھی۔ زونیو نے جب اس کا چہرہ پھیکا پڑتے دیکھا تو فوراً" ہی باہر جانے کا شور مچا دیا۔ اسے گلے میں دوپٹا ڈال کر باہر جانا بے حد عجیب لگا تو اس نے دوپٹے کو اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔

آج نولی اسے لنچ کروانے لے جا رہی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ نا جانے کیوں بریرہ اداس ہو گئی۔ کچھ دن پہلے کہی گئی اس کی باتیں وہ بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی تھی۔ جبکہ سیلف سروس کی وجہ سے زونیو خود ہی کھانے کا آرڈر دینے گئی ہوئی تھی۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ جب کسی کی تحیر سے بھری پکار پر وہ ہڑبڑا گئی اور پھر ساکت رہ گئی۔ اس کے سامنے زبیر کھڑا تھا۔ وہ بے حد حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"بریرہ... یہ... یہ تم ہو؟" اس کی آنکھوں میں بریرہ کے لیے بے حد ستائش تھی پسندیدگی تھی جبکہ وہ یہاں اس جگہ اس طرح کے ٹکراؤ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بات کا جواب دیے بنا وہاں سے جانے لگی مگر زبیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دور کھڑی زونیو بہت اطمینان سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" اس نے خفگی سے کہا۔ وہ بہت بے خوف اور غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کبھی اتنی پراعتماد ہو سکتی ہے' اتنی حسین ہو سکتی ہے زبیر سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ حق جتاتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ اُمڈ آئی۔ وہ بے حد اطمینان سے کھڑا تھا۔ بریرہ کے طیش میں اضافہ ہونے لگا۔ وہ مستقل اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں تھی مگر زبیر کی سخت گرفت۔ اچانک اس کی نگاہ سامنے والی ٹیبل پر پڑی وہ بلاشبہ احتشام تھا۔ بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ فون کان سے لگائے اس کی توجہ ارد گرد بالکل نہیں تھی۔

"احتشام..." وہ اسے دیکھتے ہی چلائی۔ اس کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر مشکل میں گھری بریرہ کو دیکھا۔ اسے محض سیکنڈ لگے اپنی جگہ سے اٹھنے اور اس تک پہنچنے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے دیکھ لیا تھا کہ زبیر نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ وہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"بریرہ کا ہاتھ چھوڑو۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"بریرہ میری بیوی ہے۔ میں اس کا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا اور تم کون ہو جو مجھے یہ آرڈر دے رہے ہو؟" مقابل بھی زبیر تھا۔

"میں تمہاری کچھ نہیں لگتی نفرت ہے مجھے تم سے۔" وہ شدید غصے اور جذبات میں بہہ کر بول گئی اور بس احتشام تو اس کے منہ سے یہی سننے کا خواہشمند تھا۔ ایک زوردار مکا اس نے زبیر کے چہرے پر مارا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا اس نے دو چار لاتیں اور تھپڑ اسے رسید کیے اور لوگوں کے جمع ہونے سے پہلے ہی بریرہ کا ہاتھ پکڑ کر بے حد تیزی سے وہاں سے نکل آیا۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے یہاں وہاں دیکھا ہی نہیں تھا۔ احتشام اسے اپنی گاڑی تک لے آیا تھا اور بریرہ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہا تھا جس دن محض احتشام کے چمکتے چہرے کو بجھتا دیکھنے کی خواہش میں سکون کے

ساتھ اس شخص کا نام لیا تھا۔ جس سے وہ نفرت کرتی تھی اور آج وہ احتشام کے سامنے اپنے منہ سے اس سے نفرت کا اظہار کر چکی تھی۔ احتشام چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بریرہ منتظر بیٹھی تھی کہ وہ کچھ کہے۔ مگر وہ پورے راستے خاموش رہا تھا اور گاڑی اس کے گھر کے دروازے پر لا کر روک دی اور اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اس کے اس نئے روپ کو دیکھنے کے لیے دل مچل رہا تھا مگر اس نے خود پر پہرے بٹھا دیے۔ وہ کچھ بولنے کی خواہش دل میں لیے اتر گئی۔ اس کے جاتے ہی وہ مسکرا اٹھا۔

زونیو نے ہی زبیر کا نمبر ڈھونڈا تھا اور اتفاق سے ہی وہ کراچی آیا ہوا تھا۔ زونیو نے اس سے بریرہ بن کر بات کر کے یہی کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور جب وہ ملنے آئے گا تب ہی وہ اسے وجہ بھی بتائے گی اور وہ وہاں آ گیا تھا۔ احتشام پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ اس سارے ڈرامے کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ زبیر بریرہ کو اس نئے حلیے میں دیکھ کر بے قرار ہو جائے اور دوسری وجہ یہ کہ بریرہ کو اس وقت یقیناً" کسی نہ کسی کی ضرورت پڑتی اور وہ "کسی" احتشام کو ہی ہونا تھا۔ زبیر پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ کسی اور میں انوالو ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی کر لے گا اور سب سے اہم بات احتشام کی اس حرکت کے بعد وہ اس کے لیے یقیناً" اپنے دل میں نرمی محسوس کرے گی۔ جو کچھ اس نے چاہا ویسا ہی ہوتا چلا گیا جیسے قدرت خود اس قصے کا منطقی انجام چاہتی ہے۔ وہ جھوٹے بہانے بنا کر اس کا حلیہ تبدیل کروا چکی تھی۔ اب بس اسے احتشام کے لیے راضی کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

زبیر سے اچانک سامنا اسے مضطرب کر گیا اور پھر احتشام کو دیکھ کر اس کا دل نئی لے میں دھڑکنے لگا۔ دل کی عجیب کیفیت نے اسے الجھا دیا۔ وہ مسلسل اسی کو سوچ رہی تھی۔ کمرے میں اسے سکون نہ ملا تو وہ لاؤنج میں آ گئی۔ دو روز پہلے جو ہوا اسے ہمیشہ کی طرح مما سے چھپایا گیا تھا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے ٹی وی آن کر لیا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ملازمہ کسی کو لیے اندر آئی۔ آنے والا زبیر تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ بریرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"کیسی ہو؟" وہ خود ہی صوفے پر بیٹھ گیا' جبکہ وہ کھڑی رہی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔ زبیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کے قریب آن رکا۔ بریرہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اپنی بیوی سے ملنے' اسے دیکھنے' اس سے باتیں کرنے اور..." اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔

"اسے چھونے۔" اس نے نرمی سے بریرہ کے بال چھو کر کہا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر مزید پیچھے ہو گئی۔

"زبیر چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ..."

"کیا کرو گی تم؟ پھر کسی آشنا سے میری مرمت کرواؤ گی؟" وہ بار بار پیچھے جا رہی تھی اور وہ قدم بہ قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔

"میں نے کہا نا یہاں سے ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ تم۔" وہ چلا کر بولی۔ ملازمہ اپنی مالکن کی حالت دیکھ چکی تھی وہ تیزی سے باہر بھاگی اور گارڈ کو بلا لائی۔

"تمہارے پاس صرف دو دن ہیں بریرہ اچھی طرح سوچ لو۔ میرے ساتھ شرافت کے ساتھ چلنا ہے تو ٹھیک ورنہ مجھے زبردستی کرنا بھی آتی ہے اور تم جانتی ہو کہ میری زبردستی کیسی ہو گی؟" اسے دھمکی دیتا باہر نکل گیا۔

"آئندہ اس شخص کو گھر کے آس پاس دیکھو تو اس کی ٹانگیں توڑ دینا۔" وہ جاتے جاتے سخت لہجے میں کیا گیا آرڈر سن چکا تھا۔ اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تھی۔

☼ ☼ ☼

زبیر کی ہمت پر وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ شام میں جب مما گھر آئیں تو اس نے خود ہی رو رو کر ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ

بتار کے 'بنا جھجکے اس نے ہر بات انہیں بتادی۔ انہوں نے بابا کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ وہ بس اسے دلاسا دیتی رہیں۔

"ہم کل ہی وکیل کو بلا کر ساری بات ڈسکس کرتے ہیں اور خلع کا کیس دائر کرتے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں وہ کیسے تمہیں پریشان کرتا ہے۔ تم رومت نمیں ہوں نا۔" وہ اس کے چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔ وہ عجیب سی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری مما۔ میں نے آپ کو پہلے اس حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" وہ سر جھکا کر بولی تھی۔

"اٹس اوکے۔" انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گزشتہ سال ہی ثانیہ اس سے طلاق لے چکی تھی۔ تب ہی وہ کراچی واپس آگیا تھا اور جب اسے خلع کا نوٹس ملا تو وہ غصے سے پاگل ہی ہو گیا۔ پہلے بھی وہ بریرہ کو چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اس کی خوبیوں اور نیک فطرت سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا اور اب تو وہ اسٹائلش بھی ہو گئی تھی اور بے حد خوب صورت بھی۔ اب تو اس سے دستبردار ہونا ناممکن ہو گیا تھا۔ عدالت کے نوٹس ملنے کے باوجود وہ حاضری کے لیے نہیں گیا۔

بہت سوچ کر اس نے بریرہ کو فون ملایا اور اسے ملنے کے لیے بلایا تھا۔ اس کی توقع کے برخلاف وہ مان گئی اور اسی نے جگہ منتخب کی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو وہاں زونیو موجود تھی۔ اسے آتا دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔

"زبیر بھائی! میں زونیو ہوں۔ بریرہ کچھ دیر میں پہنچے گی۔" وہ جلدی جلدی بولی۔

"تمہاری آواز میں نے پہلے بھی کہیں سن رکھی ہے۔" وہ بہت تیز تھا۔ مگر اس سے زیادہ ہوشیار زونیو تھی۔ فوراً" ہی مسکرائی کیونکہ فون اسی نے اٹھایا تھا اور بریرہ بن کر بات کی تھی۔

"میری اور بریرہ کی آواز میں کافی مشابہت ہے نا" اس لیے آپ کو لگا۔" وہ پرسکون ہو کر بولی۔

"بریرہ اکیلی ملنے نہیں آسکتی تھی۔" وہ لہجہ بگاڑ کر بولا۔ زونی نے اپنا غصہ بمشکل قابو کیا تھا۔

"اسے آپ سے ڈر لگتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ نہ جانے کیوں وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ حیران تو وہ اب بھی تھا کہ بریرہ کیسے اس سے ملنے کے لیے راضی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ آتی دکھائی دی۔ گھبرائی گھبرائی اور پریشان۔

"کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے؟" اس نے بغیر کوئی اخلاقیات نبھائے وجہ دریافت کی۔

"تم بیٹھو تو سہی۔" اس۔ لمحے زبیر کے لہجے میں شیرینی ہی شیرینی تھی۔

"میں بیٹھنے نہیں آئی۔" وہ ڈھیٹ بنی کھڑی رہی۔ زبیر بھی کھڑا ہو گیا۔

"بریرہ پلیز! ہم بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا تو۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ تم میرے بابا کے قاتل ہو۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں تمہیں معاف کرکے تمہیں اپنالوں گی' ہرگز نہیں۔ شدید نفرت کرتی ہوں میں تم سے مجھے طلاق چاہیے۔" وہ بے حد غصے سے بول رہی تھی۔

"میں تم سے اپنے ہر گناہ کی معافی مانگتا ہوں۔ پلیز بریرہ میری بات تو سنو۔" وہ اسے بہت پیار سے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ زونی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بریرہ غصے سے باہر نکلنے لگی۔ زبیر اس کے پیچھے پیچھے کہ اچانک ہی عقبی حصے سے کوئی نکل کر زبیر کے قریب آیا۔

"یہیں رک جاؤ اور میرے اشارے کے منتظر رہو۔" زبیر کو اپنی پشت پر کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ بریرہ پیچھے مڑے بغیر آگے بڑھتی جارہی تھی۔ زبیر کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔

"آگے بڑھو' اس طرف۔" وہ اسے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ دس قدم کی دوری پر ایک

گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے زبیر کو اس گاڑی میں دھکیل کر دروازہ بند کردیا اور فون ملایا۔

"مبارک ہو' کام ہو گیا۔" اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آکر نیند کی گولی کھا کر سو گئی تھی۔ زونیو کے بے حد اصرار کے بعد وہ زبیر سے ملنے کے لیے راضی ہوئی تھی اور زونیو کے ہی کہے گئے الفاظ اس نے وہاں دہرائے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ زونیو نے اسے وہاں کیوں بھیجا اور پھر وہ الفاظ ادا کرنے کے بعد واپس جانے کی ہدایات کیوں جاری کیں۔ بس اس نے جو کہا اس نے کیا۔ شام کو جب وہ جاگی تو سائیڈ ٹیبل پر رکھی رجسٹری دیکھ کر وہ حیران سی ہوئی۔ کھولنے پر جب سامنے طلاق کے کاغذات آئے تو اس پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ زبیر نے اسے اتنی آسانی سے کیسے طلاق دے دی؟ سمجھ سے بالاتر تھا۔ کہاں وہ کورٹ کے نوٹس بھیجنے کے باعث اپنے گھر تک سے غائب ہو گیا تھا اور کہاں اچانک ہی اس نے طلاق نامے پر دستخط کردیے۔

وہ یہ خوش خبری سب سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے بھاگتے ہوئے نیچے آئی مگر لاؤنج میں مہمانوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ احتشام اپنے والدین کے ہمراہ وہاں موجود تھا اور ماحول بے حد خوشگوار۔ سب کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ وہ واپس تو جا نہیں سکتی تھی اس لیے آگے بڑھ آئی۔ سلام اور خیر خیریت کے بعد وہ محض پانچ منٹ ہی بیٹھ پائی۔ احتشام کی بولتی نگاہیں' وہ پہلی بار بری طرح کنفیوژ ہوئی۔ وہ اٹھنے کے لیے پر تولنے لگی کہ زونیو کی آواز پر وہ رک گئی۔

"بریرہ۔ ذرا احتشام بھائی کو ہمارا گھر تو دکھاؤ۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ زونیو کا یہ کہنا تھا احتشام فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔ بریرہ چپ چاپ اسے لیے لان میں آگئی۔

"بہت تبدیلی آگئی ہے تم میں۔" وہ چلتے چلتے اچانک رک کر بولا۔ وہ کیا کہتی۔

"آج پہلی بار میں اور تم یوں اس طرح سے آمنے سامنے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں بریرہ۔" وہ واقعی خوش لگ رہا تھا۔ بریرہ مسکرادی۔

"مگر مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ زبیر نے اتنی آسانی سے مجھے طلاق کیسے دی؟" وہ حیران تھی۔

"یہ سب زونیو کا کمال ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ"' وہ پھر اسے بتاتا چلا گیا۔" اور جب تم ہوٹل سے نکل کر آگے بڑھ رہی تھیں تب میرے دوست نے اسے نقلی پستول سے روک لیا اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ میں اس پرانی اور اجاڑ جگہ پر پہلے ہی موجود تھا۔ بس ذرا سی دھلائی اور مرمت اور گولی کے خوف نے اسے طلاق نامے پر دستخط کرنے پر مجبور کردیا۔ ایسا کرنا بے حد ضروری تھا کیونکہ وہ تمہیں کسی صورت طلاق نہ دیتا اور اگر وہ تمہیں منانے میں کامیاب نہ ہوپاتا تو یقیناً" روپوش ہو جاتا تاکہ تم اس کے نام سے ہی منسلک رہو اور اپنی زندگی پرسکون طریقے سے نہ گزار سکو۔" وہ تفصیل سے بولا۔ وہ منہ کھولے اسے سن رہی تھی۔

"جنگ اور محبت میں سب جائز ہے خاتون۔" وہ سر جھکا کر بولا تو وہ ہنس پڑی پھر کچھ دیر مزید خاموشی چھائی رہی۔

"بریرہ۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں اسے پکارا۔ وہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ تمہیں اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں میرا ساتھ قبول ہے۔" احتشام نے محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا' جسے بریرہ نے تاخیر کیے بنا تھام لیا۔ اسے پہلی بار اپنا آپ مکمل لگا تھا۔ احتشام کی نگاہوں میں بریرہ کے لیے بے تحاشا محبت اور عزت تھی اور یہی تو اسے چاہیے تھا۔ دنیا میں تمام مرد زبیر جیسے نہیں ہوتے۔ اس بات پر اسے یقین آگیا تھا۔ اس کے دل کے آسمان پر محبت کا چاند مسکرانے لگا۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی۔ مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے۔ رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔ اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو ہوٹل میں لنچ کی دعوت دیتی ہے۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں ہوٹل میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے۔ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے۔ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے۔ اب آگے پڑھیں۔

سینتالیسویں اور آخری قسط

آج کل جس قسم کے حالات سے ان کا گھرانہ گزر رہا تھا اس کے باعث وہ یہی سمجھیں کہ الیان پھر کوئی بری خبر سنانے جا رہا ہے انہوں نے فوراً" میگزین ایک طرف رکھ دیا تب الیان کہنے لگا۔

"رومیلہ کو اس گھر سے گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے ہیں آج تک ابرار نے ہم سب سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بریرہ کے گھر جانا یا حامد سے فون پر بات وغیرہ کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس نے تو کبھی پلٹ کر یہ تک نہیں پوچھا کہ ہم نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھالیا۔

وہ عملی طور پر کچھ نہ بھی کرتا تب بھی ایک فون کر کے ہمیں صلواتیں تو سنا سکتا تھا مگر اس کے پاس شاید اتنا بھی ٹائم نہیں تھا یا پھر وہ خود بھی ذہنی طور پر تیار تھا کہ آج نہیں تو کل ہم رومیلہ کو واپس اس کے گھر بھیج دیں گے تبھی اس نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔"

الیان رک کر ان کی شکل دیکھنے لگا تو وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے پر سوچ انداز میں کہنے لگیں۔

"ہاں اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رومیلہ نے سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ اس نے اپنے گھر والوں پر یہی ظاہر کیا کہ طلاق اس نے خود لی ہے وہ بھی اس لیے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

"کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" الیان نے برجستہ پوچھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو' سارے حالات میرے سامنے ہیں یہ سب اس نے بریرہ کو بچانے کے لیے کیا ہے' اس نے خود بریرہ سے کہا تھا چاہے کچھ بھی ہو جائے میں تمہارا گھر برباد نہیں ہونے دوں گی۔" شگفتہ غفار صاف گوئی سے بولیں۔

الیان کچھ دیر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا۔

"کیا یہ سب آپ اس لیے مان رہی ہیں کہ وہ میری زندگی سے نکل چکی ہے' اگر وہ آج اس گھر میں بہو کی حیثیت سے موجود ہوتی تو آپ کے احساسات اس کے لیے پہلے جیسے ہی ہوتے' مطلب وہی نفرت' وہی بے زاری۔"

"الیان مجھے اس سے کوئی خدا واسطے کا بیر نہیں تھا انہوں نے جو بریرہ اور ہمارے گھر کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد بھی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے سر آنکھوں پہ بٹھاتی تو یہ تو ممکن نہیں تھا۔

لیکن بعد کے حالات سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔

اول تو یہ سب صرف اور صرف ابرار کا کیا دھرا ہے رومیلہ کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

دوسرے یہ کہ ابرار نے بھی یہ سب ہمارے خاندان کو ٹارگٹ بنا کر نہیں کیا اسے تو بس ایک چیلنج جیتنا تھا اب اس کے نتیجے میں چاہے کسی کی عزت داؤ پر لگے' چاہے اس کی خود کی بہن کی زندگی برباد ہو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"تب ہی تو رومیلہ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ سکون سے بیٹھا ہے۔ ایک یہ ابرار اور ایک بلال اختر' ان دونوں جیسے ڈھیٹ لوگ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔" شگفتہ غفار دانت پیس کر بولیں۔

"اس کا مطلب ہے آپ کے دل میں رومیلہ کے لیے موجود نفرت ختم ہو گئی ہے۔"

"تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟"

"آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں پھر میں آپ کے سارے سوالوں کے جواب دوں گا۔" الیان ضدی سے لہجے میں بولا۔

"مجھے اس سے نفرت ایک جذباتی دھچکے اور نظریاتی اختلاف کے باعث تھی وہ دھچکا تو آج بھی اپنی جگہ ہے

الیان کچھ جھینپ کر مسکرا دیا اور اسے ٹالتے ہوئے بولا۔

"ہاں خود تو اس مرحلے سے گزر چکے ہو نا اسی لیے بڑے مزے سے بات کر رہے ہو میں تو جب تک اس سے بات نہیں کر لیتا سوچ کی اس سولی پر لٹکا رہوں گا کہ جانے اس کا کیا رد عمل ہو گا۔" الیان نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

عمل اسپتال سے گھر آئی تو خاصی بجھی ہوئی تھی وہ رات کو عظمت خلیل کے پاس ہی رکنا چاہ رہی تھی مگر ان کے ٹرسٹ کے لوگوں نے اسے زبردستی گھر بھیج دیا۔

وہ بھی یہ سوچ کر آ گئی کہ رشیدہ اس کے رات میں تنہا وہاں رکنے پر پریشان ہوں گی۔ ویسے تو خرم بھی تیار تھا ان کے پاس ٹھہرنے کو مگر ٹرسٹ کے لوگ جو عظمت خلیل کے لیے شدید عقیدت رکھتے تھے وہ خود ان کی خدمت کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے خرم کو بھی بھیج دیا ویسے بھی اب تک وہ آئی سی یو میں تھے تو کسی کو بھی رکنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی ضرورت تھی اب جبکہ وہ پرائیوٹ وارڈ میں شفٹ ہو گئے تھے تو اب لوگ ان کی خدمت کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

رشیدہ کی طبیعت کافی گری ہوئی تھی پھر بھی جب انہیں پتا چلا کہ عظمت خلیل سے ملنے کی اجازت مل گئی ہے تو وہ بضد ہو گئیں کہ عمل کل ہی انہیں ملنے چلے۔

عمل کو یقین تھا عظمت خلیل کو دیکھ کر رشیدہ کی کچھ بہتر ہوتی حالت پھر بگڑ جائے گی مگر وہ انہیں ٹال بھی نہیں سکتی تھی اس نے تھکے تھکے اور بوجھل دل سے ہامی بھر لی۔

مگر اس وقت وہ واقعی چونک اٹھی جب اس نے رشیدہ کو بتایا کہ عظمت خلیل کچھ پوچھ رہے تھے مگر وہ سمجھی ہی نہیں تب رشیدہ بڑے یقین کے ساتھ فوراً" بولیں۔

"وہ میرا پوچھنا چاہ رہے ہوں گے کہ میں کہاں ہوں' بس تم مجھے کل صبح ہی لے چلنا۔" رشیدہ کو کسی پل قرار نہیں تھا عمل صرف انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

پتا نہیں رشیدہ کا اندازہ صحیح تھا یا یہ محض خوش فہمی تھی وہ فیصلہ نہیں کر سکی حادثے بعض اوقات انسان کو مکمل طور پر بدل دیتے ہیں اور اتنے بڑے نقصان کے بعد عین ممکن تھا کہ مستقل طور پر نہ سہی' وقتی طور پر عظمت خلیل کو بیوی کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہو یا رشیدہ کی کمی محسوس ہو رہی ہو۔

رومیلہ نے اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس تو کی تھی مگر اس نے کوئی تبصرہ یا سوال نہیں کیا وہ اس کی وجہ عظمت خلیل کے ناقابل تلافی نقصان کو ہی گردان رہی تھی جو کہ کسی حد تک صحیح بھی تھا لیکن صرف عمل جانتی تھی کہ الیان کی آمد نے بھی اس کے ذہن کو منتشر کر دیا تھا۔

وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے رومیلہ کو الیان کے آنے کے متعلق بتانا چاہیے یا نہیں' اب جبکہ کوئی تعلق کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی اس کے سامنے الیان کا ذکر کرنے کی۔

رومیلہ تو ابھی اس صدمے سے پوری طرح سے باہر نہیں آئی تھی سب کام وہ روز کے معمولات کے مطابق کر رہی تھی مگر اس کی ذات میں رچی بسی اداسی عمل کی آنکھوں سے ڈھکی چھپی نہیں تھی تبھی وہ خود بھی رومیلہ سے اس موضوع پر بات کرنے سے گریزاں تھی۔

شام تک وہ اسی ادھیڑ بن میں لگی رہی کہ اس کے موبائل پر خرم کی کال نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا اسے یقین تھا خرم اسے الیان کے ساتھ روا رکھے رویے پر ضرور ٹوکے گا تبھی اس نے بڑے برے

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ممی' بلکہ سب سے مشکل اسے ہی بتانا ہے۔" الیان نے آخری جملہ بڑبڑانے والے انداز میں کہا جو وہ سن نہ سکیں۔

"کیا کہا تم نے۔"

"کچھ نہیں میں اس سے بات کرکے آپ کو بتاتا ہوں۔" الیان کہتا تیزی سے وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ اسے فون نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ ابرار کے گھر جاکر اس سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا تب اسے تمل کا ہی خیال آیا کہ پہلے تمل سے بات کی جائے کہ وہ ان دونوں کی ملاقات کا کوئی انتظام کرادے' اس کے لیے اس نے اسی وقت خرم کو فون کر ڈالا۔

خرم اس کی آواز سنتے ہی تمل کے رویے کی صفائی دینے لگا تو الیان نے مختصر الفاظ سے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے اپنا مدعا بھی بیان کردیا۔

"ارے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ رومیلہ تو تمل کے ہی گھر پر ٹھہری ہوئی ہے' تم کہو تو میں ابھی تمہیں تمل کے گھر لے چلتا ہوں۔" خرم کو خاصی خوشی ہوئی تھی الیان کی بات سن کر وہ بھی اک دم مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔

دوسری طرف الیان بھی ایک دم جوش میں آگیا وہ تو چاہتا ہی تھا کہ رومیلہ کے روبرو کھڑے ہوکر بات کرے کیونکہ اسے یقین تھا سچ جاننے کے بعد وقتی طور پر رومیلہ کو اس بات پر بہت غصہ آئے گا اس طرح اپنے بے وقوف بننے اور اپنے بھائی کے آزمائے جانے پر وہ یقیناً "اس سے خفا ہوگی مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ رومیلہ کسی بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنائے گی اور نہ ہی وہ فضول باتوں کو طول دینا پسند کرتی ہے اس لیے وہ اسے بہت جلد منا لے گا۔

مگر اسے اپنا نکتہ نظر سمجھانے اور قائل کرنے کے لیے کسی سازگار ماحول کی ضرورت تھی جو کہ ابرار کے گھر پر تو ممکن نہیں تھا چنانچہ یہ جانتے ہی کہ وہ تمل کے گھر پر ہے' الیان رومیلہ سے اسی وقت ملنے کے لیے بے چین ہو گیا' پھر بھی اس نے اپنی بے قراری چھپاتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا۔

"تمل کے گھر والے میرے اس طرح منہ اٹھا کر آنے پر برا نہیں مانیں گے نا۔"

"ارے اس کے گھر میں ہے ہی کون۔ عظمت انکل ہاسٹل میں ہیں صرف اس کی والدہ ہوتی ہیں تو وہ آج کل صدمے کی وجہ سے کافی بیمار ہیں اور امید ہے کہ اس وقت سو رہی ہوں گی لیکن اگر وہ جاگ بھی رہی ہوئیں تو وہ بہت نائس ہیں' تمہاری آمد کی وجہ جان کر تو وہ الٹا ہی پوچھیں گی کہ تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں کردی۔" خرم بڑے اعتماد سے بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں ابھی اور اسی وقت تمہاری طرف آرہا ہوں۔" الیان خاصے جوش کے ساتھ بولا جسے محسوس کرتے ہوئے خرم ہنس کر کہنے لگا۔

"ابھی اور اسی وقت آنے کی ضرورت نہیں ہے صبح سے جس حلیے میں پھر رہے ہو اسی میں اٹھ کر جاؤ گے تو کیا امپریشن پڑے گا رومیلہ پر۔

ذرا نہا دھو کر تیار ہو کر ہیرو بن کر آؤ یوں سمجھ لو تم لڑکی پرپوز کرنے جارہے ہو بلکہ راستے سے کوئی پھولوں کا بکے بھی خرید لینا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے وہ پہلے ہی مجھ پر بگڑی ہوئی ہوگی مجھے اتنا خوش دیکھ کر تو اسے یہی لگے گا کہ میں اتنے دنوں تک اسے بے وقوف بنا کر انجوائے کرتا رہا۔" الیان برجستہ بولا۔

"اگر تم سچے دل سے اعتراف کرو گے تو وہ ضرور یقین کرے گی میں نے اتنی بار تمل کو بے وقوف بنانا چاہا مگر اس نے کبھی اعتبار نہ کیا اس نے یقین تب کیا جب میں نے واقعی سچے دل سے اپنی چاہت کا قرار کیا۔" خرم کی بات پر

دے رہا تھا کہ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹ دی اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہنے لگیں۔

"تمہیں نہیں پتا تم نے میرا کتنا بڑا بوجھ کم کردیا ہے سچ تو یہ ہے الیان کہ اگر رومیلہ ابرار کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی تب بھی میں اسے قبول کرلیتی۔

تمہاری نانی اماں اور بریرہ مجھ سے اس قدر ناراض ہیں کہ میں صبح شام ان دونوں کو فون کرتی رہتی ہوں مگر دونوں میری کال تک اٹینڈ نہیں کررہیں۔

میں نے تمہیں اور ریاض کو بتایا نہیں' بریرہ کو جب زویہ کے بارے میں علم ہوا تو وہ حامد کے ساتھ عائشہ اختر کے گھر گئی تھی پڑھنے کے لیے' یہاں شہر تک آکر وہ گھر آنے کی بجائے صرف عائشہ اختر سے مل کر واپس لوٹ گئی میرے دل پر کیسی چھریاں چل گئیں میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔

میری تو جنت اور آنکھوں کی ٹھنڈک دونوں مجھ سے روٹھ گئی ہیں۔ اب جب میں انہیں بتاؤں گی کہ یہ سب جھوٹ تھا اور رومیلہ ابھی بھی اس گھر کا حصہ ہے بلکہ میں خود تمہارے ساتھ اسے لینے جاؤں گی تب انہیں یقین آئے گا کہ میں کوئی بے حس پتھر نہیں ہوں بلکہ جو کچھ میں رومیلہ کے ساتھ کرتی تھی وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی کرتی تھی۔

اکلوتی بیٹی عین شادی کے وقت اغوا ہوگئی خوشی کا سارا ماحول آہ و بکا میں بدل گیا' عزت نیلام ہونے کا خوف ہر وقت تلوار کی طرح سر پر مسلط ہوگیا ایسے میں میں رومیلہ کی آؤ بھگت تو نہیں کرسکتی تھی۔

"تم نے ابرار کو آزما کر رومیلہ کو نہیں بلکہ مجھے سرخ رو کیا ہے تمہاری نانی اور بہن کے سامنے میں بھی سر اٹھا کر کھڑی ہوسکتی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنے بچوں کا گھر نہیں اجاڑا' میں کیا کوئی ماں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔" شگفتہ غفار ایک دم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور پہلی بار انہیں روتا دیکھ کر بھی الیان غم زدہ ہونے کی بجائے مسکرا تا رہا کیونکہ شگفتہ غفار کے آنسوؤں کے پیچھے ایک خوشی تھی ایک سکون تھا۔

انہوں نے ابھی تک اپنے سرکل میں الیان کی طلاق کا ذکر تک نہیں کیا تھا کہ کہیں کسی کے ذریعے یہ خبر گاؤں نہ پہنچ جائے اور ان کی بھابیاں اس بارے میں کوئی بات کریں یا ان سے ملنے آئیں تو بریرہ یا نانی اماں غم و غصے کے عالم میں کچھ کہہ نہ دیں۔ خاص طور پر بریرہ کی جذباتیت سے تو انہیں بہت ہی ڈر لگ رہا تھا وہ تو بری طرح پریشان تھی کہ کہیں ابرار اب بدلہ لینے اس کے گھر تک نہ آجائے

حالانکہ انہوں نے اسے اطمینان دلانا چاہا تھا مگر اول تو وہ ان کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھی' دوسرے یہ کہ جب ڈر انسان کے اندر چھپا ہو تو اسے باتوں سے کوئی تسلی نہیں ہوتی۔

لہٰذا الیان نے ان کی ساری فکریں دور کردی تھیں اور وہ اس وقت ایکدم پرسکون ہو کر رو رہی تھیں' الیان بھی انہیں چپ کرانے کی بجائے محض ان کی ہتھیلی کی پشت تھپکے جارہا تھا' جب انہوں نے ایکدم اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے چہرہ صاف کیا اور بڑے جوش سے کہنے لگیں۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت رومیلہ کے پاس لے چلو' اسے گھر لا کر میں اس کے موبائل سے تمہاری نانی اماں کو فون کروں گی پھر دیکھنا کیسے جھٹ کر فون اٹھائیں گی وہ۔" الیان ان کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"میں آپ کو اس کے گھر ضرور لے کر جاؤں گا بلکہ آپ کو خود ہی اسے لانا ہوگا لیکن اس سے پہلے مجھے ایک بار خود رومیلہ سے مل کر اسے ساری بات سمجھانی ہوگی۔" الیان نے رسانیت سے کہا۔

"ہاں تو ابھی فون کرکے اسے بتا دو پھر ہم رات کو چلیں گے۔" شگفتہ غفار ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے بولیں۔

لیکن جب اس کا قصور ہی نہیں تو میں اس سے اختلاف کس بات پر کروں۔

جہاں تک اس کا اختیار تھا وہاں تک اس نے وہی کیا جو صحیح تھا اب جہاں وہ بے بس تھی وہاں اسے غلط کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے۔" شگفتہ غفار کچھ زچ ہو کر بولیں۔

"اگر میں یہ کہوں کہ میں اسے اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتا ہوں تو کیا تب بھی آپ اپنی اس بات پر قائم رہیں گی۔" الیان نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا بات کر رہے ہو الیان یہ بھلا کیسے ممکن ہے 'تمہیں کیا حلالہ کرانے کی شرائط چاہئیں اور اس طرح ارادتاً حلالہ کرنے سے وہ تم پر حلال نہیں ہو جائے گی اس سے دوبارہ شادی کرنا گناہ ہی ہوگا۔" شگفتہ غفار جیسے بپھر گئیں۔

"وہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ ابھی بھی میرے لیے حلال ہے میں نے اسے تین نہیں 'صرف ایک طلاق دی تھی ہمارے بیچ مصالحت کی گنجائش ابھی باقی ہے۔" شگفتہ غفار آنکھیں پھاڑے الیان کو دیکھے گئیں۔

انہیں شاک میں گھرا دیکھ کر الیان سر جھکاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"آپ میں سے کسی نے طلاق نامے پر غور نہیں کیا تھا کہ رومیلہ اور اس کے گھر والوں تک نے نہیں 'اور مجھے یقین تھا کہ کوئی غور کرے گا بھی نہیں۔

ممی بخدا میرا مقصد آپ سب کو بے وقوف بنانا نہیں تھا میں صرف سب لوگوں اور چیزوں کو پرکھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلی اور اہم آزمائش ابرار کی تھی اس نے مجھے دھمکایا تھا اس نے میری بہن کو اٹھوایا تھا میں اتنی آسانی سے تو اس کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیک سکتا تھا' مجھے اسے بتانا تھا کہ اس طرح اس کی دھونس میں آکر میں اگر کوئی فیصلہ کر بھی لوں تو اس پر ساری زندگی کاربند نہیں رہوں گا۔

پھر مجھے رومیلہ کو بھی دیکھنا تھا اس گھر میں رہنے اور یہاں ایڈجسٹ ہونے کے لیے تو وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی لیکن اگر اس سے یہ چھت چھین لی جائے تو کیا تب بھی وہ اس گھر کے مکینوں کے لیے مخلص رہے گی یا پھر دنیا کے نوے فیصد لوگوں کی طرح وہ بھی اس فلسفے پر یقین رکھتی ہے کہ جب مجھے کچھ نہیں مل رہا تو میں دوسروں کو کچھ کیوں دوں۔

اور ان سب کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ کسی ایک کے کیے کی سزا ہم کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے۔

"اگر ابرار نے کچھ برا کیا ہے تو اس کا بدلہ رومیلہ سے لینا کسی طور جائز نہیں۔" الیان نے بات ختم کرنے کے بعد کچھ جھجکتے ہوئے سر اٹھا کر شگفتہ غفار کی جانب دیکھا 'اسے یقین تھا وہ شدید غصے کے عالم میں اسے دیکھ رہی ہوں گی اور الیان کے چپ ہوتے ہی ان کی زبان زہر اگلنا شروع کر دے گی کہ۔

"تو یہ سب ایک ڈراما تھا تم نے رومیلہ کو پہلے ہی سب بتا دیا تھا بلکہ یہ سب رومیلہ کی ہی سوچی سمجھی سازش تھی جو تم نے اس کے کہنے پر یہ سب کیا تھا تاکہ اسے میری نظروں میں عظیم بنا سکو لیکن میں اس ایکٹنگ سے ہرگز متاثر نہیں ہو سکتی مجھے اس سے کل بھی نفرت تھی آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔"

مگر جب الیان نے ان کی جانب دیکھا تو بری طرح چونک اٹھا وہ یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے بے آواز رو رہی تھیں۔

"ممی۔۔۔ ممی 'میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا' آئی سوئیر میں صرف یہ چاہتا تھا کہ گھر کے ماحول میں ہر وقت جو تناؤ رہنے لگا ہے وہ ختم ہو جائے کسی کو بھی کوئی فیصلہ زبردستی قبول نہ کرنا پڑے بلکہ۔۔۔"

"میں ہرٹ نہیں ہوئی ہوں۔" الیان اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گیا تھا اور ان کا ہاتھ تھامے صفائیاں

ہوئے انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

"رشیدہ آنٹی کیسی ہیں؟" خرم نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں امی۔ ابو سے ملنا چاہ رہی ہیں 'سمجھ میں نہیں آ رہا کل انہیں ہسپتال لے کر جاؤں یا نہیں۔" حمل نے انگلیوں سے پیشانی سہلاتے ہوئے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"لے چلو۔ عظمت انکل کو بھی آنٹی کا انتظار ہوگا۔" خرم نے سنتے ہی کہا تو حمل کچھ چڑ کر بولی۔

"ابو نے کبھی امی کا انتظار نہیں کیا۔ بس امی کو ہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ ابو کو میری ضرورت ہے۔"

"ان کی فکر بالکل جائز ہے پہلے انہوں نے بھلے ہی کبھی آنٹی کو عزت نہ دی ہو لیکن اب حالات بدل گئے ہیں مجھے یقین ہے آنٹی کو دیکھ کر انہیں ذہنی طور پر کافی سکون ملے گا۔

میرے ممی ڈیڈی بھی ان سے ملنے آنا چاہ رہے تھے مگر میں نے فی الحال انہیں منع کر دیا ہے اس وقت وہ انجان لوگوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کریں گے انہیں ہر طرح کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے صرف تم اور آنٹی ہی بچا سکتے ہو۔" خرم بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

حمل خاموشی سے اسے سنتی رہی یہاں تک کہ اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی کچھ نہیں بولی تب خرم خود ہی کہنے لگا۔

"اچھا ان سب باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ رومیلہ کیسی ہے۔"

"ٹھیک ہے ایک بار اس کی عدت ختم ہو جائے تو وہ یونیورسٹی آنا شروع کر دے گی جب تک اس کی روٹین سیٹ نہیں ہوگی تب تک اس کا ڈپریشن بھی کم نہیں ہوگا۔"

"اس کا ڈپریشن آج ابھی اور اسی وقت کم 'بلکہ ختم ہو سکتا ہے۔" خرم کی آواز سے صاف لگ رہا تھا جیسے وہ مسکرا رہا ہو حمل کچھ ٹھٹک گئی۔

"کیا مطلب۔" دوسری طرف خرم نے جو کہا وہ سن کر حمل کتنی ہی دیر منہ اور آنکھیں پھاڑے سکتے کی کیفیت میں موبائل پکڑے کھڑی رہی اور جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو پہلے تو وہ خرم پر برس پڑی۔

لیکن جب خرم نے اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے یہ احساس دلایا کہ اس دوہرے صدمے کے باعث وہ کتنی مشکلات اور آزمائشوں سے آزاد ہو گئی ہے تو حمل نہ صرف پرسکون ہو گئی بلکہ خاصی پرجوش بھی ہو گئی۔

"میں ابھی جا کر رومیلہ کو سب بتاتی ہوں۔"

"یہ غضب مت کرنا یار میں الیان کو لے کر تمہارے گھر آ رہا ہوں الیان خود اس سے مل کر بات کرنا چاہتا ہے تم صرف اتنا کرو کہ رشیدہ آنٹی کو کہیں ادھر ادھر کر دو۔

"الیان جب تک رومیلہ سے نہ مل لے وہ آنٹی کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا ہے 'پہلے ہی تم نے اسے بے بھاؤ کی سنا دی ہے اب وہ مزید کسی کے طعنے سننا نہیں چاہتا خاص طور پر جب تک یہ پتا نہ چل جائے کہ رومیلہ اسے معاف کرنے میں کتنا ٹائم لگاتی ہے۔" خرم نے بے چارگی سے کہا تو حمل کتنے دنوں بعد بے ساختہ ہنس دی۔

"رومیلہ اتنی بے ضرر لڑکی ہے اسے معاف کرنے میں کون سا ٹائم لگانا ہے 'جب تم نے مجھ سے یہ کہا کہ رومیلہ کو اس کے صحیح مقام کے ساتھ الیان کو اسے اس کے گھر میں جگہ دلانے کے لیے یہ سب کرنا پڑا تو میرا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

پھر رومیلہ تو ویسے ہی ٹھنڈے مزاج کی ہے اس کا تو یہ سب سنتے ہی دل پگھل جائے گا اور اچھا ہی ہے یہ سب الیان ہی اسے بتائے۔

تم گیٹ پر پہنچنے کے بعد مجھے بیل مار دینا میں الیان کو سیدھا رومیلہ کے کمرے میں لے جاؤں گی امی کو اس کی

آمد کا پتا بھی نہیں چلنے گا۔" حمل نے شان بے نیازی سے کہا۔

"کیا بات ہے بھئی' تمہارا دماغ ان کاموں میں کتنا چلتا ہے مجھے تو علم ہی نہیں تھا" خرم کے شوخی سے کہنے پر حمل کچھ جھینپ گئی۔

☼ ☼ ☼

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جب وہ الیان کے گھر سے نکلی تھی تب اسے لگتا تھا کہ زندگی جیسے ختم ہو گئی ہو' اپنے بابا جانی کے گھر آکر جب نماز کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اسے لگا جیسے مانگنے کے لیے اب کچھ بچا ہی نہیں۔

جیسے اب اسے زندگی سے کچھ چاہیے ہی نہیں۔

لیکن یہ احساس اسے اب جا کر ہوا تھا کہ زندگی کسی ایک شخص کے چلے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی اسے اپنے لیے بھلے ہی کچھ نہیں چاہیے تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس مانگنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ بندہ ہر پل اللہ کا محتاج ہے عظمت خلیل کی تکلیف اور رشیدہ اور حمل کی حالت دیکھ کر وہ مسلسل اللہ تعالیٰ سے اپنی اس سوچ پر معافی مانگتے ہوئے ان کے لیے صبر اور بہتری مانگتی آرہی تھی۔

گو کہ عظمت خلیل کے کردار سے واقف ہونے کے باعث وہ ان کے لیے بہت حساس اور جذباتی تو نہیں ہوئی تھی البتہ رشیدہ اور حمل کو اذیت میں دیکھ کر وہ سکون سے بھی نہیں رہ پا رہی تھی چنانچہ وہ مسلسل عظمت خلیل کی صحت یابی کے ساتھ ساتھ ان کے راہ راست پر آنے کی بھی دعائیں مانگ رہی تھی۔

اس وقت بھی اس کی زبان پر یہی التجائیں مچل رہی تھیں اپنے لیے کچھ مانگتے وقت انسان کی دعاؤں میں شدت کا تناسب بھلے ہی زیادہ ہوتا ہو لیکن دوسروں کے لیے مانگتے وقت اس کی شدت کے درجات بہت بلند ہو جاتے ہیں جس سے انسان کی تسکین ہوتی ہے کچھ ایسے ہی احساسات لیے جب وہ جائے نماز تہہ کر کے کھڑی ہونے لگی تو اس کے کمرے میں تیزی سے حمل داخل ہو گئی۔

"کیا کر رہی ہو؟" اس کے سر پر نماز کا دوپٹا بندھا دیکھنے کے باوجود حمل نے بڑی عجلت میں پوچھا تو رومیلہ کچھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں بالکل خیریت ہے۔ میں بس دیکھنے آئی تھی تم کچھ زیادہ بزی تو نہیں ہو۔" حمل نے سر سے پیر تک اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا۔" رومیلہ اس کے اس طرح غور سے دیکھنے پر مزید حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"ہاں آں۔۔۔ کچھ نہیں کچھ نہیں۔۔۔ تم نے صبح سے بال نہیں بنائے کیا۔" حمل نے اسے دوپٹا کھولتا دیکھ کر بے اختیار پوچھا۔

نماز کا دوپٹا کھولنے کی وجہ سے اس کے آگے کے بال کچھ بکھر گئے تھے جنہیں اب وہ انگلیوں سے ٹھیک کر کے دوپٹا تہہ کرنے لگی تھی کہ حمل کے سوال پر خشمگیں نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بات کیا ہے۔"

"بات۔۔۔ کیا بات۔" حمل نے چونکنے کی اداکاری کی۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں بات کیا ہے" رومیلہ نے لفظ بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو حمل خوامخواہ ہی ہنس دی۔

"نہیں نہیں بات کچھ بھی نہیں ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں گڈ نائٹ۔" حمل یہ کہتی پلٹ گئی مگر دروازے کے پاس جا کر ایک بار پھر رک گئی۔

رومیلہ ایک بار پھر اسے حیرانی سے دیکھنے لگی جو پلٹ کر ایسے رومیلہ کو دیکھ رہی تھی جیسے شش و پنج میں ہو کہ کہے یا نہ کہے۔

"حمل تم ٹھیک تو ہو نا۔"

"پتا نہیں۔" حمل کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد بے چارگی سے کہتی باہر نکل گئی۔

رومیلہ حیرانی سے دروازے کو دیکھتی رہی پھر خود بھی کندھے اچکاتے ہوئے جائے نماز جگہ پر رکھنے کے لیے پلٹ گئی کہ تبھی اسے دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔

"تمہیں ناک کرنے کی ضرورت کب سے پیش آگئی۔" رومیلہ نے کچھ چڑتے ہوئے کہا اور بستر کا تکیہ سیدھا کر کے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھ گئی مگر دروازہ ہنوز بند رہا تو وہ کچھ غصے سے بولی۔

"حمل ڈرامے بند کرو اور سیدھا طرح سے اندر آکر بتاؤ بات کیا ہے۔" وہ دروازے کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی جب اس کا جملہ ختم ہونے پر دروازے کے ہینڈل کو بڑی آہستگی سے گھما کر دروازہ کھولا گیا اور نووارد اندر داخل ہو گیا۔

رومیلہ پلک جھپکے بغیر اپنے سامنے بلیک پینٹ اور بلیک اینڈ وائٹ چیک کی شرٹ میں ملبوس الیان کو دیکھے گئی اسے کسی طور اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے مگر الیان کی آمد کے ساتھ ہی اس کے مسحور کر دینے والے پرفیوم کی خوشبو بھی پورے کمرے میں پھیل جانے کے ساتھ ساتھ رومیلہ کے حواسوں کو بھی جھنجوڑ گئی تھی۔

وہ خود کو یہ یقین دلاتی کہ یہ کوئی غلط فہمی یا اس کی نظر کا دھوکا نہیں ہے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آ۔۔۔ آپ یہاں۔" رومیلہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے دوسری طرف جس طرح وہ اسے دیکھ کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا اس سے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی رومیلہ کی طرح اسی الجھن میں مبتلا ہے کہ کہے تو کیا کہے۔

"اتنی رات گئے اگر آپ حمل سے بھی ملنے آئے ہیں تو بھی آپ کو ڈرائنگ روم میں بیٹھنا چاہیے تھا اس طرح سیدھا کمرے میں آجانا قطعی مناسب نہیں۔" اب کی بار رومیلہ خاصے اعتماد سے بولی۔

الیان بے اختیار سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھنے لگا اس کے ٹھوس لہجے میں بیگانگت کا عنصر خاصا نمایاں تھا الیان کو اس سے اس لب و لہجے کی توقع نہیں تھی کہ وہ غیر ارادی طور پر اسے دیکھے گیا۔

اس کے اس طرح دیکھنے پر رومیلہ کی پیشانی پر ان گنت بل پڑ گئے تبھی وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"مسٹر الیان یہ میرا کمرہ ہے آپ یہاں سے تشریف لے جائیں تو بہتر ہوگا" الیان ایک دم چونک اٹھا۔

جو اس نے کیا تھا وہ رومیلہ کی توقع کے بالکل برعکس تھا تو پھر رومیلہ کا انداز الیان کی خواہش کے مطابق کیسے ہو سکتا تھا۔

ویسے بھی اس کی نظر میں الیان اب ایک غیر شخص تھا لہٰذا ایک اجنبی کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آسکتی تھی۔

الیان نے ایک گہرا سانس کھینچا اور بہت آہستہ آواز میں کہنے لگا۔

"میں تم سے ملنے آیا ہوں کیا تم دو منٹ بیٹھ کر میری بات سن سکتی ہو۔" رومیلہ ایک دم چونک اٹھی۔

وہ اگر یہاں حمل کے گھر تک اس کے کمرے تک آگیا تھا تو یہ بات یقیناً" حمل کے علم میں ہوگی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ جس طرح کمرے میں آکر بغیر کچھ کہے چلی گئی تھی اس کا وہ ناقابل فہم رویہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ

رومیلہ کو الیان کی آمد کے متعلق ہی بتانے والی تھی مگر اس نے یہی سوچ کر کچھ کہا نہیں ہو گا کہ رومیلہ سنتے ہی منع کر دے گی۔

جب اسے یقین تھا کہ رومیلہ اس سے ملنا نہیں چاہے گی تو اس نے کیوں الیان کو اس کی اجازت کے بغیر اس کے کمرے میں بھیج دیا۔

اسے پہلی بار نمل کے کسی فعل سے تکلیف پہنچی تھی فوری طور پر وہ الیان سے یہ نہیں کہہ سکی کہ مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کمرے کی دیوار کو ایسے دیکھنے لگی جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ الیان کو کمرے سے جانے کے لیے کیسے کہے۔

الیان اس کے احساسات سمجھ رہا تھا پھر بھی ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت ناراض ہو لیکن میں۔۔۔"

"میرے اور آپ کے بیچ ایسا کوئی تعلق کبھی تھا ہی نہیں جس پر میں آپ سے ناراض ہوں اور آپ صفائیاں دیں لیکن پھر بھی ایک جو کاغذی رشتہ تھا اب وہ بھی ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب کسی بھی موضوع پر بات کرنا یا کسی تکتے پر وضاحتیں دینا عبث ہے بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔" رومیلہ نے درشتگی سے اس کی بات کاٹ دی۔

اسے شدید غصہ آگیا تھا الیان کے منہ سے ناراض کا لفظ سن کر۔

وہ کوئی ناراض نہیں تھی بلکہ الیان کے اقدام پر شدید صدمے سے گزری تھی انتہائی قسم کے دکھ کے ساتھ ساتھ اسے بے پناہ شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

ابھی تو وہ نمل کے گھر چلی آئی تھی لیکن واپس یونیورسٹی جانے پر اور خاندان کی کسی بھی تقریب میں لوگوں کا سامنا ہونے پر اسے مزید کئی سوالوں اور نظروں کو برداشت کرنا تھا۔

اتنی اذیتوں کے لیے صرف ایک ناراض کا لفظ قطعی مناسب نہیں تھا۔

جبکہ رومیلہ کے چہرے پر پہلی بار غصے کے تاثرات ابھرتے دیکھ کر الیان زیر لب مسکرا دیا وہ جو ابھی تک اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا اس کا تنا ہوا انداز دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گیا کیونکہ ابھی تک اسے ڈر تھا کہ پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کتنی نفرت سے پیش آئے گی لیکن اب اسے دیکھ کر الیان کو اپنی سوچ پر ہنسی آرہی تھی۔

نفرت کرنا اس لڑکی کے بس کی بات ہی نہیں تھی اس کے سرخ ہوتے چہرے سے بھی صاف ظاہر تھا کہ تھوڑی دیر اور غصہ کرے گی تو رو پڑے گی۔

"میرے دیے ہوئے تحفے اور پیپرز الماری میں لے جا کر ایسے رکھے کہ کبھی نکال کر بھی نہیں دیکھے۔

چلو تم نے نہیں دیکھے کم از کم ابرار تو چیک کر لیتا لیکن اس نے بھی ضرورت نہیں سمجھی ورنہ تم یہ کبھی نہ سمجھتیں کہ وہ کاغذی رشتہ اب ختم ہو گیا ہے۔" رومیلہ کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا تھا۔

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی الیان کو اچانک سامنے دیکھ کر اس کے زخم ادھڑ گئے تھے آنکھوں میں جلن ہونے لگی تھی مگر وہ اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اسی لیے آنسوؤں پر بند باندھ ٹوٹنے سے پہلے وہ اسے یہاں سے چلتا کرنا چاہتی تھی اسی لیے اس کی بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی البتہ اس نے ایک چیز ضرور نوٹ کی تھی۔

الیان کے کسی بھی انداز سے کوئی دکھ یا اداسی نہیں جھلک رہی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی بہترین ڈریسنگ رومیلہ کی نظروں میں آچکی تھی اور ابھی جس طرح وہ بولا تھا اس کی بات نے نہ سہی اس کے لہجے نے ضرور رومیلہ کو چونکایا تھا۔

اس کے جملے میں شوخی نمایاں نہیں تھی مگر شوخی کا عنصر ضرور شامل تھا وہ کچھ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی جو آنکھوں میں ذرا بھی شرمندگی یا پچھتاوا لیے بغیر پرسکون انداز میں کھڑا تھا۔

اس نے یہ رشتہ کون سا اپنی خوشی سے قائم کیا تھا جو اس کے ٹوٹنے پر وہ دکھی ہوتا لیکن کم از کم اسے یہ احساس تو ہونا چاہیے تھا کہ رومیلہ کے لیے اس کا یہ اقدام برداشت کرنا آسان نہیں ہو گا۔

ہر چند اس نے الیان کے لیے چھپے احساسات کو کبھی الیان پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر الیان کو اتنا تو علم ہو گا کہ ایک عورت کے لیے طلاق کے مرحلے سے گزرنا اور دنیا کے ساتھ ساتھ خود اپنے گھر والوں کو بھی اپنے حق پر ہونے پر قائل کرنا بہت کٹھن ہوتا ہے اسباب اور وجوہات چاہے جو بھی ہوں ملبہ سارا عورت پر ہی گرتا ہے گھر ٹوٹنے کی وجہ عورت کی ناسمجھی اور بے صبری کو ہی گردانا جاتا ہے۔

پھر اس نے تو نانی اماں اور شگفتہ غفار کے سامنے سارا الزام اپنے ہی سر لے لیا تھا اگر شگفتہ غفار نے الیان سے اس بارے میں کچھ نہیں بھی کہا تھا تب بھی اسے یقین تھا نانی اماں نے ضرور الیان بلکہ ریاض غفار تک ہر اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہو گا۔

پھر بھی وہ اپنے فعل پر ذرا شرمندہ نہیں تھا۔

رومیلہ جیسے ایک شاک میں گھری اسے دیکھ رہی تھی تبھی ایک خیال نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

کہیں شگفتہ غفار اور نانی اماں نے اس کے جھوٹ پر یقین تو نہیں کر لیا کہیں واقعی یہ سب لوگ یہی تو نہیں سوچ رہے کہ وہ کسی اور میں دلچسپی رکھتی ہے چنانچہ الیان کے آزاد کر دینے پر خوشی اور سکون محسوس کر رہی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کچھ سراسیمہ سی ہو گئی وہ اس فطرت اور مزاج کی لڑکی نہیں تھی کہ کوئی اسے ایسا سمجھتا یہ بات اسے چند لمحوں کے لیے مضطرب کر گئی تھی۔

لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے خود کو تسلی دینی چاہی کہ جب ان لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا تو پھر وہ اس کے بارے میں کچھ بھی سوچ لیں کیا فرق پڑتا ہے بلکہ اچھا ہی ہے اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ الیان کے اس فیصلے سے خوش ہے کم از کم وہ اس پر ترس تو نہیں کھائیں گے۔

رومیلہ گہرے گہرے سانس کھینچ کر کوشش کرنے لگی کہ اپنے غصے کو قابو میں کر کے الیان سے قدرے بہتر انداز میں بات کرے کیونکہ اگر وہ اس وقت اس کے پاس یہاں تک آیا تھا تو ضرور کوئی اہم بات کرنے آیا ہو گا۔

الیان اسے بدستور خاموش کھڑا دیکھ کر ایک قدم اور آگے بڑھ آیا خاصی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"اگر ڈیوارس پیپرز اس وقت تمہارے پاس ہیں تو انہیں نکال کر دیکھو اور اگر نہیں ہیں تو اپنے بابا جانی کے گھر جاؤ اور جا کر پڑھو۔ ہمارے بیچ کاغذی رشتہ ابھی تک برقرار ہے میں نے تمہیں صرف ایک طلاق دی تھی جس کے بعد مصالحت کی گنجائش باقی رہتی ہے۔" الیان کے الفاظ تھے یا کوئی بم دھماکا ہوا تھا۔

رومیلہ کو لگا کمرے کی چھت اور دیواریں سب زوردار آواز کے ساتھ اس کے سر پر آگری ہوں وہ سن ہوتے ذہن و جسم کے ساتھ الیان کو دیکھے گئی جو اس کے ششدر رہ جانے کو محسوس کر کے بڑے دلفریب انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

کچھ دیر تو وہ اس کے سکتے کے ٹوٹنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس کے اور قریب آگیا۔

"تم اگر شاک سے باہر آگئی ہو تو میں کچھ کہوں یا تمہارے لیے پانی وغیرہ منگواؤں۔" الیان نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو وہ چونکنے کے ساتھ ساتھ بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور قدرے ترش کر بولی۔

"صرف ایک طلاق کیوں دی ہے جب اس رشتے کو ختم ہی کرنا تھا تو ایک جھٹکے میں ہی ختم کر دیتے یہ مصالحت

کی گنجائش رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس کے لہجے اور سوال پر الیان کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

"کیا واقعی اس رشتے کو ختم کرنا چاہیے تھا؟ اسے رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؟" رومیلہ بغیر کسی تاثر کے ویسے ہی شاک میں کھڑی کھڑی تھی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے تب الیان خود ہی کہنے لگا۔

"اگر تمہیں لگ رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے یا تمہیں بے وقوف بنایا ہے تو تم غلط سوچ رہی ہو' یہ سب میں نے ہمارے رشتے کو مستحکم کرنے کے لیے کیا ہے۔

ویسے پہلے میں تمہارے اس سوال کا جواب دے دوں کہ ایک طلاق دینے کی کیا ضرورت تھی تو رومیلہ طلاق دینے کا شرعی طریقہ تو یہی ہے' ایک ساتھ تین طلاقیں دینا تو اللہ کے دین کو مذاق بنانا ہے۔

لیکن میں اس وقت کوئی شرعی بحث نہیں کرنا چاہتا میں نے تو جو کچھ بھی کیا وہ تمہیں چھوڑنے یا اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کے لیے کیا ہی نہیں۔

مجھے بہت سارے لوگوں کو آزمانا اور یہ دکھانا تھا کہ وہ کتنے غلط ہیں سب سے پہلے مجھے ابرار کو پرکھنا تھا کہ آیا وہ اپنی دھمکی پر آج بھی برقرار ہے یا نہیں۔

یعنی اگر میں تمہیں چھوڑتا ہوں تو کیا واقعی وہ بریرہ کا گھر اجاڑ دے گا حالانکہ کلفام کو گرفتار کرانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا پھر بھی اسے ایک بار تو آزمانا تھا۔

پھر مجھے ممی کو یہ احساس دلانا تھا کہ ان کا رویہ تمہارے ساتھ بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا وہ دل سے اس بات کی قائل ہوں کہ ابرار کے اس فعل میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں۔ اگر تمہیں موقع ملے تب بھی تم ابرار کی طرح بریرہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔

شکر ہے کہ میری یہ دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔ ہاں اب تم یہ ضرور پوچھ سکتی ہو کہ اگر مجھے تمہیں چھوڑنا نہیں تھا اور صرف سب کو احساس دلانا تھا تو میں نے تمہیں اعتماد میں لے کر سب کیوں بتا نہیں دیا۔

تو آئی ایم ریئلی سوری تو سے مجھے تمہیں بھی آزمانا تھا۔" الیان نے ذرا رک کر رومیلہ کے تاثرات جاننے کے لیے اسے دیکھا مگر وہ صرف حیرانی کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی تبھی الیان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اگر تمہیں موقع ملے تو کیا تب بھی تم میری فیملی کا ساتھ دو گی یا اس کے خلاف جاؤ گی' ابھی تو تم مجبور ہو اس لیے ممی کی کڑوی کسیلی برداشت کر لیتی ہو لیکن اگر تمہاری کوئی مجبوری نہ رہے کیا تب بھی تم ممی سے بدلہ لینے یا انہیں سبق سکھانے کا کوئی ارادہ کرو گی یا نہیں۔

حالانکہ مجھے تم سے یہی امید تھی جو تم نے کیا لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا کہ یہ بات سب پر ثابت ہو خود مجھ پر بھی۔" الیان کہہ کر خاموشی سے اسے دیکھنے لگا جو ابھی تک بے یقینی کا شکار تھی۔

الیان کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ اتنے شاک میں تھی کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے' آخر الیان کو خود ہی اس کے مقابل کھڑے ہوتے بہت پرسرور انداز میں کہنا پڑا۔

"ہماری شادی بہت غلط طریقے سے ہوئی ہے کاش ہم دونوں روایتی طریقے سے ایک دوسرے کے شریک حیات بنے ہوتے لیکن شاید ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا بریرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اور ہم گھر والوں نے جو کچھ جھیلا وہ ناقابل فراموش ہے۔ وہ تکلیف' وہ دکھ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کا بدلہ کسی ایسے شخص سے لینا جس کا کوئی قصور نہ ہو یہ میری فطرت ہے نہ ڈیڈی کی۔

ہاں البتہ ممی کے لیے اپنے جذبات چھپانا اور ان پر قابو رکھنا بہت مشکل تھا' ممی کو یہ بات سمجھائی نہیں جا سکتی

تھی انہیں اس کا احساس دلانا تھا اور وہ صرف اسی ایک طریقے سے ممکن تھا جو میں نے کیا۔
ہاں اس سارے عمل میں تمہیں بہت اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا اس کے لیے تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔"
الیان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا تو وہ جو اتنی دیر سے بت بنی کھڑی تھی ایک دم اس میں جان آگئی بے اختیار اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ کئی قدم دور جا کھڑی ہوئی اور بڑے تیز لہجے میں بولی۔
"آپ۔۔۔ آپ جتنی بھی صفائیاں دے لیں' چاہے اپنے اقدام کو جتنا بھی جسٹی فائی کر لیں لیکن میں آپ کے فعل کو کبھی بھی صحیح قرار نہیں دوں گی۔" رومیلہ کا سانس ایسے پھولنے لگا جیسے وہ کئی گھنٹوں سے شدید جسمانی مشقت کر رہی ہو۔
الیان نے کچھ کہنا چاہا تو رومیلہ نے بپھرے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔
"آپ کو لگتا ہے آپ کے فعل سے مجھے صرف اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔
جی نہیں مسٹر الیان۔ آپ نے مجھے جیتے جی قبر میں اتار دیا تھا۔ میں جس تکلیف سے گزری ہوں' وہ موت سے بھی بدتر تھی آپ مجھے یا جس کسی کو بھی آزما رہے تھے یا جو بھی احساس دلا رہے تھے اس میں آپ کو کامیابی ہوئی اس پر آپ کو بہت مبارک ہو۔
لیکن اس آزمائش کے بعد آپ میری پرکھ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترے۔ اپنے اس ڈرامے سے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ سب تو صرف اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق چلانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے آپ کو جو بھی کرنا پڑے بغیر کسی کو ذہنی اور جذباتی طور پر جتنا بھی ٹارچر کرنا پڑے آپ کر گزریں گے۔
ابرار بھائی کو آزما کر آپ نے اپنے ممی ڈیڈی کو اور سب کو ان کی جانب سے یقین دہانی تو کرا دی لیکن میرا یقین پاش پاش کر دیا۔" رومیلہ شدید غصے کے عالم میں بول رہی تھی لیکن بولتے بولتے اب اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنسنے لگا اسی لیے جب وہ بولی تو اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔
"پورے گھر میں مجھے صرف آپ پر بھروسہ تھا یہاں تک کہ میں نے اپنے بھائی بھابی اور بابا جانی پر بھی کبھی اتنا اعتماد نہیں کیا جتنا مجھے آپ پر یقین تھا کہ کم از کم آپ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے مجھے تکلیف پہنچے یا جس سے مجھے دوسروں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔
لیکن آپ نے تو وہی کیا جو ابرار بھائی نے میرے ساتھ کیا تھا' صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے انہوں نے گلفام کو نیچا دکھانے کے لیے میری شادی آپ کے ساتھ کر دی اس بات سے قطع نظر کہ میرے اوپر کیا بیت رہی ہے' ٹھیک اسی طرح آپ نے ابرار بھائی کو ذلیل کرنے کے لیے مجھے سب کے سامنے تماشا بنا دیا اور یہ سوچا تک نہیں کہ میرے دل کی کیا حالت ہو گی۔" رومیلہ روتے بولتے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ اپنے بستر پر ہی بیٹھ گئی الیان خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا' وہ چاہتا تھا اس کے اندر کا غبار نکل جائے اور اس کی حالت کچھ بہتر ہو جائے پھر وہ اس سے کچھ کہے گا تبھی وہ اس کی بات سمجھ بھی سکے گی۔

جب وہ کافی سارے آنسو بہا چکی اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ کر دم توڑنے لگیں تب الیان اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔
"تم نے میری صرف ایک بات سن لی کہ میں ابرار کو آزمانا چاہتا تھا اور آگے میں نے جو کچھ بھی کہا وہ سب یا تم نے سنا نہیں یا اگر سنا بھی تو اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔
میں نے کہا مجھے ممی کو یہ احساس دلانا تھا کہ تم ابرار کی طرح نہیں ہو وہ جو تمہاری بے عزتی کرتی تھیں تمہیں باتیں سناتی تھیں وہ سب نہایت غلط اور محض ان کا غصہ تھا۔

مجھے تمہیں صرف اپنے گھر میں نہیں رکھنا تھا بلکہ تمہیں وہ مقام اور حیثیت دلانی تھی جو میری بیوی کی گھر میں ہونی چاہیے تھی۔
اتنے دنوں میں تمہیں یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں یا ڈیڈی' ممی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ تمہارے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں ان کا مزاج اور ان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ خود بھی بعض اوقات چاہتی تھیں کہ تمہارے ساتھ تلخ کلامی نہ کریں لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پاتی تھیں۔
بریرہ کا گھر اجڑنے کا خطرہ تلوار کی طرح ان کے سر پر لٹکا رہتا تھا پھر بھی وہ تمہارے لیے موجود اپنی نفرت کو چھپا نہیں پاتی تھیں۔ تو پھر آخر اس کا حل کیا تھا کیا تم ساری زندگی ان کے سرکل اور خاندان کے لوگوں کے سامنے ان کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہتیں۔
"میں تمہیں صرف اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا یہ کام تو میں بہت پہلے بہت آسانی سے کر سکتا تھا لیکن مجھے تمہیں سب کی نظروں میں معتبر بنانا تھا یہاں تک کہ خود تمہاری نظروں میں بھی۔" الیان ایک دم خاموش ہو گیا کیونکہ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی ایک دم آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی جیسے اس کی بات نہ سمجھ سکی ہو۔
تب الیان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔
"تمہیں یاد ہے ایک بار میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا اور ممی ٹھیک اسی وقت کہیں باہر سے گھر واپس آگئی تھیں۔ اس وقت تمہارے چہرے پر ایسا ڈر تھا جیسے تم کوئی گناہ کبیرہ کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ مجھے اس وقت تم پر بہت غصہ آیا تھا۔" رومیلہ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی جو دانت پر دانت جمائے ایسے بول رہا تھا جیسے رومیلہ کے چہرے پر موجود وہ خوف اور گھبراہٹ اس کی آنکھوں کے سامنے ابھی بھی ناچ رہی ہو۔
"تم نے تو شاید میری ناراضی محسوس بھی نہ کی ہو لیکن اس کے بعد میں اگلے کئی دنوں تک تم سے بہت اکھڑا اکھڑا رہا تھا۔
چلو میں مانتا ہوں ممی کا رویہ تمہارے ساتھ بہت برا تھا وہ تمہیں میرے پاس بیٹھا دیکھتیں تو تم پر یہی الزام لگاتیں کہ تم مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہو۔
لیکن رومیلہ انسان کو اپنی عزت خود کرانی پڑتی ہے تم اپنے آپ پر خود یقین نہیں کرو گی تو کوئی دوسرا تمہیں کیوں سچے گا۔
شادی چاہے جن حالات میں بھی ہوئی ہو' نکاح تو ہمارا ہوا تھا نا تم اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھیں اور پھر تمہارے دل میں کوئی چور نہیں تھا تم میرے پاس نہیں آئی تھیں' میں تو پڑھائی کر رہی تھیں میں تمہارے پاس آیا تھا تمہیں اخبار دکھانے۔
اگر میں یہ سب نہ کرتا تو تمہارا رویہ میرے ساتھ ساری زندگی ایسا ہی رہتا جبکہ اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔
تمہارے جانے کے بعد ممی کو احساس ہوا ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں کیا۔ پھر ابرار نے بھی بریرہ کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے بھی ان کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔
آج جب میں تمہارے پاس آ رہا تھا تو پہلے میں نے انہیں جا کر سب بتایا ہے اور تمہیں شاید یقین نہ آئے انہوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے کہ میں نے اس رشتے کو ختم نہیں کیا۔
اب تم کل صبح ہوتے ہی اپنے بابا جانی کے گھر واپس چلی جانا ممی اور ڈیڈی خود تمہیں وہاں سے لینے آئیں گے۔"

تمہاری بھابھی کے سامنے جو تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑی ہے اس کا مداوا اسی طرح ہو سکتا ہے۔" رومیلہ دم بخود بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی جو بڑی رسانیت سے بول رہا تھا۔

"ویسے تو مجھے بھی آنا چاہیے مگر میں نہیں آؤں گا کیونکہ میں ابرار کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ جو کچھ اس نے بریرہ کے ساتھ کیا اس کے بعد اسے معاف کرنا تو ناممکن ہے لیکن جب وہ میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تب میرے اندر اس سے بدلہ لینے کی خواہش شدید ہو جاتی ہے' میرا خون کھولنے لگتا ہے اسے دیکھ کر۔ اس وقت میرا غصہ میری عقل پر حاوی ہونے لگتا ہے اور میں خود کو کسی کمزور لمحے کی زد میں نہیں لانا چاہتا۔" الیان کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھتے ہوئے بڑے گمبیر لہجے میں کہتا ایک دم خاموش ہو گیا۔

رومیلہ خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی جو نا جانے کس گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

شاید ابرار کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ذہن میں وہ لمحے اجاگر ہو گئے تھے جب ابرار نے بریرہ کو اغوا کیا تھا اور ان کے گھر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

رومیلہ کو ہمیشہ ہی اس بات کا دکھ رہا تھا کہ بریرہ کو ناحق اتنی تکلیف اٹھانی پڑی مگر اس لمحے یہ افسوس اور بھی بڑھ گیا۔

اسے ذرا سی شرمندگی کا سامنا کیا کرنا پڑ گیا وہ کیسے الیان کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہ رہی اور الیان اور اس کے پورے گھر کی تو عزت و ناموس داؤ پر لگ گئی تھی ان کے غصے اور نفرت کا پھر کیا عالم رہا ہو گا۔

ایسے میں جس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اسے گھر لا کر چوبیس گھنٹے اپنی آنکھوں کے سامنے بٹھانا بھی پڑ گیا اب ان حالات میں وہ رومیلہ کو سر آنکھوں پر تو نہیں بٹھا سکتے تھے۔

اسی لیے اس نے کبھی شگفتہ غفار کو غلط نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ ان کی زہر میں بجھی باتیں پینے کی کوشش کی کہ وہ اسے اپنی جگہ حق بجانب لگتی تھیں۔

اتنی نفرت اور اتنے غصے کو ختم کرنا آسان نہیں تھا وہ اگر ساری زندگی بھی ان کی خدمت کرتی تب بھی ان کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتی تھی للذا جو کچھ الیان نے کیا تھا وہ واقعی قابل ستائش تھا وہ ماں باپ کا دل دکھا کر اگر رومیلہ کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتا تو بھی گھر میں ہر وقت بے سکونی کا عالم رہتا۔

اور الیان کا یہ کہنا بالکل صحیح تھا کہ رومیلہ اس کی شرعی بیوی ہونے کے باوجود ایسے شرمندہ رہی جیسے پتا نہیں اس سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

ان دونوں کے بیچ کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی جسے الیان نے ہی بالآخر توڑا۔ اپنا سر جھٹکتے ہوئے اس نے ایسے گہرا سانس کھینچا جیسے ساری سوچوں کو ذہن سے باہر نکال پھینکا ہو۔

"تو کیا تم صبح اپنے والد کے گھر جا رہی ہو یا ممی سے کہوں کہ تمہیں منانے میں ٹائم لگے گا ابھی کچھ مہینوں یا شاید سالوں انتظار کریں۔" اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ رومیلہ چونک اٹھی اور بے اختیار جرح کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ ایک طلاق دے چکے ہیں رجوع کرنے کی کوئی مدت ہوتی ہے مہینوں اور سالوں انتظار کرنے کا وقت ہے نہ مہلت۔ ایسا نہ ہو اتنے انتظار میں مصالحت کی گنجائش ہی ختم ہو جائے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم نہیں چاہتیں کہ یہ گنجائش ختم ہو۔" الیان نے بظاہر سرسری انداز میں کہا مگر جوابا" رومیلہ خلاف توقع بڑے اعتماد سے بولی۔

"ہاں۔ کیا آپ کو آج پتا چلا ہے۔" الیان کو ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ اتنے دھڑلے سے اعتراف کرے گی وہ کچھ دیر خوشگوار حیرت میں گھرا اسے دیکھتا رہا پھر بڑی جاندار مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

"نہیں مجھے بہت پہلے سے پتا تھا کہ تم اس رشتے کو نبھانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو' اس کی ایک وجہ تو تمہاری وہی مشرقی ذہنیت ہے کہ جہاں ڈولی گئی ہے وہاں سے اب جنازہ ہی نکلے گا۔

اور دوسری وجہ تمہارے دل میں میرے لیے چھپی وہ محبت تھی جو یہ نہ چاہتی کہ میں کبھی تم سے دور رہوں' ہے نا؟"

الیان نے پہلا جملہ تو خاصی شوخی سے کہا تھا مگر دوسرے جملے کو ادا کرتے ہوئے اس میں شوخی سے زیادہ عنصر اس مان کا تھا جس کی بنیاد پر وہ اندازے سے نہیں بلکہ یقین سے کہہ رہا تھا۔

رومیلہ پل بھر کے لیے جھینپ گئی مگر کچھ ہی لمحوں میں اس کی آنکھیں بھر بھر آئیں اور جیسے ہی اس کی آنکھ سے آنسو چھلکا الیان نے اسے اپنی انگلی کی پور پر اٹھا لیا۔

"بس رومیلہ۔ بہت رو لیا تم نے اب اور نہیں۔" الیان کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مگر اس بار الیان نے اسے رونے نہیں دیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"کتنی بار میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ آگے بڑھ کر تمہارے سارے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لوں' آج پہلی بار قسمت نے اس خواہش پر عمل کرنے کا موقع دیا ہے' اب بھی اگر تمہارے آنسو نہیں تھمے تو مجھے یہی لگے گا کہ میری محبت میں اتنی شدت ہی نہیں کہ تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکے۔" رومیلہ بیچ روتے میں مسکرا دی تو الیان ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہوئی نا بات' چلو اب جلدی سے چہرہ صاف کرو اور باہر چلو نیچے بے چارے وہ ہونق پریشان حال بیٹھے ہیں۔"

"کیا مطلب۔" رومیلہ سمجھ نہ سکی۔

"حمل اس لیے پریشان ہے کہ پتا نہیں مجھے تمہارے کمرے میں بھیج کر اس نے صحیح کیا یا نہیں اور خرم اس لیے فکرمند ہے کہ پتا نہیں اسے مجھے یہاں لانا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔"

"خرم نیچے موجود ہے۔" رومیلہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"نا صرف موجود ہے بلکہ ایک کیک بھی لایا ہے اس کی خواہش تھی کہ میں وہ آتے ہی تمہیں پیش کر دوں۔ مگر میں نے منع کر دیا پتا نہیں تم کتنے غصے میں ہو گی میرے ہاتھ میں پھول دیکھ کر کہیں تم آپے سے باہر ہی نہ ہو جاؤ۔" الیان اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔

"ہاں ہاں آپ کے گھر پر میں ہر وقت لوہے کے چنے ہی تو چباتی تھی نا' تبھی تو میرے غصے سے اتنے خوفزدہ تھے"۔ رومیلہ مسکرا کر کہنے لگی تو الیان کچھ دیر مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا پھر بہت شائستہ انداز میں کہنے لگا۔

"تمہاری سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ تم نے کبھی اپنا ضبط نہیں کھویا۔ ممی کے اتنے اور رزی ایکٹ کرنے کے باوجود تم نے کبھی

"کسی مقام پر اور کسی کے بھی سامنے کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس لیے ہر ہنگامے کے بعد میں اور ڈیڈی

صرف ممی کو سمجھانے اور روکنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ تمہاری طرف سے اطمینان تھا کہ تم کسی کے بھی سامنے بے وقوفی کا ثبوت نہیں دو گی۔" الیان کے لہجے میں اس کے لیے ستائش تھی اور آنکھوں میں اس کے لیے بے پناہ محبت۔

رومیلہ کو اپنا آپ ایک دم ہلکا پھلکا ہوتا محسوس ہوا۔ کتنی اذیتوں سے وہ گزری تھی سگے خونی رشتوں نے اسے محض اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا تھا مگر وہ ساری تکلیفیں اس ایک مقام پر آکر ہیچ ہو گئی تھیں۔

اس کا شریک حیات صرف اس سے محبت نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی قدر کرتا تھا اس کے دل میں رومیلہ کے لیے صرف عشق نہیں تھا بلکہ اس کی عزت تھی وہ اس کی خوبیوں کا قائل اور اسے سراہنے والا تھا باقی ہر چیز پس پردہ چلی گئی تھی۔

حالانکہ اب اسے یقین تھا کہ شگفتہ غفار اور ریاض غفار اس کے بابا جانی کے گھر آکر خود اسے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے اور یہ اس کے لیے بہت اطمینان اور خوشی کی بات تھی لیکن اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تب بھی اب وہ الیان کے ساتھ پورے اعتماد کے ساتھ چل سکتی تھی۔

"چلیں۔" الیان نے اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا تو رومیلہ نے بغیر جھجکے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

الیان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے اسے لگ رہا تھا وہ زمین پر نہیں ہواؤں پر چل رہی ہو۔ کمرے میں موجود ٹیوب لائٹس کی روشنی ایک دم چاند کی چاندنی کی طرح روشن اور اجلی ہو گئی تھی کھلی کھڑکیوں سے آتی ٹھنڈی ہواؤں میں جیسے بارش کی بھینی بھینی خوشبو شامل ہو گئی تھی ایک دل کی حالت کیا بدلی تھی کہ ہر منظر ہر کیفیت بدل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بلال اختر ابھی ابھی آفس سے تھکے ہارے گھر آئے تھے ان کے گھر میں زوبیہ کی موجودگی میں بھی سناٹوں کا راج رہتا تھا لہٰذا زوبیہ کے جانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا تھا مگر قدرتی طور پر انہیں گھر میں پھیلی خاموشی اب حد سے تجاوز کرتی محسوس ہوتی تھی چنانچہ وہ جان بوجھ کر آفس سے دیر سے گھر آتے تھے۔

عائشہ اختر کی جانب سے انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ وہ اکیلی ہیں یا انہیں اس وقت بلال اختر کی ضرورت ہے۔ ریاض غفار کی فیملی سے عائشہ اختر کو بہت سہارا مل گیا تھا بلکہ اب تو الیان کی بیوی بھی گھر پر ہی موجود ہوتی تھی جو انہیں پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی اب اس سے عائشہ اختر کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

رومیلہ سے مل کر عائشہ اختر کی شخصیت پر کافی مثبت اثر پڑا تھا وہ بڑی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی تھیں زوبیہ کی موت کے بعد سے ان کی گفتگو میں ہر وقت یاسیت گھلی رہتی تھی خاص طور پر رات کو بلال اختر جب کمرے میں سونے آتے تھے عائشہ اختر کوئی نہ کوئی ایسا ذکر چھیڑ دیتیں کہ بلال اختر کا کوفت اور جھنجلاہٹ سے برا حال ہونے لگتا۔

مگر رومیلہ نے ان کا ذہن و دل کچھ اس طرح بدلا تھا کہ وہ قسمت سے شکوہ کناں رہنے کی بجائے اور اپنی غلطیوں پر کڑھنے کی بجائے عبادت میں مشغول رہنے لگی تھیں۔

بلال اختر یہ سوچ کر سکون محسوس کرنے لگے تھے کہ اب ان کی گفتگو میں مری ہوئی بیٹی کے ساتھ کیے سلوک پر پچھتانے کی بجائے آگے کی زندگی کا لائحہ عمل ہونا چاہیے اس پر بات ہو رہی ہوتی تھی۔

پہلی بار جب انہوں نے ان کے منہ سے یہ سنا تو وہ خاصی خوشگوار حیرت کے ساتھ انہیں دیکھتے رہے تھے۔

"میں سوچتی ہوں زوبیہ کے زیور اور کپڑے کہیں ایسے کسی ادارے میں دے دوں جہاں لڑکیوں کی شادیاں وغیرہ کرائی جاتی ہیں وہ غریب لڑکیاں یہ چیزیں استعمال کر کے اس کے لیے مغفرت کی دعا کریں گی۔ دنیا میں تو ہم زوبیہ کے لیے کچھ نہیں کر سکے لیکن وہ آخرت میں اٹھائی جائے گی تب وہ دیکھے گی کہ اس کی ماں نے اس کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر کتنے کام کروائے اور اس کے لیے نیکیوں کا ڈھیر جمع کر دیا تو وہ مجھ سے کتنی خوش ہو گی۔" حسرت اور ملال سے ہٹ کر ان کے منہ سے ایک خوش آئند بات سن کر بلال اختر بے اختیار اپنی حیرت ظاہر کر گئے۔

"یہ آج سورج کہاں سے نکلا تھا یہ تم اتنی سمجھداری کی باتیں کیسے کر رہی ہو۔" ان کے پوچھنے پر عائشہ اختر ایکدم جوش میں آگئیں۔

"ارے میں آج الیان کی بیوی سے ملی تھی وہ کافی دنوں سے اپنے والد کے گھر پر تھی اب آئی ہے تو مجھے پتا چلا وہ بہت پیاری اور سمجھدار لڑکی ہے۔

جب سے زوبیہ نے ہوش سنبھالا تھا میں ہمیشہ یہ سوچتی رہی تھی کہ میرا کیا میرے آگے آرہا ہے پہلی بار رومیلہ سے مل کر یہ احساس ہوا کہ اگر میں نے ماضی میں کچھ غلط کیا تھا تو اس پر کڑھنے کی بجائے اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

جو وقت غفلت میں گزر گیا سو گزر گیا لیکن جو وقت ہے اس کو ضائع نہ ہونے دوں۔

اپنی والدہ اور زوبیہ دونوں کی مغفرت کے لیے اتنے نیک کام کروں کہ قیامت والے دن وہ لوگ مجھے معاف کر دیں ان نیک کاموں کے ذریعے میری اپنی نیکیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔"

"کمال ہے یہ اتنی عقل مند لڑکی الیان کو کیسے مل گئی۔" بلال اختر نے کوٹ اتارتے ہوئے طنزیہ کہا تو عائشہ اختر کچھ خائف ہو کر کہنے لگیں۔

"الیان اسی قابل ہے کہ اسے اتنی عقل مند لڑکی ملے۔ آپ تو میرے بھائی بھابھی سے آج تک نالاں ہیں حالانکہ آپ کو تو ان سے شرمندہ ہونا چاہیے۔"

"کس بات پر شرمندہ ہوں۔ ہم نے جو کیا تھا اس سے کئی زیادہ سزا ہماری بیٹی بھگت چکی ہے اب حساب برابر ہو چکا ہے۔" بلال اختر نے تلخی سے کہا تو عائشہ اختر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگیں۔

"نہیں بلال یہ سوچ غلط ہے کہ ہمارے کیے کی سزا ہماری بیٹی کو ملی ہے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا منصف ہے وہ ایک کے کیے کی سزا کبھی دوسرے کو نہیں دیتا۔

زوبیہ کے ساتھ جو ہوا وہ اس کا نصیب تھا۔

رومیلہ نے ہی مجھے سمجھایا ہے کہ یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ ماں باپ کا کیا اولاد کے آگے آتا ہے اس طرح تو ہر پریشان حال انسان یہ سوچ کے بیٹھ جائے گا کہ اس کے ماں باپ نے ضرور کسی کا دل دکھایا ہے جو آج وہ تکلیف میں ہے جبکہ دوسری جانب کچھ والدین آپ کی طرح ہوتے ہیں جنہیں اولاد سے بھی ایسی کوئی خاص محبت نہیں ہوتی اگر انہیں یہ یقین ہو کہ ان کا کیا محض ان کی اولاد کے آگے آئے گا اور وہ اپنی زندگی آرام سے جیتے رہیں گے تو وہ گناہ کرتے وقت کبھی بھی خوف خدا میں مبتلا نہیں ہوں گے۔" عائشہ اختر بڑے سکون سے بول رہی تھیں بلال اختر ان کی بات سن کر چڑ گئے۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے زوبیہ سے محبت نہیں تھی گویا میں ان سفاک لوگوں میں سے ہوں جنہیں اولاد سے بھی پیار نہیں ہوتا۔"

"ہاں بالکل۔ زوبیہ کے مرنے سے آپ کو کیا فرق پڑا جب تک وہ زندہ تھی آپ پھر بھی اس کی حرکتوں کی وجہ سے شرمندہ ہوتے تھے اس کے مرنے کے بعد ایک بار آپ کو بدنامی کی کیچڑ برداشت کرنی پڑی لیکن اب اس کے

مجرموں کے سلاخوں کے پیچھے چلے جانے کے بعد آپ اس بے عزتی سے بھی لاپرواہ ہو گئے ہیں اور آرام سے اپنی بزنس لائف میں مصروف ہیں۔

"جبکہ ندویہ جب تک زندہ رہی تکلیف میں رہی یہاں تک کہ موت بھی اسے۔۔۔" عائشہ اختر کی آواز رندھ گئی تو انہیں خاموش ہونا پڑا۔

بلال اختر کا دل تو بہت چاہ رہا تھا انہیں کھری کھری سنانے کا مگر وہ کوئی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے تھے انہیں نیند آرہی تھی جبکہ عائشہ اختر کی نیندیں ختم ہو چکی تھیں وہ زیادہ جذباتی ہو جاتیں تو رات بھر بول سکتی تھیں اور واقعی بلال اختر کو خاموش دیکھ کر وہ ایک بار پھر کہنے لگیں۔

"سزا اور جزا کا عمل تھوڑا بہت دنیا میں ضرور ہوتا ہے لیکن آخرت کی سزائیں اپنی جگہ موجود رہتی ہیں اور وہاں جو سزا ملے گی پورے حساب کتاب سے ملے گی وہ دن ایسا ہو گا جہاں کسی پر ایک ذرے کے برابر بھی ظلم نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ کا انصاف یہی ہے کہ کسی بھی شخص پر ایک ذرے کے برابر بھی ظلم نہ ہو۔

ندویہ کے ساتھ جو ہوا وہ اس کی قسمت تھی ہاں البتہ اسے دیکھ کر ہمیں تائب ہونا چاہیے کہ ہم نے دوسروں کو کتنی تکلیف دی جس طرح ہماری بیٹی تڑپتی ہوئی چلی گئی ہماری وجہ سے کوئی دوسرا سسکتا ہوا نہ جائے۔

اولاد کو دیکھ کر انسان کا دل نرم ہو جانا چاہیے اور دوسرے کے درد کو سمجھنے کا احساس بڑھ جانا چاہیے۔"

"مجھے نیند آرہی ہے عائشہ لائٹ آف کر دو۔" بلال اختر نے کپڑے بدلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا وہ بے زاری سے بستر پر دوسری جانب کروٹ کر کے لیٹ گئے۔

عائشہ اختر کچھ دیر خاموشی سے ان کی پشت کو دیکھتی رہیں پھر اٹھ کر نا صرف انہوں نے لائٹ آف کر دی بلکہ وہ خود کمرے سے باہر نکل آئیں۔

ان کے قدم اب ندویہ کے کمرے کی جانب بڑھ رہے تھے یہ ان کا وہ آبائی گھر تو نہیں تھا جہاں ندویہ پیدا ہوئی تھی اور جہاں سے عائشہ اختر سمیت ندویہ کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔

پھر بھی انہیں ندویہ کے کمرے میں بیٹھ کر سکون ملتا تھا پہلے اس کے کمرے میں جا کر وہ گھنٹوں روتی تھیں تو بلال اختر نے اس کمرے کو لاک کر کے اس کی چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔

مگر اب جبکہ عائشہ اختر کا دنیا کو دیکھنے اور برتنے کا نظریہ بدل گیا تھا انہوں نے بلال اختر کی غیر موجودگی میں ایک چابی میکر کو بلا کر اس کی ڈپلیکیٹ چابی بنوالی تھی اور دن کے کسی نہ کسی وقت اس کمرے میں جا کر ضرور بیٹھ جاتی تھیں مگر آج وہ ریاض غفار کے گھر صبح سے چلی گئی تھیں انہیں ندویہ کے کمرے میں جانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا چنانچہ ایک بے چینی ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی اور پہلی بار وہ رات میں اس کے کمرے میں آگئیں۔

اس کمرے میں ندویہ نے زیادہ وقت نہیں گزارا تھا پھر بھی اس کی خوشبو سماں بسی ہوئی تھی کچھ دیر دروازے میں کھڑی رہ کر وہ جیسے اس کی خوشبو اپنے اندر جذب کرنے لگیں پھر دھیرے دھیرے چلتی اس کے بستر پر آبیٹھیں اس کے تکیے پر ہاتھ پھیرتے سے انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کا سر سہلا رہی ہوں۔

حالانکہ انہوں نے اس کی زندگی میں کبھی اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر اس طرح نہیں سہلایا تھا اس وقت انہیں یہ ساری باتیں مڈل کلاس عورتوں کے چونچلے لگتے تھے ان کا خیال تھا بچے کو خود سے تھوڑا دور رکھا جائے جبھی اس میں خود اعتمادی آتی ہے جبکہ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے اور اس کے لاڈ اٹھانے سے بچہ ماں کے ساتھ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے اس کا پلو پکڑ کر چلنے سے وہ بچہ کبھی بھی بڑا نہیں ہوتا اسے اپنے ہر کام کے لیے ماں کی جانب دیکھنا پڑتا ہے۔

پھر وہ اپنی سماجی زندگی میں اتنی مصروف اور خوش تھیں کہ ندویہ کو خود سے زیادہ قریب کر بھی نہیں سکتی تھیں

ورنہ ندویہ میں لگ کر انہیں اس زندگی کو مکمل طور پر نہ سہی لیکن کافی عرصے تک خیرباد کہنا پڑتا جو کہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا مگر صرف اس وقت۔ آج انہیں اس طرز زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے کمرے میں بیٹھ کر وہ ان ہی گزری باتوں کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں۔

جو کچھ ندویہ کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کا نصیب تھا ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ روکنا تو دور کنا کچھ لمحوں کے لیے ٹال بھی نہیں سکتا لیکن اگر انہوں نے ندویہ کی بات کبھی غور سے سنی ہوتی تو جس طرح خرم یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ جو دیکھتی اور کہتی ہے وہ محض بکواس نہیں ہے بلکہ ایک ایسا علم ہے جو ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا اور کاش ندویہ کے پاس بھی نہ ہوتا اچھا ہے کہ مستقبل کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

دیکھ لے تو سمجھ نہیں سکتا' سمجھ لے تو بدل نہیں سکتا۔

لیکن اگر عائشہ اختر بھی اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتیں تو ندویہ اس قدر بے اعتبار نہ ہوتی اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کو لے کر وہ اتنی احساس کمتری کا شکار نہ ہوتی۔

جب اس نے بتایا تھا کہ کالج میں اس کا مذاق اڑانے والی نتاشا مر گئی ہے تب عائشہ اختر چونک اٹھی تھیں کیونکہ سب کو یہ پتا تھا کہ وہ غائب ہے کسی کو اس کے مر جانے کا علم نہیں تھا پھر یہ بات اس نے اتنے یقین سے کیسے کہہ دی۔

انہیں یہی لگا تھا کہ اگر ندویہ یہ جانتی ہے کہ وہ مر گئی ہے تو ضرور اس کے پیچھے ندویہ کا ہی ہاتھ ہے انہوں نے کسی اور ممکنات پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

اگر خرم کی طرح وہ بھی یہ اندازہ لگالیتیں تو بھلے ہی وہ ندویہ کو بچا نہ پاتیں لیکن ندویہ کا کچھ وقت اس سکون اور اطمینان کے ساتھ گزرتا کہ دنیا بھلے ہی اسے جو بھی کہے اس کی ماں کم از کم اسے پاگل نہیں سمجھتی اس نے ندویہ کے اندر الجھتی گتھی سلجھائی ہے وہ اس کی رازدان ہے اس پر بھروسا کرتی ہے۔

لیکن اس کی ماں تو اسے پاگل کے ساتھ ساتھ قاتل سمجھنے لگی تھی۔ اسے ڈاکٹر شکیلہ کے پاس ایسے خوفزدہ انداز میں لے کر گئی تھی کہ کہیں کسی کو پتا چل گیا تو ندویہ کو جیل ہو جائے گی۔

کیا بیتی ہوگی ندویہ کے دل پر جب اس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں اس کے لیے شبہات ناچتے دیکھے ہوں گے۔

عائشہ اختر کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں اور وہ انہیں باتوں پر ایک بار پھر آنسو بہانے لگیں جن پر روز بہاتی تھیں۔

ایک پہیلی ہوں میں
جسے بوجھ نہ سکا کوئی عمر بھر
ایک سوال ہوں میں
الجھائے جو سب کو ہر موڑ پر
نہ ڈھونڈ مجھ کو
نہ مجھے تلاش کر
ایک کھوج ہوں میں
بھٹکائے گی تجھے ادھر ادھر
بے ہنگم سے سانچے میں ڈھلے تھے میرے روح و قلب
پھر کیونکر ہموار ہوتا میرا مقدر
اندازوں پہ مبنی تھا میری شخصیت کا وزن
نصیب تھا میرا وست کوزہ گر

✿ ✿ ✿

"اوف خرم میں تو بالکل اوور لگ رہی ہوں سنبل اور رومیلہ تو مذاق اڑانے بیٹھ جائیں گی؟ اچھا خاصا میں شلوار قمیص پہن رہی تھی آپ کے کہنے پر خوامخواہ یہ ساڑھی باندھ لی" لائیٹ پنک کلر کی نفیس سے کام والی شیفون جارجٹ کی ساڑھی پر نازک سا پرس لیے خرم کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے وہ خاصی الجھ رہی تھی۔

"لگتا ہے تمہارا اپنی تعریفیں سن سن کر پیٹ نہیں بھرا ہے اسی لیے ایسی باتیں کررہی ہو تاکہ میں دوبارہ شروع ہوجاؤں۔" خرم اس کے ساتھ چلتے چلتے رک گیا اور باقاعدہ ہاتھ باندھ کر ایسے کھڑا ہوگیا جیسے کوئی لمبی تقریر کرنے والا ہو۔

"نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے 'فار گاڈ سیک' یہاں مت شروع ہوجانا۔" تمل بری طرح گڑبڑا گئی اس نے ہوٹل کے شاندار کوریڈور میں ایسے ادھر ادھر دیکھا کہ خرم کی ہنسی نکل گئی۔

"تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے ہم ابھی تک یونیورسٹی میں پڑھنے والے اسٹوڈنٹس ہوں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن اب ہم میاں بیوی ہیں تمہاری تعریف کرنے کا لائف ٹائم پرمٹ ہے میرے پاس۔" خرم نے اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"خرم کچھ تو موقع محل دیکھا کریں۔" تمل پیچھے ہٹتے ہوئے دانت پیس کر بولی تو خرم قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"چلیں جلدی۔ سنبل کے میسج پر میسج آرہے ہیں ہماری شادی کی خوشی میں اس نے لنچ رکھا ہے اور ہم ہی اب تک نہیں پہنچے ہیں' الیان بھائی اور رومیلہ تو کب کے آگئے ہیں۔" تمل نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تو خرم بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہاری وجہ سے ہی دیر ہورہی ہے تم نے ایک ساڑھی باندھنے میں دو گھنٹے لگا دیے۔"

"اب میں کچھ کہوں گی تو آپ پھر یہی کہیں گے کہ میرا اپنی تعریف سننے کا دل چاہ رہا ہے۔" تمل نے ایک اچٹتی نظر خرم پر ڈالی تو وہ ایک بار شوخی سے کہنے لگا۔

"تو میں تو تیار ہوں' بتاؤ کہاں سے شروع کروں۔" تمل نے جس طرح زچ ہوکر خرم کو دیکھا اس پر خرم مجبور ہوکر زبردستی سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک مہینہ ہوگیا تھا ان کی شادی کو مگر خرم کی شوخیاں کم ہونے کی بجائے بڑھتی جارہی تھیں اس کی سنگت میں تمل اتنی خوش تھی کہ کبھی کبھی اسے اپنے آپ پر حیرانی ہونے لگتی کیونکہ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی اتنی خوش بھی رہ سکے گی۔

جب عظمت خلیل کے چہرے پر تیزاب پھینکا گیا تھا تب تمل کو لگتا تھا اب وہ اور رشیدہ کبھی مسکرا نہیں سکیں گے جب تک عظمت خلیل اسپتال میں تھے تب تک تو حالات پھر بھی بہتر تھے مگر جب وہ گھر آگئے تب صورت حال اور مشکل ہوگئی۔

عظمت خلیل ہروقت مصروف رہنے کے عادی تھے ان سے اتنی فراغت برداشت نہیں ہوتی تھی پھر انہوں نے زندگی میں معمولی سی تکلیف کبھی نہیں سہی تھی تو اتنی اذیت کیسے جھیلتے۔ پہلے اپنی ذرا ذرا سی بات پر وہ رشیدہ اور تمل کو ہزار باتیں سنا دیا کرتے تھے اور اب تو وہ بولنے کے ہی قابل نہیں رہے تھے اس بے بسی میں وہ صرف آنکھ سے آنسو بہانے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے تھے رشیدہ تو ان کے سامنے خود بھی رونے بیٹھ جاتیں البتہ تمل ضبط کرجاتی تھی۔

وہ دونوں ہروقت ان کی دلجوئی اور خدمت میں لگے رہتے اس کے باوجود جب کبھی عظمت خلیل سے منہ میں

تکلیف کی وجہ سے کچھ کھایا نہ جاتا یا بولا نہ جاتا تو وہ جھنجلا کر کھانے کی پلیٹ اٹھا کر پھینک دیتے مگر رشیدہ اور تمل کبھی برا نہیں مانتیں ان دونوں نے جس طرح تمل اور دلجمعی کے ساتھ عظمت خلیل کا خیال رکھا تھا اس کی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔

اسی لیے جب عظمت خلیل صحت یاب ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے بھلے ہی انہیں سراہا نہیں نہ ہی کبھی اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگی لیکن ان کے انداز میں تبدیلی ضرور آگئی تھی۔

رشیدہ کہتی تھیں ان کا دل بدل گیا ہے' تکلیف انسان کے اندر بہت کچھ بدل دیتی ہے۔

مگر تمل ان سے اتفاق نہیں کرتی تھی اس کا خیال تھا وہ سدا ایسے ہی رہیں گے یہ محض وقتی ابال ہے ایک بار وہ ٹھیک ہوکر اپنے معمول پر آئیں گے تو پھر ویسے ہی ہوجائیں گے بات بات پر ان ماں بیٹی کی عزت نفس کی دھجیاں اڑانے والے' لیکن اس وقت تمل کو اپنی سوچ بدلنی پڑی جب انہوں نے خاص طور سے تمل کو بلا کر خرم کے بارے میں اس کی رائے مانگی تمل ششدر سی انہیں دیکھتی رہی جب انہوں نے جلے ہوئے چہرے کے ساتھ بمشکل دھیمی آواز میں کہا۔

"فرقان حسن مجھ سے ملنے اسپتال بھی آئے تھے گھر پر بھی آئے تھے اور اب بھی فون کرتے رہتے ہیں ان کا کہنا ہے خرم نے ایک غلط فہمی کا شکار ہوکر جذبات میں آکر منگنی توڑدی تھی وہ اب اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے اور میرے پاس آکر معافی مانگنا چاہتا ہے۔

مجھے نہیں پتا وہ غلط فہمی کس قسم کی تھی اسے معاف کرنا چاہیے یا نہیں یہ فیصلہ تم کرسکتی ہو مجھے پوچھنا اچھا نہیں لگا اگر تمہاری مرضی ہو تو میں خرم کو گھر آنے کی اجازت دوں آخر زندگی تمہیں گزارنی ہے مجھے نہیں۔"

تمل آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی اور ان کے سینے سے لگ کر ایک دم رونے لگی۔

عظمت خلیل کی قوت گویائی اتنی نہیں تھی کہ اس کی ہچکیوں کے بیچ وہ بولتے اور تمل سن لیتی وہ اس کا سر تھپک کر اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگے مگر اس کے رونے میں اور شدت آگئی تب رشیدہ کو آگے بڑھنا پڑا۔

"آپ خرم کو بلالیں۔ بلکہ فرقان بھائی سے کہیں کوئی جلدی کی تاریخ رکھ دیں خرم کی پڑھائی بھی ختم ہوگئی ہے اب کیا انتظار کرنا ہے۔" عظمت خلیل بغور رشیدہ کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے سر اثبات میں ہلادیا۔

اگر رشیدہ اتنی بڑی بات کہہ رہی تھیں تو یقیناً" وہ تمل کی مرضی سے واقف ہوں گی انہیں تمل کے منہ سے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔

اور اس طرح وہ بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام اتنی آسانی سے ممکن ہوگیا اور تمل خرم کی زندگی میں شامل ہوگئی۔

عظمت خلیل اب اتنے بہتر ہوگئے تھے کہ دوبارہ سے آفس وغیرہ جانے لگے تھے لیکن تمل کی شادی کے بعد ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کچھ وقت اب گھر پر بھی گزاریں حالانکہ ابھی بھی زبان سے وہ یہ نہیں کہتے تھے لیکن ان کے رویے میں واضح فرق تھا۔

ایک وقت تھا جب وہ صرف بولا کرتے تھے اور عملی طور پر کچھ نہیں کرتے تھے اور اب وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے مگر ان کے ہر عمل سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پوری کوشش کرتے ہیں ان دونوں کا خیال رکھنے کی۔

وہ اندر سے بدل ضرور گئے تھے مگر ان کی فطرت میں بسی "میں" ابھی بھی باقی تھی جو وہ اپنی بے حسی اور کوتاہیوں پر شرمندہ ضرور تھے مگر ان کی معافی مانگنے پر راضی نہیں تھے۔

رشیدہ اور تمل کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ ان کا رویہ بدل گیا ہے انہیں کوئی شوق نہیں تھا کہ وہ ان کے سامنے معذرت خواہ ہوکر کھڑے ہوجائیں بلکہ تمل تو بہت ہی خوش تھی ان میں رونما ہونے والی تبدیلی پر۔

وہ تو پہلے یہی سوچتی تھی کہ رشیدہ تیار ہوں یا نہ ہوں وہ تب ہی شادی کرے گی جب اسے ایسا کوئی شخص ملے گا جو رشیدہ کو اپنے گھر رکھنے پر رضامند ہو ورنہ وہ رشیدہ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گی۔

لیکن اب عظمت خلیل کی طرف سے اسے اطمینان تھا کہ وہ رشیدہ کے لیے اتنا وقت ضرور نکال لیں گے کہ رشیدہ بالکل تنہا نہیں رہ جائیں گی۔

اس لیے اس یقین کے ساتھ جب وہ خرم کے ساتھ اپنی نئی زندگی میں شامل ہوئی تو بہت پرسکون اور مطمئن تھی۔

دوسری طرف رومیلہ بھی الیان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی اسی خوشی میں سنبل نے ان دونوں کو ہوٹل میں لنچ پر بلایا تھا۔

جس پر خرم بخوشی آنے کے لیے تیار ہونے کے باوجود سنبل سے ملنے پر شکایتی انداز میں کہنے لگا۔

"تم نے یہاں ہوٹل میں کھانے پر بلا کر اپنا پھوہڑپن پوری طرح ظاہر کر دیا یار گھر میں کھانا پکا کر دعوت پر بلاتیں تو ایک بات بھی تھی۔" خرم نے الیان سے معانقہ اور ان سب سے سلام دعا کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تم دونوں کے آنے سے پہلے یہی کہہ رہا تھا اول تو ہم دونوں کو بلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی تم تینوں سہیلیاں مل کر کہیں بھی سیلیبریٹ کر لیتیں، لیکن اگر ہم دونوں کو بلانا اتنا ہی ضروری تھا تو گھر پر کھانا پکا لیتیں۔" الیان کے لہجے میں اعتراض نہیں تھا بلکہ شوخی کا پہلو چھپا تھا۔

سنبل نے مسکرا کر ان دونوں کے تبصرے سنے پھر گلا کھنکارتے ہوئے کہنے لگی۔

"اصل میں آپ چاروں کو یہاں اس ہوٹل میں بلانے کا ایک خاص مقصد تھا یہ ہوٹل آپ چاروں کی زندگی میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔" سنبل کی بات پر وہ چاروں ایک ساتھ چونک اٹھے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"ہماری شادی اس ہوٹل میں ہوئی تھی اور کیا خاص بات ہے یہاں۔" الیان نے حیرانی سے ان سب کی شکل دیکھی۔

"خرم اور ثمل بھی پہلی بار یہیں ملے تھے نا۔" رومیلہ کے لہجے میں بڑی خوشگوار حیرت تھی۔

"یہ ٹیبل بھی وہی ہے جس پر تم تینوں بیٹھی تھیں۔" خرم نے بھی حیرانی سے سنبل کو دیکھا جو بڑے بھرپور انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"تو کیا تم نے جان بوجھ کر یہی ٹیبل بک کی ہے۔" ثمل بے تحاشا حیرت کے ساتھ بولی تو سنبل مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگی۔

ان سب کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا تھا تب ہی ان سب کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو اچانک کوئی خوب صورت پرانی بات یاد آنے پر آجاتی ہے۔

"یہ تم سب کیا یاد کر کے مسکرا رہے ہو ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔" الیان نے خاصی دلچسپی سے پوچھا تو رومیلہ شوخی سے کہنے لگی۔

"بڑی لمبی کہانی ہے خاصے فلمی انداز میں ملے تھے یہ دونوں۔"

"خیر ملے تو ہم بھی فلمی انداز میں ہی تھے۔ بھلے ہی ہماری شادی کا دن تھا۔" الیان نے زیر لب کہا جو رومیلہ ہی سن سکی جو اس کے برابر میں بیٹھی تھی اس نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو روکتے ہوئے اس دن کی ساری تفصیل سنانی شروع کر دی کہ کس طرح وہ تینوں یہاں لنچ کرنے آئی تھیں اور خرم نے ثمل کا پرس چرا لیا تھا پھر خود ہی اس لنچ کی مدد کرنے بھی آگیا۔

اس وقت وہ تینوں کتنی پریشان ہو گئی تھیں جبکہ آج اس وقت کو یاد کرتے ہوئے وہ پانچوں محظوظ ہو رہے تھے البتہ خرم ایک اور یاد تازہ ہونے پر کچھ چپ سا ہو گیا تھا۔

اچانک ہی اسے خیال آیا تھا کہ یہیں اس ڈائننگ ہال میں الیان اور رومیلہ کی شادی والے دن وہ ندیبہ سے بھی ملا تھا بے شک اپنے گھر پر وہ اسے دیکھ چکا تھا لیکن باقاعدہ ملاقات اس کی ندیبہ سے یہیں پہلی بار ہوئی تھی مگر اس نے دانستہ اس ذکر کو نہیں چھیڑا تھا۔

ندیبہ کے ساتھ اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی جس سے دوستی کا اس نے دعوا کیا تھا اس کے مرنے کے بعد وہ اس کا دوست بنا تھا اسے ندیبہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس پر افسوس تھا لیکن اس افسوس کا تذکرہ سب کے درمیان میں بیٹھ کر کرنا مناسب نہیں تھا خاص طور پر ایسی صورت میں جب اس کے مجرم عمر قید کی سزا بھگت رہے تھے۔

"کیا ہوا خرم تم کس سوچ میں ڈوب گئے۔" وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے ندیبہ کا خیال آنے پر گم سم سا ہو گیا تھا مگر ثمل نے وہ بھی بھانپ لیا۔

اس کے آہستہ آواز میں پوچھنے پر خرم چونک کر اسے دیکھنے لگا وہ ہستی جو اس کرہ ارض پر اس کے لیے سب سے اہم تھی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی بس ایک لمحے میں خرم اپنی ساری سوچیں جھٹکتا ہوا حال میں واپس آگیا اور ہاتھ اٹھاتے ہوئے رومیلہ کو خاموش کرنے لگا جو اب الیان کو بعد میں یونیورسٹی میں ہونے والے قصے سنا رہی تھی۔

"بس بس ماضی سے باہر نکلو اور حال کی بات کرو ہم چاروں کے لیے یہ جگہ واقعی یادگار ہے کہ ہمیں اپنے لائف پارٹنر پہلی بار یہاں ملے تھے اور لڑکیاں ایسی باتیں یاد رکھنے میں بہت ہی ایکسپرٹ ہوتی ہیں بلکہ خاصی خوش فہم بھی ہوتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے سنبل کا ہم چاروں کو یہاں بلانے کے پیچھے بھی مقصد کچھ ایسا ہی ہے۔" خرم نے ترچھی نظروں سے سنبل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔" سنبل نے آنکھوں کو چندھیاتے ہوئے پوچھا۔

"یعنی یہ جگہ تمہاری دونوں دوستوں کے لیے لکی ثابت ہوئی ہے تو کہیں تم یہ سوچ کر تو یہاں آکر نہیں بیٹھ گئی ہو کہ تمہارا ہیرو بھی تمہیں یہیں مل جائے گا۔" خرم نے بظاہر خاصی سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی مگر الیان، رومیلہ اور ثمل کی ہنسی ایک ساتھ چھوٹی تھی جبکہ سنبل بری طرح بلش ہوتے ہوئے کھسیانی آواز میں بولی۔

"جی نہیں میں نے ایسا کچھ بھی نہیں سوچا۔"

"اب بنو مت۔ تم نے سوچا یہاں اکیلی آکر کیسے بیٹھو گی اس لیے ان دونوں کو بھی بلا لیا تاکہ تم اکیلی بیٹھی ہیرو کا انتظار کرتی ہوئی بے وقوف نہ لگو۔" ثمل اور رومیلہ کا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا جبکہ صرف الیان مسکراتا رہا وہ سب یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے تھے چنانچہ آپس میں بے تکلف تھے جبکہ الیان کو سنبل کے چہرے پر بیک وقت غصے اور شرم کے تاثرات دیکھتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"میں بے وقوف لگ ہی نہیں سکتی کیونکہ میں بے وقوف ہوں ہی نہیں کہ یہاں بیٹھ کر کسی ہیرو کا انتظار کروں۔" سنبل تپ کر بولی اسے رومیلہ اور ثمل کو خرم کے ساتھ مل کر خود پر ہنستا دیکھ کر شدید تاؤ آگیا تھا۔

"دیکھو برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ قدرتی سی بات ہے تمہاری دوستوں کو اس جگہ پر اتنے ہینڈسم لڑکے مل گئے تو اگر تم یہ سوچو کہ تمہیں بھی۔۔۔"

"میرے پاس سوچنے کے لیے اور بہت کچھ ہے ان باتوں کے علاوہ۔ ویسے بھی میرے پیسے اگر کسی نے چوری کیے تو میں ثمل کی طرح رونے نہیں بیٹھ جاؤں گی آپ دونوں جو حضرات موجود ہیں پے منٹ آپ میں سے کوئی

بھی کردے گا کسی ہیرو کو میری مدد کرنے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" سنبل نے جل کر ثمل اور رومیلہ کو دیکھا جو ہنس ہنس کر دہری ہوگئی تھیں۔

"میں کب رو رہی تھی۔" ثمل ہنسی کے دوران بھی احتجاج کرنے سے باز نہ آئی۔

"اگر خرم نہیں آئے ہوتے تو تمہارے آنسو بس ٹپکنے ہی والے تھے۔" سنبل نے دانت پیسے اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا ایک خاصی دلکش آواز نے ان سب کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

"ایکسکیوزمی۔" ان سب نے آواز کی سمت دیکھا تو سب کی ہنسی ایکدم غائب ہوگئی۔

ان کے سامنے بلو تھری پیس سوٹ میں ایک خاصا ڈیشنگ بندہ کھڑا تھا اگر خرم اس وقت یہ گفتگو نہ کر رہا ہوتا تو وہ سب اسے اس طرح سکتے کی کیفیت میں کھڑے منہ دیکھ رہے ہوتے مگر ابھی جو کچھ خرم نے کہا اسے سننے کے بعد وہ سب ایسے دم بخود تھے جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"کیا یہ آپ میں سے کسی کی بالی ہے۔" اس نے ایک چھوٹی سی خوب صورت سی بالی اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ان کے آگے پھیلا دی۔

ان چاروں نے ایک ساتھ سنبل کی جانب دیکھا جو ہونق بنی بیٹھی تھی اس کے اسٹیپ کٹ میں تراشے ہوئے بال اس کی شانوں پر کچھ اس طرح پڑے تھے کہ اس کے دونوں کان اس میں چھپ گئے تھے لہٰذا وہ چاروں کوئی نتیجہ اخذ نہ کرسکے اور سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"یہ۔ یہ میری نہیں ہے تم سب لوگ مجھے کیوں دیکھ رہے ہو۔" سنبل ایک دم گڑبڑاتے ہوئے بولی تو الیان نے ایسے سر کو جھٹکا جیسے خود کو سرزنش کر رہا ہو اور بڑے مودبانہ انداز میں کہنے لگا۔

"تو مسٹر تھینک یو سوچ یہ ان میں سے کسی کی نہیں ہے۔" الیان کی بات پر وہ کچھ دیر تو کھڑا رہا پھر جانے کے لیے پلٹ گیا مگر ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ پھر واپس آگیا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ آپ کی بالی نہیں ہے ذرا چیک کرلیں۔" وہ سنبل سے مخاطب ہو کر کہنے لگا باقی سب حیرانی سے اسے اور سنبل کو دیکھنے لگے جبکہ سنبل کچھ بگڑ کر کہنے لگی۔

"چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے کیا میں اپنی جیولری نہیں پہچان سکتی۔" سنبل کے تیز لہجے میں کہنے کی دیر تھی کہ الیان بھی سختی سے بول پڑا۔

"مسٹر اب آپ چلتے پھرتے نظر آئیں تو بہتر ہوگا۔"

"ایک منٹ۔" رومیلہ نے الیان کو مزید بھڑکنے سے روکتے ہوئے سنبل کو بغور دیکھا۔ "مجھے بھی یہی لگ رہا ہے کہ یہ تمہاری بالی ہے ایسے بال ہٹا کر چیک تو کرلو۔"

"رومیلہ الس انف" خرم نے دبی زبان سے سختی کے ساتھ کہا' وہ سمجھ رہا تھا کہ رومیلہ مذاق کر رہی ہے مگر اس طرح ایک اجنبی کے سامنے سنبل کو چھیڑنا اسے بالکل مناسب نہیں لگا۔

"یہ تم سنبل کو سمجھاؤ کہ الس انف ایک معمولی سے مذاق کی وجہ سے یہ اپنی گولڈ کی بالی لینے سے انکار کر رہی ہے۔" رومیلہ نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بالکل اچانک سنبل کے بال ایک کان سے ہٹائے تو اس کا وہ کان خالی تھا اور اس سے پہلے کہ وہ دوسری طرف کے بال کھینچتی سنبل نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لیا اور بوکھلا کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ رومیلہ میں سچ کہہ رہی ہوں یہ میرا ہیرو نہیں ہے۔"

"واٹ۔" اس لو وارد کے منہ سے حیرانی کے مارے خاصی زوردار آواز میں نکلا تو سنبل تو کیا وہ سب ہی سٹپٹا گئے۔

"میرا۔ میرا مطلب ہے۔ یہ۔ یہ میری بالی نہیں ہے۔" سنبل تختی سے کان پر ہاتھ رکھے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

رومیلہ کچھ دیر اس کی شکل دیکھتی رہی پھر خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"میرے خیال سے آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔" ان سب ہی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ آخر سنبل کو ہی کہنا پڑا وہ کچھ دیر سنبل کو دیکھتا رہا پھر کندھے اچکاتا واپس پلٹ گیا اس کے جانے کے بعد خرم نے بڑی سنجیدگی سے سنبل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا حماقت تھی تم اتنا انڈر پریشر کیوں آگئیں۔ میں مذاق کر رہا تھا تم نے سچ مچ اپنی بالی لینے سے انکار کردیا۔" سنبل اس کے یقین سے کہنے پر اسے جھٹلانے کے لیے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ثمل بول پڑی۔

"جتنے یقین سے اس نے سنبل کو بالی چیک کرنے کا مشورہ دیا تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سنبل کے کان میں اس کی دوسری بالی دیکھ چکا ہے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ اس کی یہ دوسری بالی اسے واپس کردے گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" سنبل تپ گئی۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ مت تنگ کرواسے 'پہلے وہ خرم بضد تھا کہ اسے ہیرو ملنے والا ہے۔ یہ بے چاری اتنا گھبرا گئی کہ اس کے سامنے ہی بول پڑی اب تم بضد ہو کہ وہ دوبارہ ملے گا اور اس کی بالی ضرور لوٹائے گا کیا تم دونوں بھی ندیبہ کی طرح جنوبی جیسے ہونے لگے ہو۔" سنبل کو جھنجلاتا دیکھ کر الیان نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے ہو بھی سکتا ہے۔ یہ دونوں ندیبہ کے کمرے میں رہتے ہیں' کہیں شائستہ خالہ انہیں بھی تو نظر نہیں آنے لگیں۔" رومیلہ نے پراسرار سے انداز میں کہا سنبل بے اختیار کان سے ہاتھ ہٹا کر اچنبھے سے بولی۔

"کیا واقعی؟" اس کے نہایت خوف زدہ انداز میں پوچھے گئے پوچھا سوال پر خرم اور ثمل کے چہروں پر مسکراہٹ ابھر آئی تو وہ سوالیہ انداز میں الیان اور رومیلہ کو دیکھنے لگی مگر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دونوں بھی چونکنے کی بجائے مسکرانے لگے تھے۔

"یہ آپ سب مسکرا کیوں رہے ہیں شائستہ خالہ کی روح تو تھی ہی نہیں پھر تم دونوں کو کیسے نظر آنے لگی۔" وہ واقعی الجھ گئی تھی مگر اس کی بات کے جواب میں وہ چاروں ہنس پڑے اور ہنستے چلے گئے۔

سنبل کچھ دیر تو ہونق بنی انہیں دیکھتی رہی پھر جیسے سارا ماجرا ایکدم اس کی سمجھ میں آگیا اس کے کان پر سے ہاتھ ہٹاتے ہی اس کے بال کندھے سے پیچھے چلے گئے تھے اور اس کی وہ بالی جس میں چھوٹے چھوٹے سفید نگ خوب صورتی سے لگے ہوئے تھے دور سے ہی چمک رہے تھے اور بالی کو نمایاں کر رہے تھے۔

سنبل کھسیانے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی تو بے اختیار اس کی نظر دور ایک ٹیبل پر اس شخص پر پڑ گئی جو اس کی دوسری بالی لے کر آیا تھا۔ وہ ٹیبل پر اکیلا بیٹھا تھا شاید آفس سے اٹھ کر یہاں لنچ کے لیے آیا تھا کم از کم حلیے سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا اور وہ دور بیٹھا سنبل کو ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اس کے کان میں چمکتی بالی اسے وہاں سے بھی نظر آرہی ہو۔

سنبل کا دل چاہا ٹیبل پر رکھے سارے چمچے کانٹے اور چھریاں اس کے منہ پر کھینچ ماریں مگر خود پر ضبط کیے وہ زبردستی ان لوگوں کے ساتھ مسکرانے لگی۔ الیان تو پھر بھی ہنس کر اب خاموش ہوگیا تھا۔ خرم بھی اب صرف مسکرانے پر اکتفا کر رہا تھا بس ثمل اور رومیلہ سے ہی ہنسی کسی طور پر نہیں رک رہی تھی وہ ایک دوسرے کو دیکھتیں اور ان کی قابو میں آئی ہنسی پھر ابل پڑتی۔

زندگی کسی بوجھ اور تفکرات سے آزاد ہو محبت اور اپنوں کا ساتھ ہو تو خوشی ایسے ہی کھلکھلاتی ہے اور فضا ایسے ہی مسکراتی ہے۔

www.paksociety.com

ناولٹ

سمیرا گل

سچی گواہی

ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال آئی تھی۔

"مجھے تمہارے لیے جھوٹی گواہی دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمہارے گھر کے تمام ملازم تمہارے گناہ کے گواہ ہیں اور جانتی ہو میں بھی گیارہ برس تڑپا ہوں اپنی بچی کے لیے۔ اب تمہاری باری ہے ہو سکتا ہے حکومت تمہارے اچھے برتاؤ اور حسن سلوک کی وجہ سے باقی کے تین سال کی سزا معاف کر دے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی بچی کو آ کر لے جانا۔" فون بند کرنے کے بعد وہ پرسکون سا اپنے اپارٹمنٹ کی سمت چل پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح کے انتظار میں تمام رات آنکھوں میں کٹ چکی تھی مؤذن کی پہلی صدا کے ساتھ یوں لگا جیسے صدیوں بعد دن نکل آیا ہو۔ وہ اٹھ کر واش روم میں چلی آئی تھی وضو کرنے کے بعد نماز ادا کی اور پھر سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی غور سے اپنا عکس دیکھا۔

وہاں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی کالی آنکھیں، گوری رنگت، شنگرفی ہونٹ اور بھرا بھرا گداز سراپا۔ لیکن ہر نقش میں جیسے برسوں کی تھکن تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی وہ ادھ کھلی لپ اسٹک آج سالوں بعد اس نے اپنے لبوں پر سجائی تھی آنکھوں سے روٹھے کاجل کو منانا ابھی باقی تھا پھر اس نے وہی لباس زیب تن کیا تھا جو قربت کے آخری لمحوں میں اس کے وجود سے منسلک تھا۔

"مما۔" بچی کی آواز پر وہ پلٹی جو لحاف سے جھانکتی منندی منندی آنکھوں میں اشتیاق کے رنگ اوڑھے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آج کوئی خاص دن ہے؟"

"بہت خاص ہے۔" وہ دھیما سا مسکرائی عینی کو اس کے لبوں پر بکھرتا یہ دلکش نوخیز تبسم بے حد بھلا لگا تھا جس نے اس کے چہرے پر اک الوہی سی چمک بکھیر دی تھی۔

"اس لیے آپ نے لپ اسٹک لگائی ہے۔" اس کی حیرت دیدنی تھی اور بجا بھی کیونکہ اس نے آج تک اپنی مما کو خاص تہواروں پر بھی سنگھار کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ قید میں وہ تھا لیکن گیارہ برس کی سزا اس نے بھی تو برابر کاٹی تھی۔

"آج تمہارے پاپا آ رہے ہیں۔" چوٹی کو آخری بل دینے کے بعد بینڈ میں جکڑتے ہوئے اس نے عینی کو گدگدایا تو وہ جوش سے اٹھ بیٹھی۔

"سچ مما۔" اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے تصدیق چاہی تو الوینہ نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر کسی مانوس سی آہٹ کا احساس پا کر وہ عجلت میں زینہ اتری مین ڈور تک آئی تھی۔ بہروز ملک کا ہاتھ گھنٹی پر تھا جب اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئی تھیں اور پھر جیسے دلوں کی دھڑکنیں رک گئی تھیں لمحے ساکت ہو چکے تھے لیکن وقت گزر رہا تھا الوینہ کی نظر اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی ہاتھوں پر ٹھہری تھی جس میں اس نے سرخ پھولوں کا تر و تازہ گلدستہ تھام رکھا تھا۔ حالانکہ اوائل عمری کی وہ خواہشیں امنگیں اور خواب تو ماضی کا حصہ بن چکے تھے لیکن اس نے یاد رکھا تھا۔

"سوری میں یہ پھول تمہارے اٹھنے سے قبل تمہارے سرہانے رکھنا چاہتا تھا لیکن آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔" بھیگے نمناک لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بہروز ملک نے محبت کا والہانہ اظہار بڑے خوب صورت لفظوں میں کیا تھا۔

"لو یو فار ایور۔"

"ایک معصوم بے ضرر سی خواہش کو پورا کرنے میں اتنا وقت لگا دیا۔" وہ ایک قدم کا فاصلہ سمیٹ کر اس کے سینے سے آن لگی تھی بہروز ملک نے تمام تر استحقاق کے ساتھ اپنے مضبوط حصار میں اس کے نازک کومل گداز وجود کو سمو لیا تھا۔

"تقدیر نا مہربان ہو تو وقت پر زور نہیں چلتا۔" عین اس لمحے ایک گڑیا سی بچی دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے آئی تھی۔

"یہ عینی ہے تمہاری بیٹی۔" الوینہ کے تعارف پر وہ

تیزی سے اس کی جانب بڑھا تھا۔

"میری بچی میری عینی۔" اس کے چہرے اور ہاتھوں کو بے تحاشا چومتے ہوئے اس کی نگاہ سامنے رکھے تخت سے ٹکرائی تو بے ساختہ سسک اٹھا۔ وہ تخت آج خالی تھا۔ اس کے لیے دعائیں کرنے والی ماں چھ برس قبل ہی منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔

"اپنے دشمنوں کو میں کبھی معاف نہیں کروں گا جنہوں نے مسجد میں قرآن اٹھا کر اپنی وفاداری کی قسمیں کھائی تھیں اور پھر عدالت میں جھوٹی گواہی دی جاتی ہو میں اس جرم کی سزا کاٹ کر آیا ہوں جو بھی میں نے کیا ہی نہیں تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکی

"جیل جانے سے قبل ان دونوں کمینوں نے مجھے ساری حقیقت بتادی تھی۔" اس کا اشارہ زیان حیدر اور شیراز احمد کی جانب تھا۔

"کیسی حقیقت؟" الوینہ کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس حقیقت کی بات کررہا تھا۔

"ان دونوں کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کے تیور خاصے خطرناک تھے۔

"زیان حیدر مرچکا ہے۔" اس انکشاف پر وہ پورے کا پورا الوینہ کی سمت گھوم گیا تھا۔

"مرچکا ہے کیسے؟" بہروز کے ابرو تن گئے۔

"روڈ ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" وہ ناگواری سے بولی۔

"ہاں مگر وہ شیراز تو زندہ ہے اور اس کی بیوی بھی۔"

"بہروز پلیز بھول جاؤ جو ہوا اتنے سالوں بعد لوٹ کر آئے ہو اب میں مزید ایک پل بھی تمہارے بغیر نہیں رہ پاؤں گی ہجر کو میرا مقدر مت بناؤ۔" وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"اچھا جناب ناشتا کروانے کا موڈ نہیں ہے۔" اس کے چہرے کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھ کر اس نے موضوع بدل دیا تھا الوینہ نے اطمینان کا سانس لیا اور ناشتے کی تیاریوں میں مشغول ہوگئی۔

عینی نے آج اسکول کی چھٹی کرلی تھی شام میں تینوں باہر آؤٹنگ کے لیے نکلے تھے۔ جب اس نے ان دونوں کو اپنی خوب صورت سی بچی کے ساتھ شاپنگ سینٹر کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ بس ان کو خوش، مطمئن اور آسودہ حال دیکھ کر اس کی رگ رگ میں چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"الوینہ اپنا سامان پیک کرلو۔" اگلا دن گھر سے باہر گزارنے کے بعد شام میں گھر داخل ہوتے ہی اس نے جیسے آرڈر جاری کیا تھا۔

"ہم کہیں جارہے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ بات سمیٹ کر الماری سے اپنے سوٹ نکالنے لگا تھا۔

"بہروز تم کیا کررہے ہو؟" وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

"پلیز اس وقت کوئی سوال وجواب نہ کرو۔" ایک نظر اس کے تفتیشی انداز کو دیکھنے کے بعد وہ دو ٹوک اور قطعی لہجے میں بولا تھا الوینہ سے پھر کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی انہیں محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد اب اس کا اگلا ٹارگٹ شہزاد احمد کی بیٹی تھی۔ زینی جسے اسکول واپسی پر اسے اغوا کرنا تھا۔

وہ چھٹی سے پندرہ منٹ قبل ہی اپنی گاڑی راستے میں ایک جانب کھڑی کرکے بیٹھ گیا اس روڈ سے گزرتے ہوئے ڈرائیور گاڑی سے اتر کر آئس کریم پارلر سے زینی کو آئس کریم لاکر دیتا تھا گاڑی اور پارلر میں صرف بارہ فٹ چوڑی سڑک کا فاصلہ تھا۔

ڈرائیور کے گاڑی سے اتر کر پارلر جانے اور واپس آنے میں صرف چھ منٹ لگتے تھے۔ اور اسے تین منٹ میں بچی کو بی ایم ڈبلیو سے اپنی سیاہ لینڈ کروزر میں منتقل کرنا تھا۔ روڈ زیادہ پر ہجوم نہیں تھا لیکن یہ کام کافی رسکی تھا۔ پھر بھی اسے ہر صورت کرنا تھا جو کہ اسے کرنے میں کامیابی مل چکی تھی۔

"یہ کس کی بچی ہے؟" اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی الوینہ نے اس کے بازوؤں میں بے ہوش خوب صورت گول مٹول سی چار سالہ بچی کو جھولتے دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا تھا۔ وہ بچی کو بستر پر لٹانے کے بعد اس

کی سمت مڑا۔

"اس کا خیال رکھنا باقی باتیں پھر بتاؤں گا اور ہاں دروازہ اچھی طرح سے لاکڈ کرلو۔" اسے ہدایت دینے کے بعد وہ خود دوسرے علاقے میں چلا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج ان کی میرج اینورسری تھی جس کی تیاریوں میں صبح سے مشغول تھی یہ دن وہ اور شیراز مل کر منایا کرتے تھے شیراز کو مہمانوں کا ہجوم پسند نہیں تھا۔

کریم کیک بیک کرنے کے بعد وہ اس پر پائن ایپل کاٹ کر لگارہی تھی۔ جب حواس باختہ سا ڈرائیور لاؤنج میں داخل ہوا۔

"بیگم صاحب۔" اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں جیسے کہیں دور سے بھاگتے ہوئے آرہا ہو رنگ اڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیگم صاحبہ زینی کو کوئی لے گیا ہے۔" اسے اب احساس ہوا تھا کہ آج ڈرائیور کے عقب میں اچھلتی کودتی زینی نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیا بکواس کررہے ہو کون لے گیا میری بچی کو۔" وہ حلق پھاڑ کر چلائی۔

"میں تو جی آئس کریم لینے گاڑی سے اترا تھا واپس آیا تو بے بی گاڑی میں نہیں تھی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"او میرے خدا۔" وہ سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے بھر گئے تھے زینی میں تو اس کی جان تھی شادی کے سات سال بعد بڑی منتوں مرادوں سے پایا تھا اسے۔ در در کی خاک چھان کر ایک پھول کھلا تھا وہ ذرا سا نظروں سے اوجھل کیا ہوتی نازنین کی جان پر بن آتی تھی اس کی معمولی سی تکلیف بھی اس کے دل پر قیامت بن کر گزرتی تھی۔

"کہاں جاسکتی ہے تم نے آس پاس چیک کیا تھا۔"

"جی بیگم صاحب۔" وہ مایوسی سے بولا۔

"ہمارا تو اب کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے شیراز کا نمبر ڈائل کیا تھا مگر دوسری جانب ریکارڈنگ چل رہی تھی۔

"مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا۔" پھر اس نے آفس کے نمبر پر کال کی۔ پتا چلا وہ تو گھنٹہ بھر قبل ہی آفس سے نکل چکا ہے۔ اگلے ہی پل اس نے گھر کے سارے ملازموں کو لائن میں کھڑا کرلیا تھا۔

"غلام احمد کے ساتھ جاؤ ہوسکتا ہے وہ گاڑی سے اتر کر کہیں چلی گئی ہو وہاں کی قریبی مساجد میں اعلان کراؤ آس پاس کے لوگوں سے پوچھو۔" سب کو روانہ کرنے کے بعد وہ خود نیم جان سی ہوکر رہ گئی تھی۔

"میری زینی کہاں چلی گئی ہو تم۔" بے بسی سے لب کچلتے ہوئے وہ مسلسل شیراز کا نمبر ڈائل کررہی تھی مگر اس نے بھی جانے کیوں سیل آف کررکھا تھا۔

"کس کو بتاؤں کیا کروں۔" وہ بے چینی سے لاؤنج میں ٹہلنے لگی۔ تین گھنٹوں کی خواری کے بعد سب ملازم ناکام ہوکر لوٹ آئے تھے۔ جس پر اس کے رہے سہے اعصاب بھی جواب دے گئے تھے۔

باہر آنگن میں شام اتر رہی تھی شیراز کا نمبر ہنوز بند تھا شاید اس کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی تھی یا پھر ہمیشہ کی طرح آج بھی کوئی سرپرائز دینے کے چکروں میں تھا۔ رو رو کر اس کا برا حال ہوگیا وہ پولیس اسٹیشن جانے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی جب پی ٹی سی ایل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔" بھیگا لہجہ، بہروز ملک کے اندر تک ٹھنڈک اتار گیا تھا۔

"بڑی پریشان ہو زینی ابھی تک گھر نہیں آئی۔" مصنوعی تاسف کا اظہار کیا گیا۔

"کون ہو تم۔" اس کی نم ہوتی ہتھیلیوں میں ریسیور لرز کر رہ گیا تھا۔

"بہروز ملک۔" وہ اس کی حالت پر محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا جبکہ اس تعارف پر خوف کی شدید لہر نازنین کی پسلیوں میں سرایت کرگئی تھی۔

"میری بچی۔" آگے اس کا گلا رندھ سا گیا تھا۔

"میرے پاس ہے۔" اس نے جملہ مکمل کردیا۔

"دیکھو ہماری ساری دولت لے لو لیکن پلیز مجھے میری بیٹی لوٹا دو۔" وہ گڑگڑائی۔

"تمہاری دولت۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"ہم سب کچھ واپس کرنے کو تیار ہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"مجھے دولت نہیں چند سوالوں کا جواب چاہیے۔"

"میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں۔" اس نے تھوک نگلا۔

"وہ قتل کس نے کیا تھا" دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی پھر وہ تمام ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

"شیراز نے۔"

"ذیان حیدر کیسے مرا؟" سپاٹ لہجہ تھا۔

"اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"

"اور وہ ایکسیڈنٹ کس نے کروایا تھا؟" اس کا ایسا سوال نازنین کی توقع کے بالکل برعکس تھا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جواب دینے پر مجبور تھی۔

"شیراز نے۔" اس نے دوسری بار بھی اپنے شوہر کا نام لیا۔

"تم شیراز اور زیبی میں سے کس کو زیادہ چاہتی ہو۔" وہ بے رحمی سے بولا۔

یہ کیسا سوال ہے۔" اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"سوال نہیں بس جواب۔" وہ درشتی سے بولا تو نازنین نے دونوں آنکھیں میچ لیں آنسو قطار کی صورت گرنے لگے تھے۔

"زیبی کو۔"

"اپنی بیٹی واپس چاہیے۔" اس نے جیسے آفر کی تھی۔

"ہاں۔" نازنین نے کسی سوال کا جواب اس سے زیادہ جلدی نہیں دیا تھا۔ وہ مسکرا کر پھر بولا۔

"تاوان دینا پڑے گا۔"

"کیسا تاوان؟" اس کا دم گھٹنے لگا۔

"تاوان میں تمہیں اپنے شوہر کو قتل کرنا ہو گا۔" اس نے اپنی شرط بتادی تھی۔

"نہیں۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوچ لو شوہر یا بیٹی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ ایک لمحے کے توقف سے مزید گویا ہوا۔

"تمہارے پاس صرف ایک گھنٹے کا ٹائم ہے اگر اس گھنٹے میں تم نے شیراز کو قتل نہ کیا تو اگلے گھنٹے میں تمہیں تمہاری بیٹی کے ٹکڑے بوری میں ڈال کر پارسل کردیے جائیں گے۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ چیخ اٹھی۔

"میں ایسا کرسکتا ہوں گیارہ سال تمہاری مہربانی کی وجہ سے عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر آرہا ہوں اور اب مجھ میں انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی بہتر ہو گا کہ تم میری درندگی اور حیوانیت کا مظاہرہ نہ ہی دیکھو۔ یاد رکھنا بس ایک گھنٹہ۔"

"ایک گھنٹہ۔" ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

"یار اس بار بس جیت جانا اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا ہے۔ تم ہارے تو میں دیوالیہ ہو جاؤں گا۔" بہروز ملک کے ڈیرے پر آج صبح سے خوب ہاہاکار مچی ہوئی تھی لاہور کلب میں ہونے والی گولڈن کپ ہارس ریس کا وہ سابقہ تین سالہ چیمپئن تھا۔

میر بخت نے اس کی کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا سارا پیسہ جوئے میں لگادیا تھا۔ اس وجہ سے پرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ فکر مند سا بھی تھا۔

"تو تو فکر نہ کر تیرے یار نے ہارنا سیکھا ہی نہیں۔" سفید کڑکڑاتے لٹھے کے سوٹ کی نادیدہ شکنیں درست کرتا وہ اجرک شانے پر رکھ کر اصطبل میں چلا آیا تھا۔

"سرکار جیپ تیار ہے۔" کریم بخش کی اطلاع پر وہ میر بخت کو اشارہ کرتا باہر چلا آیا تھا ملازموں نے گھوڑے کو ٹرک میں سوار کیا اور اگلے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر وہ لاہور کلب کے ریسنگ ٹریک پر کھڑے تھے۔

زیان حیدر کو اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلا کر سلام کیا

تھا ریس شروع ہونے میں بس پانچ منٹ باقی تھے۔

☼ ☼ ☼

"الوینہ کہاں گھس کر بیٹھی ہو تم۔" ضوبا دور سے ہی چلاتے ہوئے آرہی تھی الوینہ اس کی آواز پر سر تاپا چادر تانے سوتی بن گئی لیکن ضوبا نے بھی لحاظ کیے بغیر ایک جھٹکے سے چادر کھینچی تھی۔

"کیا تکلیف ہے۔" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"ریس شروع ہونے میں اونلی فائیو منٹس ہیں چلو اٹھو۔" وہ اس کے موڈ کی پروا کیے بغیر اشتیاق سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے فضول چیزیں دیکھنے کا۔" وہ ہنوز خفا تھی۔

"تم بھائی کو فضول کہہ رہی ہو۔" ضوبا نے آنکھیں دکھائیں۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا بھائی مجھ سے تو اچھا وہ سلطان ہے جس کے ساتھ ہر وقت چپکا رہتا ہے۔" وہ خوب جلی بیٹھی تھی۔

"میری جان تمہیں اعتراض کس بات پر ہے سلطان کے تم سے زیادہ سندر ہونے پر یا پھر بھائی کے اس کے ساتھ ہونے پر۔" دونوں کشن گود میں رکھے وہ اس کے پہلو میں دھنستے ہوئے معنی خیزی سے بولی تھی۔

"جاؤ اچھا جا۔" وہ دوبارہ چادر میں غروب ہو گئی۔

"ناولوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔" اسے بہروز ملک کی بے رخی سنگدلی اور بے مروتی پر جی بھر کر رونا آرہا تھا سوچا تھا منگنی کے بعد زندگی میں کوئی رومانس آئے گا لیکن وہ تو پہلے سے زیادہ کٹھور ہوچکا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی اس نے کتنے چاؤ سے اس کے لیے کھیر بنائی تھی۔ ظالم نے وہ سنائیں کہ کل سے اب تک کمرہ بند کیے پڑی تھی۔

"ناولوں کی ہیروئنیں بھی تو تمہاری طرح "بے وقوف" نہیں ہوتیں۔"

ضوبا نے دماغ کی ڈکشنری کھنگالتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ مناسب سا لفظ تلاش کیا تھا اس پر بھی اس کے ابرو تن گئے تھے۔

"کس نے کہا تھا کھیر میں چینی کی جگہ نمک ملادو۔" اس نے بھی آنکھیں دکھائیں۔

"ہاں تو بندے سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"غلطی وہ جو ایک بار کی جائے لیکن تمہاری تو فطرت بن چکی ہے یاد کرو تم نے ان کے براؤن شوز پر بلیک پالش کردی تھی۔"

"تو اس بار جلدی میں ایسا ہو گیا تھا۔" الوینہ نے جھٹ سے لقمہ دیا۔

"ڈیزائنر شدہ سوٹ تم نے تہہ لگادیے تھے۔"

"ہمیشہ اماں سے ڈانٹ پڑتی تھی کہ کپڑے تہہ لگا کر رکھا کرو بس۔"

"اور کمپیوٹر کی بورڈ خوب نچوڑتے ہوئے جھاڑن سے صاف کیا تھا۔" ضوبا نے اور یاد دلایا۔

"دھول مٹی بھی تو کچھ کم نہیں تھی۔" جواز حاضر تھا ضوبا کا منہ پھر کھلا تھا جس پر وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے نہیں بنا جاتا سگھڑ سلیقہ مند اصغری ٹائپ۔"

"تو اکٹنگ بھی نہ کیا کرو اصغری ٹائپ کی۔" ضوبا نے اس کی نقل اتاری مگر وہ بیٹھے بیٹھے خوابوں کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

"کتنا دل چاہتا ہے میرا کہ وہ روز صبح عالی کی طرح میرے لیے پھول لایا کرے عمر جہانگیر کی طرح میری ہر غلطی کو نظر انداز کرتے ہوئے خوب سارا خیال رکھے اور عالم شاہ کی طرح مجھ پر حق جتائے۔"

"کوئی ناول اسے بھی پڑھنے کو دے دو شاید کچھ افاقہ ہو جائے۔" ضوبا مشورہ دینے پر مجبور تھی۔

"وہ اگر کوئی کتاب پڑھے گا تو وہ بھی گھوڑوں سے متعلق ہو گی۔" وہ جل کر بولی تو ضوبا سر پر ہاتھ مارتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہائے میری گھوڑا ریس۔"

☼ ☼ ☼

اپنے لگژری اپارٹمنٹ میں بیٹھا وہ پچھلے دو گھنٹوں سے ڈرنک کر رہا تھا مگر لگتا تھا یا تو شراب میں کوئی نشہ نہیں تھا یا پھر اس کے اعصاب ہی اس قدر مضبوط تھے جو وہ اپنے مکمل حواس سمیت اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ نیچے پارکنگ لاٹ میں شیراز احمد کی کرولا کھڑی دیکھ کر اس کی پیشانی سلوٹوں سے اٹ گئی تھی۔ وہ ابھی اس وقت مزید کسی ہنگامے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ تن فن کرتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"ہمیشہ میں جب بھی تمہارے ساتھ کوئی بزنس کرتا ہوں منہ کے بل گرتا ہوں جانتے ہو تمہاری اس ہار نے میرے لاکھوں ڈبو دیے ہیں میں صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ آج سے تمہارے اور میرے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔" وہ بہت اکڑا ہوا تھا۔

"اس بار ڈیل نہیں پلاننگ ہوگی وہ بھی لاکھوں کی نہیں کروڑوں کی۔" راکنگ چیئر کو ٹھوکر رسید کرتا وہ دونوں مٹھیاں بھینچے سرخ آنکھوں سے گھورتا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"منظور ہو تو کہو۔" اور کروڑوں کے نام پر تو وہ جان بھی دے سکتا تھا کسی کا گلا بھی کاٹ سکتا تھا لیکن نازو کے ذکر پر وہ دھیما پڑ گیا۔

"پوری آئٹم ہے تمہاری گرل فرینڈ اسے یوز کیوں نہیں کرتے۔"

"تم اپنی بیوی کو استعمال کر سکتے ہو۔" اس نے سرد و سپاٹ لہجے میں الٹا سوال پوچھا تھا اسے لگا تھا زیان حیدر اس بات پر خوب بھڑکے گا اسے گالیاں دے گا مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی کمینہ تھا۔

"ہاں اگر وہ نازو کی طرح حسین ہوتی تو۔" اس جواب نے اسے بھی اندر تک شانت کر ڈالا تھا اور پھر اس کی ساری مزاحمت بے کار گئی تھی اس کے علاوہ بہروز ملک جیسے زاہد خشک پر اسے قوی اعتماد تھا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ کو چھوئے گا بھی نہیں۔

"چلو۔" اچانک ہی وہ اپنا کوٹ پہنتے ہوئے اچھے بالوں کو انگلیوں سے کنگھی کرتا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ کوئی سوال کیے بغیر اس کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھا۔

"میں نے اسے کہا بھی تھا کہ ریس ہار جاؤ تو تمہیں مالا مال کر دوں گا لیکن وہ بھی ایک نمبر کا کمینہ ہے۔" اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے سارا غصہ سگنل توڑنے پر نکالا تھا۔

"تم نے یہ آفر خود دی ہے۔" شیراز احمد نے آنکھیں پھیلائیں۔

"بے وقوف سمجھا ہے کیا۔" یوٹرن لیتے ہوئے اس نے شیراز کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔ ٹریفک سارجنٹ موٹر سائیکل پر پیچھے آ رہا تھا لیکن وہ اسے چکما دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"یہ جس آدمی سے میں جوا ہارا ہوں نا وہ دوست تھا اس کا۔" شیراز احمد نے کچھ سلگتے ہوئے اس کے رشوت نہ لینے کا جواز بھی دیا تھا۔ زیان حیدر دل کھول کر ہنسا۔

"تو اس کا مطلب ہے دشمن ایک ہی ہے ہمارا۔"

"ہاں لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟" گاڑی عجیب گزرگاہوں سے ہوتے سویٹ بیکرز کے سامنے آن رکی تھی شیراز احمد کو حیرت نے گھیرا۔

"رقیب یار کی جیت کا جشن منانے۔" وہ کہہ کر گاڑی سے اتر گیا دس منٹ بعد اس کی واپسی مٹھائی کے ٹوکرے اور پھولوں کے ہار کے ساتھ ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہروز ملک کے ڈیرے پر اس وقت جشن کا سماں تھا آتش بازی' فائرنگ' ڈھول دھماکے' مٹھائیاں وہ لوگ دل کھول کر خوشی منا رہے تھے۔

سلطان پھولوں اور نوٹوں کے ہار پہنے اپنی فتح پر مغرور سا گردن اکڑائے کھڑا تھا۔

میر بخت کیمرہ گلے میں لٹکائے سب کی تصویریں بنا رہا تھا جب زیان حیدر کو اپنے دوست شیراز احمد کے ساتھ آتے دیکھ کر دونوں استقبال کو آگے بڑھے۔

"اتنی دیر لگا دی۔" بہروز ملک زیان حیدر کے گلے

ملتے ہی شکوہ کناں لہجے میں بولا تو اس نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

"اپنی ہار کا ماتم کرنے کے بعد ہی تیری جیت کا جشن منانا تھا نا اب اتنا تو حق بنتا تھا۔"

"ارے تو میرا جگر ہے ٹرافی چاہیے تو لے لو لیکن ریس نہیں ہاروں گا۔" بہروز ملک نے قہقہہ بکھیرتے ہوئے ٹرافی اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ اس کا بچپن کا یار تھا لیکن اس ریس کے چکر نے زیان حیدر کے دل میں رقابت کی لکیر کھینچ دی تھی۔

"یہ ٹرافی تو میں بھی جیت کر حاصل کروں گا۔" وہ بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔

"پھر اس ریس کا ویٹ کرو جس میں بہروز شامل نہ ہو کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے تو تم نمبر دو ہی رہو گے۔" میر بخت نے مٹھائی کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے خوب مزے سے کہا جس پر اس کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ مگر وہ اس وقت اپنے اندرونی خلفشار کو قابو میں رکھے مٹھائی کھانے پر مجبور تھا۔

"پلاٹس کا کیا ہوا؟" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بہروز نے بزنس کی بات کی تھی سستے داموں پلاٹ خرید کر سال دو سال کے بعد مہنگے داموں فروخت کرنا ان کا من پسند مشغلہ تھا اور منافع بخش بھی۔

زیان حیدر اس کا بزنس پارٹنر تھا وہ دونوں ففٹی ففٹی کے مالک تھے لیکن ففٹی میں سے دونوں نے شیراز احمد اور میر بخت کو پچیس فیصد کا حصہ دار بھی بنا رکھا تھا۔

"بس ایک دو دن میں رجسٹری ہم دونوں کے نام ہو جائے گی۔"

☆ ☆ ☆

ڈرامہ ختم ہونے کے بعد ضوبیا کو الوینہ کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کچن کے دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔

سامنے ہی وہ آٹے کی پرات میں جی بھر پانی ڈالے ملیدے کے ساتھ نبرد آزما تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" ضوبیا نے آنکھیں پھیلائیں۔

"خالہ آٹا گوندھنے لگی تھیں میں نے کہا لائیں میں گوندھ دیتی ہوں پہلے تو انہوں نے خوب گھور کر غیر یقینی نظروں سے مجھے دیکھا پھر میری ذہنی کیفیت کا قدرے اطمینان کرنے کے بعد فون سننے۔"

"اور تم نے یہ آٹا گوندھا ہے یا جنڈریوں کو چپکانے کے لیے لئی تیار کی ہے۔" ضوبیا نے اس کی بات کاٹ کر گھلے ہوئے آمیزے میں انگلی ڈال کر اٹھائی تو قطرہ قطرہ ٹپکنے لگا تھا۔

"ضوبیا پلیز کچھ کرو۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولی جبکہ نظریں راہداری سے ہوتے ہوئے لاؤنج میں لگی تھیں جہاں سے خالہ کے آنے کا امکان قریب ترین تھا۔

"وہ تو میں کر ہی دوں گی لیکن پلیز آئندہ ایسی خدمت کا جوش چڑھا تو دل مسوس کر رکھنا یہ سگھڑاپا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔" ضوبیا اچھی خاصی جزبز ہوئی تھی۔

"کروں گی تو کچھ کرنا آئے گا نا ویسے بھی ابھی تو اسکول و کالج سے فارغ ہوئی ہوں اور یہ شوشا بھی تمہارے کمینے بھائی کا چھوڑا ہوا ہے۔" کچھ روز قبل جب کھانے کی ٹیبل پر برتن لگاتے ہوئے اچانک الوینہ کے ہاتھوں سے پلیٹ گر گئی تھی۔ (ایک تو اس کے سامنے حواس باختہ ہونا یقینی تھا) تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے سگھڑ سلیقہ مند اور خوش اطوار لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" وہ بات تو خالہ سے کر رہا تھا لیکن اسے سنا رہا تھا۔ اور اسی دن سے اس نے بھی سگھڑ بی بی بننے پر کمر کس لی تھی۔ لیکن وہ جس کام کو جتنا بھی سیدھا کرنے کی کوشش کرتی تھی اتنا ہی بیڑا غرق ہو جاتا تھا۔

"اور میرا بھائی پسند کس کی ہے؟" آٹے کو اس کی اصل صورت عطا کرتے ہوئے ضوبیا نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو رومینٹک سلمان خان سمجھ کر ہاں کی تھی اب مجھے کیا خبر کہ وہ اندر سے پنجابی ہیرو شان نکلے

کا مجل ہے جو بھی لفٹ کروا دے۔ سو انگیجمنٹ میں اس کی رضامندی تو شامل تھی نا۔" غیر سنجیدگی سے کہتے ہوئے آخر میں اسے نئی سوجھی تھی۔

"اب دل کے معاملوں کی مجھے کیا خبر خود ہی دریافت کر لینا۔" اس نے بھی مزید چڑاتے ہوئے شانے اچکا دیئے۔

"الوینہ تمہاری امی کا فون ہے بات کر لو جا کر۔" خالہ کی اطلاع پر وہ کچن سے نکل کر فون اسٹینڈ کی سمت بڑھ گئی اس کے ابو کاروبار کے سلسلے میں دوبئی میں مقیم تھے تین ماہ قبل ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تب امی دوبئی جانے سے قبل اسے اسلام آباد سے لاہور خالہ کے گھر چھوڑ گئی تھیں۔

ضوبیا تو اکثر اپنی چھٹیاں اسلام آباد میں اس کے ساتھ گزارتی تھی اس لیے دونوں میں خوب دوستی تھی ٹیلی فونک رابطہ بھی ہمیشہ سے ہی دونوں کے مابین رہا تھا لیکن بہروز کے ساتھ بات کبھی حال احوال سے آگے نہیں بڑھتی تھی چار ماہ قبل دونوں کی منگنی خالص ضوبیا اور الوینہ کی پسند سے ہوئی تھی جس پر بہروز نے مشرقی لڑکیوں کی طرح خاموشی سے سر جھکا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حویلی سے نکل کر اس کا رخ ڈیرے کی جانب تھا جب راستے میں زبان حیدر مل گیا تو دونوں لنچ کے خیال سے ریسٹورنٹ چلے آئے تھے۔

سامنے ٹیبل پر بیٹھی ایک حسین الٹرا ماڈرن لڑکی مسلسل اسے گھورے جا رہی تھی جسے وہ اپنا وہم گردانتے ہوئے سر جھٹک کر آرڈر نوٹ کروانے لگا۔ لیکن کھانے کے دوران جب بھی اس کی نظر اٹھی اس نے اسے اپنی جانب متوجہ پایا' لیکن ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے زبان کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گیا۔

"ایکسکیوزمی۔" مترنم نسوانی آواز پر اس نے سر اٹھایا تو وہ اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ہائے آئی ایم نازلی۔"

"فرمایئے۔" اس نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"آپ بہروز ملک ہی ہیں نا۔" اب کی بار چہرے پہ دلکش تبسم بکھیرتے ہوئے جیسے تصدیق چاہی تھی ساتھ ہی ہاتھ ٹیبل پر رکھ دیا گیا۔ بہروز کو اس کا اپنی جانب یوں جھکنا قدرے ناگوار گزرا تھا۔

"مجھے آپ سے آٹو گراف چاہیے تھا۔" اب وہ بیگ سے نوٹ بک اور سنہری پین نکال رہی تھی۔

"آٹو گراف۔" بہروز ملک نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے معصومیت سے گردن ہلا دی۔

"محترمہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' میں کوئی اسٹار نہیں ہوں۔"

"جانتی ہوں کہ آپ اسٹار نہیں ہیں' لیکن میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں ہر سال آپ کی ریس بہت شوق سے دیکھنے آتی ہوں۔"

"اچھا۔" اب کی بار وہ دھیما سا مسکرایا۔

گھوڑوں کے ذکر پر اس کی دلچسپی عروج پر ہوتی تھی اور پھر اس لڑکی کے بہت اصرار پر اس نے آخر آٹو گراف دے ہی دیا تھا۔ کچھ روز گزرے اور جب وہ اس قصے کو فراموش کر بیٹھا تو وہ ایک بار پھر یوٹرن لیتے ہوئے اس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی تھیں لیکن پاؤں میں اچھا خاصا فریکچر ہو گیا تھا مجبوراً" بہروز کو اسے سہارا دے کر کلینک لے جانا پڑا تھا۔

"آئی ایم سوری میں بہت معذرت خواہ ہوں لیکن آپ کو کل تک ڈسچارج کر دیا جائے گا۔"

"اٹس اوکے۔" شدید تکلیف کے باوجود اس نے کچھ بھی سخت سست نہیں کہا تھا بلکہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔

"آپ کے گھر والوں کو انفارم کر دوں۔" اٹھنے سے قبل اسے خیال آیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس سیل فون ہے میں اطلاع دے دوں گی۔"

"اوکے تو میں چلتا ہوں۔" اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا جس پر وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"آپ کل مجھے دیکھنے آئیں گے۔"

"نہیں۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ کلینک سے باہر نکل آیا تو۔۔۔ وہ غصے میں کھولتے ہوئے کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بوریت ہے یار تم لوگ کہیں گھومنے نہیں جاتے۔" الوینہ نے ازحد بے زار ہوتے ہوئے صوفے پر اونگھتی ضوبیا کی جانب کشن اچھالتے ہوئے پوچھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"ساری نیند کا ناس مار دیا۔"

"نیند کو گولی مارو سونے کا بھی کیا فائدہ خواب میں بھی کوئی رومانس کرنے تو آتا نہیں۔"

"ضوبیا یہ میرا سوٹ استری کر دو۔" جانے وہ کہاں سے ٹپکا تھا اور کیا کچھ سن چکا تھا۔

"میں کر دیتی ہوں۔" اپنی خفت مٹانے کی خاطر اس نے جھٹ خدمات پیش کر دیں۔ ضوبیا بے فکر ہو کر پھر سے اونگھنے لگی تھی وہ خاموشی سے سوٹ اسے تھما کر واش روم میں گھس گیا۔

"اب تھوڑی عقل استعمال کر لینا اور پانی لگا کر اچھی طرح سے پریس کرنا ایک بھی شکن رہ گئی تو اس کا میٹر گھوم جاتا ہے۔" چادر سے منہ نکالتے ہوئے وہ مشورہ دینا نہیں بھولی تھی الوینہ نے بھی قمیص کو خوب پانی میں بھگو ڈالا تھا اور اب استری لگتے ہی شوشو کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"میری قمیص ہے کمہار کا کھیت نہیں۔" وہ پیچھے آن کھڑا ہوا۔

"ہاں ہاں۔" اس سے بات نہیں بن پا رہی تھی چہرے کو تو اس نے کمہار کا کھیت سمجھ کر ہی کیا تھا۔۔۔ کم بخت اب سوکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔

"ضوبیا میرے سب کام خود کیا کرو۔" قمیص پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے کے بعد وہ ضوبیا کو تنبیہہ کرتے ہوئے چلا گیا تو الوینہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

آج اسے زبان حیدر کے آفس جانا تھا وہ اس کے ساتھ مل کر لیدر گارمنٹس کی فیکٹری لگا رہا تھا باقی کچھ پلانس وغیرہ تھے پہلے تو وہ لوکیشن کچھ خاص نہیں تھی' لیکن اب کمرشل ایریا کی بدولت اس زمین کی ویلیو کافی بڑھ گئی تھی اور اس کا ارادہ وہاں ہوٹل بنانے کا تھا۔

"ضوبیا اٹھ جاؤ وہ لوگ نکل چکے ہیں اور تم ابھی تک یونہی بیٹھی ہو۔" خالہ نے اس بار اس کی "اچھا" پر اکتفا کرنے کی بجائے اٹھا کر ہی دم لیا تھا۔ اسے کچھ لوگ دیکھنے آ رہے تھے۔

"میں ٹھیک لگ رہی ہوں نا۔" وہ کوئی دسویں بار اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہو۔" وہ ابھی تک جلی بیٹھی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"اب کیا زمین و آسمان کے قلابے ملاؤں اور ویسے بھی مجھے اچھا لگنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ پسند کرنے والے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"سو تم۔" جوتا پہن کر دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی وہ سر تا پا چادر تان کر لیٹ گئی امی ابو کچھ زیادہ ہی یاد آ رہے تھے۔

"ایک تو امی کو بھی ذرا جو میرا خیال ہو شوہر کی محبت میں لگی ہوئی ہیں۔" اس کے ابو اب بالکل صحت یاب ہو چکے تھے لیکن وزٹ ویزہ چونکہ چھ ماہ کا تھا تو ابو کی خواہش تھی کہ وہ چھ ماہ گزار کر ہی پاکستان جائیں۔

☆ ☆ ☆

کلب میں اس کی ملاقات ایک بار پھر نازلی سے ہو گئی تھی اس نے تو دیکھ کر اگنور کر دیا تھا لیکن وہ خود ہی اس کی جانب چلی آئی تھی۔

"ہیلو بہروز ملک۔" آج ایک بار پھر اس نے اپنا ہاتھ اس کی سمت بڑھایا تھا۔

"ہیلو۔" جسے اس نے ہلکا سا تھام کر چھوڑ دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" ازراہ مروت اسے پوچھنا پڑا۔

"اچھی ہوں لیکن کچھ دن تو کافی تکلیف میں گزرے تھے۔"

"میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" وہ سچ میں شرمندہ تھا۔

"معذرت سے کام نہیں چلے گا غلطی کی ہے تو اس کا کفارہ ادا کرو۔" اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے وہ بے تکلفی سے گویا ہوئی تو بہروز ملک نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے غلطی کا کفارہ بتا دیجیے ہم ادا کردیں گے۔"

"سوچ لیجیے' ایسا نہ ہو کہ آپ بعد میں مکر جائیں۔" اس کا انداز چیلنج بھرا تھا۔ بہروز نے کچھ چونک کر اسے دیکھا اور پھر اعتماد سے بولا۔

"آپ کہہ کر تو دیکھیں۔"

"مجھے رائیڈنگ کا بہت شوق ہے میں ایک بار آپ کے "سلطان" پر سواری کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں بچوں کی سی ضد تھی انداز پر مشتاق تھا اور ہیزل گرین آنکھوں میں جگنو سے جھلملا رہے تھے وہ اس وقت وائٹ جینز پر پنک پھولوں والا فیروزی رنگ کا ٹاپ پہنے ہوئے تھی۔ ریشمی دوپٹا گردن میں جھول رہا تھا۔

"اوکے۔" بہروز ملک کو اس کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا۔ والٹ سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو جب آنا ہو مجھے کال کر دیجیے گا' میں پک کرلوں گا۔"

"تھینک یو سو مچ۔" وہ کارڈ اٹھا کر چلی گئی وہ کچھ دیر بیٹھا الوینہ کے متعلق سوچتا رہا پھر اٹھ کر زیان کے آفس چلا گیا۔

فیکٹری کی مصروفیات آج کل کافی بڑھ چکی تھیں۔ ہوٹل کے متعلق بھی اس سے پارٹنر شپ ایگریمنٹ پر سائن وغیرہ کروانے تھے۔

☼ ☼ ☼

"لیکن' میں اس سے کیا بات کروں گی۔" ضویا ازحد پریشان بہانے سے وہاں ٹہل رہی تھی۔ اس روز جو لوگ اسے دیکھنے آئے تھے وہیں اس کی بات پکی ہو گئی تھی فرحان اچھا خاصا ہینڈسم' تعلیم یافتہ اور خاندانی لڑکا تھا۔ سعودیہ میں ایک اٹالین کمپنی میں کوالٹی آف لیبارٹری کا انچارج تھا کچھ دیر قبل اس کی کال خالہ نے اٹینڈ کی تھی جس میں وہ ضویا سے بات کرنے کی اجازت لے چکا تھا۔

"فکر نہ کرو ساری باتیں وہ کرلے گا تم بس جواب دیتی جانا۔" الوینہ کے طنزیہ لہجے پر وہ منہ پھلا کر بیٹھی ہی تھی کہ سیل فون کی چنگھاڑتی بیل نے اس کے حواس گم کر دیے وہ سیل فون کان سے لگا کر بولنا بھول چکی تھی۔

الوینہ کے اشاروں اور ایڑیوں سے ابھری۔

"ہیلو۔ ہیلو۔" کی آواز پر اس نے جیسے خود کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔ الوینہ اسے مکمل پرائیویسی فراہم کرتے ہوئے ٹیرس پر چلی آئی تھی۔

وہ لان چیئر پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں منہمک تھا الوینہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ نیوی بلو رنگ کے کرتا شلوار پر اجرک کاندھوں پر ڈالے مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت کا مالک وہ شخص اس کے نام تھا۔

یہ احساس ہی کتنا خوش کن اور مسرت آمیز تھا۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بھی آکر بالکل اس کے سامنے براجمان ہو چکی تھی ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے کتاب کے سرورق پر نگاہ دوڑانا چاہی تو بہروز نے کتاب سے نظریں اٹھا کر گھورتے ہوئے اسے دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" فراخ پیشانی پر خفیف سی شکن ابھری۔

"مسئلہ تو تم ہو بھلا کوئی اس لمحے میں بھی اپنی منگیتر سے بات کرتا ہے۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے ایک گہرا سانس بھرا مسکراہٹ کر کے بولی۔ "آپ فلمیں نہیں دیکھتے؟"

بہروز ملک کے ماتھے پر مزید بل نمودار ہوئے تو وہ تھوک نگلتے ہوئے وضاحت آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

"اتنے دن ہو گئے میں نے کوئی فلم نہیں دیکھی آپ کے ٹی وی میں پی ٹی وی کے علاوہ کوئی چینل نہیں آتا اس پر نہ کوئی آؤٹنگ۔ میں سخت بور ہو چکی ہوں مجھے کہیں گھمانے لے کر جائیں۔"

"چلو۔" وہ کتاب وہیں میز پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہیں واقعی۔" اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں اور پھر اس کو آمادہ دیکھ کر ضویا کو بھی بلالیا اتنے شارٹ نوٹس پر اس نے "چلو" کہا تھا کہ دونوں چینج کیے بغیر ہی چلی آئیں۔ اور وہ انہیں لایا بھی تو اپنے ڈیرے پر وہ بھی گھوڑے دکھانے۔

"تم دونوں کے پاس تین گھنٹے ہیں جتنی آؤٹنگ کرنا چاہو کرلو۔" اور الوینہ کا جی اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا تھا اتنی گرمی' دھول اور حبس بھرے باجرے کے کھیت۔

"بدتمیز' خبیث' کمینہ۔" جتنی بھی مہذب گالیاں اسے از بر تھیں سب دے چکنے کے بعد بھی اس کا من ہلکا نہیں ہوا تھا۔

"اچھے بھلے اے سی لگا کر بیٹھے تھے تم پر ایسی کیا آفت آئی جو گھومنے کا شوق چڑھ گیا۔" ضویا درخت تلے کھڑی دوپٹے سے پنکھا جھلتے ہوئے اس پر تپ رہی تھی۔

"میں نے تو سوچا تھا وہ کسی اچھے سے پکنک پوائنٹ پر لے جائے گا فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھلائے گا اس کے بعد مجھے لاہور گھمائے گا شاپنگ کروائے گا اور پھر ہم لانگ ڈرائیو پر نکل جائیں گے اور۔"

"اور پھر وہ تمہیں دنیا کے آخری جزیرے پر لے جا کر چاندنی رات میں موگرے کے پھولوں اور ایک عدد ڈائمنڈ رنگ کے ساتھ پرپوز کرے گا۔" ضویا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ الوینہ کا حشر کر ڈالے جبکہ الوینہ نے اپنی معصومیت کا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہاں سے واپسی پر ایک سرپرائز اس کا منتظر تھا ابو ای اطلاع دیے بغیر اچانک ہی آچکے تھے۔ "ابو" وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ ضویا اور خالہ کچن کو رونق بخش چکی تھیں وہ دیر تک بیٹھی ان کے ساتھ باتیں کرتی رہی' میز پر برتن لگوانے میں اس نے ضویا کی مدد کی تھی۔ مٹر پلاؤ' بھنی ہوئی مرغی' کباب' بادام کا حلوہ' سلاد ــــــ اس کا فیورٹ تھا کھانا خوش گوار ماحول میں تناول کیا گیا۔

اس کے بعد ہال کمرے میں بڑوں کی محفل جمی تھی وقار احمد کی خواہش تھی کہ بیٹی کو وداع کر کے وہ لوٹ دوبئی شفٹ ہو جائیں خالہ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھی تھیں۔

سو ـــــ شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ان کی واپسی تھی۔ آخری وقت تک اسے انتظار رہا تھا کہ وہ اسے سی آف کرنے آئے گا گاڑی چل پڑی تھی اس نے پلٹ کر ضویا اور خالہ کو ہاتھ ہلایا تو نگاہ بھٹکتی ہوئی ـــــ بالکونی اور سیڑھیوں تک کو کھنگال آئی مگر کسی دریچے اور جھروکے کی اوٹ میں وہ دو آنکھیں نہیں تھیں۔

لیکن جوں ہی گاڑی علاقے کی حدود سے نکل کر کچھ آگے بڑھی ایک عجیب ہی منظر دیکھنے کو ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں آفس میں بیٹھے گہری سوچ میں مستغرق تھے ابھی کچھ دیر قبل میر بخت ان کے دفتر سے نکل کر گیا تھا وہ ان سے پلاٹ کے سلسلے میں بات کرنے آیا تھا۔

"زیان میں چاہتا ہوں کہ تم وہ زمین مجھے دے دو میرا ارادہ وہاں شاپنگ مال بنانے کا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اور شیراز جنگ کی رجسٹری تمہارے نام کرنے کو تیار ہیں لیکن مسئلہ بہروز کا ہے جو وہاں فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کا ارادہ رکھتا ہے تم اسی سے بات کرلو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" پندرہ کنال کا وہ پلاٹ ان چاروں کا مشترکہ تھا۔ بہروز وہاں ہوٹل بنانا چاہتا تھا اس کے ساتھ کوئی بھی پارٹنر شپ کرتا اسے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میر بخت وہاں شاپنگ مال بنانے کا ارادہ کر بیٹھا تھا اور کسی کو پارٹنر بنانے پر بھی آمادہ نہیں تھا

زیان حیدر نے دونوں کو ہاں کردی تھی۔

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے ایک جانب تم خود وہاں شاپنگ مال بنانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہو اور دوسری جانب زمین ان کو دینے کی ہامی بھرلی ہے۔" میر بخت کے جانے کے بعد شیراز اس پر چڑھ دوڑا تھا۔

"ایک وہاں ہوٹل بنانا چاہتا ہے اور دوسرا شاپنگ مال وہ دونوں کسی صورت وہ جگہ ہمیں نہیں دیں گے اور مجھے ففٹی فائیو پرسنٹ کا پارٹنر نہیں بننا۔" پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے وہ پرسوچ انداز میں بولا تو شیراز کو غصہ آگیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنا حصہ بھی انہیں دے دیں۔" جس پر زیان حیدر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"نہیں میرے پاس ایک پلان ہے۔"

☼ ☼ ☼

رات سونے کے لیے لیٹی ہی تھی جب وہ منظر پھر سے نظروں کے سامنے روشن ہوگیا تھا۔ لاہور سے واپسی پر جب ان کی گاڑی پگڈنڈی سے گزر رہی تھی تب اس نے بہروز کو ایک خوب صورت الٹرا ماڈرن لڑکی کے ساتھ کھیتوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ان کے تو دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی جس کے ساتھ وہ اس بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا پھر کون تھی وہ لڑکی۔ سوچوں کے گرداب میں بھٹکتے ہوئے اس کا ذہن الجھ رہا تھا لیکن وہ بدگمان ہونا نہیں چاہتی تھی کچھ سوچتے ہوئے اس نے خالہ کے پی ٹی سی ایل کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ تیسری بیل پر ضوبیا کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

"تمہیں وہاں بیٹھ کر بھی چین نہیں۔"

"ضوبیا مجھے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے۔" اپنی جانب سے اس نے تجسس میں مبتلا کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر دوسری جانب بھی ضوبیا تھی اس کی رگ رگ سے واقف۔

"خواب میں بھائی کے ساتھ کسی لڑکی کو دیکھ لیا ہوگا۔" بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس نے قیاس آرائی سے کام لیا۔

الوینہ نے پہلے ریسیور کو گھورا پھر حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

"یار خواب میں نہیں حقیقت میں۔"

"بھائی اسے گھر بھی لے کر آئے تھے۔" جواباً اس نے مزے سے دھماکا کیا تھا۔

"کیا؟" اس کا صدمے سے برا حال ہوگیا۔

"وہ صرف میری فین تھی سلطان پر سواری کرنے کا شوق تھا اسے۔ اس لیے آئی تھی بس اور کچھ نہیں۔ اب تم اپنے دماغ کو کہو کہ بھی یا ہمیں پر زیادہ زور نہ دو اور سو جاؤ آرام سے۔" ضوبیا نے ریسیور جھپٹتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی اور رابطہ ڈس کنیکٹ کردیا۔

"بدتمیز۔" پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اچانک ہوا کیا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو وہ ہلکی پھلکی ہوکر بیڈ روم میں واپس چلی آئی تھی۔

اگلا پورا ویک شاپنگ اور شادی کی تیاریوں میں گزر گیا تھا۔ مہندی کے روز وہ سب لاہور چلے آئے تھے نکاح کے بعد رسم حنا ہوئی تھی اور اگلے دن رخصتی کے بعد مختلف رسموں سے فراغت ملنے پر اسے برائیڈل روم میں پہنچادیا گیا تھا۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ جیسی مذاق قہقہے۔

بہروز کی آمد کے ساتھ ہی سب باری باری کھسک گئیں تو وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کے مقابل آن بیٹھا۔

"السلام علیکم۔" آواز میں کچھ خلاف توقع سی چمک تھی الوینہ کا دل یک بارگی دھڑک اٹھا مگر خود نظریں جھکائے لب سیے بیٹھی رہی۔ جواب بھی دل میں ادا ہوا۔ نظروں کی تپش پر وہ مزید سمٹ گئی تھی۔ بہروز نے نرمی سے گود میں رکھا اس کا حنائی ہاتھ تھاما اور رنگ پہنادی۔ کچھ پل خاموشی سے سرکے تھے لیکن ہاتھ اس نے ابھی بھی نہیں چھوڑا تھا۔

وہ پلکیں اٹھانے پر مجبور ہوئی اور نظروں کے تصادم پر ایک شرمگیں سا تبسم اس کے لبوں پر بکھر گیا تھا۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ مدھم سرگوشی میں بولا۔ یہ انداز و اطوار اس دشمن جان کے تو نہیں تھے اس نے مصنوعی خفگی سے گھورنا چاہا تھا لیکن کم بخت حیا آڑے آگئی تھی مگر اس کے ڈائیلاگ بدستور جاری تھے۔

"چاند ستاروں کی باتیں تو مجھے نہیں آتیں لیکن ہاں اتنا وعدہ کرتا ہوں کہ عالی کی طرح ہر صبح تمہارے لیے پھول لاؤں گا مرجہانگیر کی طرح تمہارے ناز اٹھاؤں گا اور اب اگر اجازت ہو تو عالم شاہ کی طرح تھوڑا سا حق بھی جتادوں۔" ذومعنی لہجہ اتنی باخبری۔ اب کی بار اس نے خوب گھورا تھا جس پر اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کچھ گستاخیاں کرڈالیں۔

☼ ☼ ☼

"بہروز ملک نے انکار کردیا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ میرا دوست ہے یا دشمن۔" زیان حیدر کے آفس میں بیٹھا وہ مسلسل پیچ و تاب کھاتا آپے سے باہر ہورہا تھا اس پر وہ دونوں تھے جو جلتی پر پیٹرول چھڑک رہے تھے۔

"ہم نے تو اسے بہت سمجھایا تھا مگر وہ ہمیں دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر ہم نے وہ زمین اسے نہ دی تو وہ مجھ سے اپنا بزنس الگ کرلے گا یہ رہے زمین کے کاغذات تم پہلے اس کے سائن کروالو، ہم دونوں اس کے بعد ہی سائن کریں گے کیونکہ تم جانتے ہو میں اس سے ناراضی مول نہیں لے سکتا میرا سارا بزنس اس کے ساتھ ہے۔" زیان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کول ڈاون کرنے کی کوشش کی تھی جس پر وہ مزید تپا ہوا بیٹھا۔

"پلاٹ تو میں اس سے کسی بھی قیمت پر لے کر رہوں گا۔"

"اور وہ کسی بھی قیمت پر ہمیں پلاٹ نہیں دے گا اس لیے میری مانو تو چھین لو۔" شیراز نے نئی راہ دکھائی تھی۔

"کیا مطلب۔" وہ ٹھٹکا۔

"یار دو چار دھمکیاں دو یا پھر ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھو پھر دیکھو۔" اس کے ذومعنی مشورے پر وہ اپنی جگہ اچھل کر رہ گیا۔

"بکواس نہ کرو یار سے وہ اپنا۔"

"تو ہم کون سا اسے قتل کرنے کو کہہ رہے ہیں اور اگر اتنا ہی یار ہوتا تو محض اپنا مفاد نظر نہ رکھتا ہم بھی تو ہیں اس کی پارٹنر شپ کی آفر ٹھکرا کر تمہارا فائدہ سوچ رہے ہیں۔" زیان کے پرخلوص انداز پر وہ لب بھینچے بیٹھا کچھ سوچنے لگا تھا جب شیراز نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

"فکر کیوں کرتے ہو ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"ٹھیک ہے دیکھ لیتا ہوں کہ وہ اپنا حصہ کیسے میرے نام نہیں کرتا۔" زمین کے کاغذات اٹھا کر وہ تن فن کرتا آفس سے نکل گیا تھا راستہ بھر یہ بات دل کی رگیں کاٹتی رہی تھی کہ بہروز اس کا دوست ہوکر اس پر ترقی کی تمام تر راہیں مسدود کررہا ہے تو پھر وہ کیوں لحاظ رکھے اور اس کی اتنی جرات کہ اس نے زیان اور شیراز کو دھمکی دی ہے وہ بھی میرے خلاف۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی شام اس کے امی ابو واپس دبئی چلے گئے تھے وہ انہیں سی آف کرنے کے لیے بہروز کے ساتھ گھر چلی آئی تھی۔ اور آج اس گھر میں ولیمہ کے بعد اس کی پہلی صبح تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنارہی تھی بہروز شاور لے رہا تھا۔ جب سیل فون کی بیپ پر اسے متوجہ ہونا پڑا اسکرین پر "تانیہ کالنگ" جگمگا رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کال ریسیو کرتی بہروز اس کے ہاتھ سے سیل لے کر آف کرچکا تھا۔

"یہ تانیہ کون ہے؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"پلیز اب بیویوں کی طرح۔ جھگڑا مت کرنا یہ کوئی بھی نہیں ہے آؤ ہم ناشتا کرتے ہیں۔" ناشتے کی میز پر

خالہ اور ضوبا پہلے سے ہی دونوں کی منتظر تھیں اور اس نے سب کے سامنے ایک سوال پوچھا تھا۔

"الوینہ تم ہنی مون کے لیے کہاں چلو گی؟" جواباً وہ اسے گھورتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی بعد میں اس کی اچھی طرح سے خبر لی۔

"تمہارا بس چلے نا تو تم ہنی مون بھی اپنے اصطبل میں مناؤ۔" اسے کچھ روز قبل والی تفریح بھولی نہیں تھی اور یہ سوال بھی اسی ضمن میں کیا گیا تھا وہ اس کی سب چالاکیاں جانتی تھی۔

"ویسے تمہیں تنگ کرنے کا بھی خوب مزا آتا تھا۔" اس نے جیسے سوچتے ہوئے لطف لیا۔

"اور میں تمہیں کافی معصوم سمجھتی تھی اب کیا پتا تھا کہ اندر سے پورے گھنے ہو۔" وہ ہنوز منہ پھلائے کھڑی تھی۔

"اچھا اب کی بار تمہیں دنیا گھماؤں گا تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا اگر کہو گی تو ہارس انفارمیشن کے بجائے تمہارے ریک میں رکھے وہ سارے رومینٹک ناول پڑھوں گا تمہارے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جاؤں گا خوب ساری شاپنگ کراؤں گا چاندنی رات میں ٹیرس پر کھڑے ہو کر تمہیں کیٹس کی نظمیں سناؤں گا اور۔۔۔"

"بس بس اتنا ہی کافی ہے۔" وہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائی تو وہ کہتے کہتے ہی پل بے ساختہ اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔

"تم کتنی پیاری ہو الوینہ۔" وہ بے ساختہ شرمائی۔

"دل چاہتا ہے زندگی کا ہر پل ہر لمحہ بس تم میرے ساتھ رہو لیکن جانے کیوں ڈر سا لگنے لگا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کھو جاؤ گی عجیب سی فیلنگ ہو رہی ہے آج کل۔" اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔

"بھائی آپ کا فون ہے۔" ضوبا کی آواز پر وہ پلٹ گیا۔

الوینہ کتنی ہی دیر ابھی ابھی سی وہیں کھڑی رہ گئی تھی کچھ عجیب سا احساس تو اسے بھی ہوا تھا۔ وہ بھاگ کر لاؤنج میں آئی لیکن تب تک وہ راہداری عبور کرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ چوکھٹ پر کھڑی اس کی جیپ کو نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی حالانکہ وہ اسے روکنا چاہتی تھی لیکن اب تو وہ جا چکا تھا۔

"ضوبا کس کا فون تھا۔" وہ عجلت میں واپس پلٹی۔

"میر بخت کا بھائی کا بہت اچھا دوست ہے۔" وہ با آواز اطلاع دیتی کچن میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تانی تم یہاں۔" جیپ سے اترتے ہی اس کا پہلا سامنا تانی سے ہوا تھا وہ اسے اپنا منتظر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا ابھی کچھ دیر قبل میر بخت نے اسے کال کر کے وہاں بلوایا تھا۔

وہ کافی غصے میں تھا اور پلاٹ کے سلسلے میں اس سے فائنل بات کرنا چاہ رہا تھا۔

یہ بات کچھ روز قبل بھی وہ کر چکا تھا تب بہروز نے اسے انکار کر دیا تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ وہاں شاپنگ مال بنانا چاہتا ہے تو وہ اس کے ساتھ پارٹنرشپ کرے گا پھر بھی نہ مانا تو وہ اپنا حصہ اسے تحفے کے طور پر دے دے گا اور زبان حیدر اور شیراز سے بھی ریکویسٹ کرے گا کہ وہ بھی اپنا حصہ اسے فروخت کر دیں۔

"مبارک ہو۔" اس کا طنزیہ لہجہ اور خفگی بھرا انداز اسے کچھ ناگوار سا ضرور لگا تھا لیکن اخلاقی طور پر اس نے خوشدلی سے شکریہ ادا کیا تھا۔

"تم بہت سنگدل اور ظالم انسان ہو۔" سرسبز شاخ کے پتے نوچتے ہوئے وہ زمانے بھر کی مظلومیت خود پر طاری کرتے ہوئے بولی تو بہروز کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی بل نمودار ہوئے۔

"محترمہ آپ میری سنگدلی اور ظلم کی وضاحت فرمائیں گے۔"

"میرا دل توڑا ہے الوینہ کو اپنی شریک حیات بنا کر جب کہ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" اس روز رائیڈنگ کے بعد وہ تانی کی

خواہش پر اسے اپنا گھر دکھانے لایا تھا۔

خالہ اور ضوبا اس سے کافی خلوص اور اپنائیت سے ملی تھیں۔

لنچ اس نے ان لوگوں کے ساتھ کیا تھا آتے ہوئے وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی جو اسے ڈراپ کر کے جا چکا تھا تب مجبوراً بہروز کو اسے واپس چھوڑنا پڑا وہ جسٹ ایک اچھے میزبان کا کردار نبھا رہا تھا۔ گاڑی سے اترنے کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے اس کے پاس ٹھہری تھی۔ اور اس ایک لمحے میں اس نے بہروز ملک سے "آئی لو یو" کہا تھا اسے اس لڑکی کی دلیری اور بولڈنیس پر حیرانی بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ الوینہ کے لاابالی پن اور جذبوں سے انجان ہرگز نہیں تھا لیکن ایسی جرات کا مظاہرہ تو کبھی اس نے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اگر وہ کرتی بھی تو اسے برا نہ لگتا۔ تب سے وہ اسے مسلسل کالز اور ایس ایم ایس کر رہی تھی جسے وہ اگنور کرتا جا رہا تھا اور اب اس شکوے کا تو کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔

"یہ تمہارے دل کا یکطرفہ معاملہ ہے میرا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" موبائل کی بیپ پر وہ اس جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ دوسری جانب زبان تھا۔

"ہیلو بہروز تم جہاں بھی ہو پلیز اپنا پسٹل اپنے ساتھ رکھنا میر بخت کسی نیک ارادے سے تم سے ملنے نہیں آ رہا وہ ہمیں دھمکی دے کر گیا ہے کہ تمہیں مار ڈالے گا۔" بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں تیز تیز بولتا بہروز کو وہ اپنے لیے بے حد فکرمند اور ہراساں سا محسوس ہوا تھا۔

وہ اس وقت ڈیرے سے قدرے فاصلے پر سفیدے کے درختوں کے پاس کھڑے تھے اور اس کے عقب میں جھاڑیاں تھیں۔ اس کا لوڈ پسٹل جو کہ جیپ کے ڈیش بورڈ پر پڑا تھا اس نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔

میر بخت کی وائٹ ہنڈا سوک کو رکتے دیکھ کر اس نے سیل فون بند کیا اور لب بھینچتے ہوئے اپنے جوش میں بھڑکتے آتش فشاں کو ضبط کرتے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

"سائن کرو ان کاغذات پر۔" اس نے آتے ہی پلاٹ کے کاغذات جیپ کے بونٹ پر پھینکے تھے اور خود بگڑے تیوروں سمیت اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔

"اور اگر نہ کروں تو؟" اس کے توہین آمیز انداز نے بہروز کو مزید تپا ڈالا اور اسے بھی جیسے ضد ہو چکی تھی۔ لیکن میر بخت نے سالوں پرانی دوستی کا لحاظ کیے بغیر اس پر ریوالور تان دیا تھا۔ بہروز ہکا بکا سا ایک پل کے لیے ساکت نظروں سے اسے دیکھتا رہا جیسے یقین کے مراحل طے کرتا جا رہا ہو۔ اگلے ہی پل اس نے بھی اپنا پسٹل نکال کر اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

"چلاؤ گولی۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئے تم دونوں۔" تانی جو اب تک خاموش کھڑی تھی اچانک ان دونوں کے درمیان آن کھڑی ہوئی تھی۔

"ہٹ جاؤ تم درمیان میں سے۔" بہروز نے اسے ہٹانے کی کوشش کی تو تانی نے اس کا وہی ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچا تھا نیچے کسی پتھر پر اس کا پاؤں رپٹا تھا اور اپنا توازن برقرار رکھنے کے چکر میں اس کی گرفت ٹریگر پر جانے کب سخت ہوئی تھی کہ ایک ٹھاہ کی آواز کے ساتھ ہی کتنے پرندے درختوں سے اڑے اور جب تک وہ سیدھا ہوا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ گولی میر بخت کے سینے میں اتری تھی۔ خون کا ایک فوارہ ابل رہا تھا۔ تانی بے ساختہ لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ بہروز نے بدحواس سا ہو کر پسٹل پیچھے پھینک دیا تھا۔ میر بخت کا وجود بن پانی کی مچھلی کی مانند زمین پر گرا تڑپ رہا تھا۔

"میر بخت۔" وہ بے ساختہ زمین پر جھکا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

"تانی تم جانتی ہو میں نے اسے نہیں مارا۔" وہ جیسے مکمل طور پر حواس کھو چکا تھا۔

"چلو ادھر سے۔" وہ زرد پڑتی رنگت کے ساتھ اسے کھینچ کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد جھاڑیوں کے اندر سے کوئی نکلا تھا اس

نے پلاٹ کے وہ کاغذات اٹھائے تھے اور دور کھڑی اپنی گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔ گاؤں کے لوگ اب لاش کے قریب جمع ہونا شروع ہو چکے تھے پھر اس نے پبلک بوتھ سے پولیس کو اطلاع دی تھی۔

بہت دور نکل آنے کے بعد اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روکتے ہوئے اسے دیکھا تھا جو شکست خوردہ سا دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔

"تم یہاں سے بھاگ جاؤ بہروز جب تک سب ٹھیک نہیں ہو جاتا۔" اس نے اپنی بے حد سرخ ہوتی آنکھوں سے نازلی کو دیکھا تو اس نے بہروز کے شانے پر تسلی آمیز ہاتھ رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اسے لگا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

"تم کہاں جاؤ گی۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"میں ٹیکسی میں گھر چلی جاؤں گی۔"

✡ ✡ ✡

اس کا دل آج صبح سے بے چین تھا کوئی کام کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہو رہی تھی اپنا دھیان بٹانے کی خاطر وہ ضویا کے پاس کچن میں چلی آئی۔ اس نے آج لنچ پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔ تین بج چکے تھے وہ تمام تر لوازمات میز پر سجائے اس کی منتظر تھی۔ جب خالہ نے وال کلاک کی سمت نگاہ دوڑاتے ہوئے الوینہ کو دیکھا۔

"اسے کال کر کے معلوم تو کرو کہاں رہ گیا ہے۔"

"صبح سے کر رہی ہوں لیکن سیل آف جا رہا ہے۔" وہ مایوسی سے کہتے ہوئے اٹھ کر دروازے تک گئی پھر نا امید ہو کر لوٹ آئی۔

"کس کا فون آیا تھا۔" اب کی بار انہوں نے ضویا سے دریافت کیا۔

"میر بخت کا۔" وہ سادگی سے کہتی اپنی پلیٹ میں چاول نکالنے لگی تھی۔

"پھر تو کھانا کھا کر ہی آئے گا چلو الوینہ تم کھاؤ اس کے انتظار کا اب کوئی فائدہ نہیں بیٹھا ہو گا کہیں دوستوں کی محفل جما کر آج آ جائے تو اچھی طرح خبر لوں گی میں اس کی۔" خالہ کو اچھا خاصا غصہ آیا تھا پھر ڈور بیل کی آواز پر اٹھ کر مرکزی دروازے کی سمت چلی آئیں۔

"لگتا ہے آ گیا ہے۔" لیکن دروازے پر خاکی وردی والوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔

"بہروز ملک کہاں ہے؟" انسپکٹر کی نظریں ان کے عقب میں ادھر ادھر منڈلا رہی تھیں جبکہ وہ حواس باختہ سی اسے دیکھے گئیں۔

"کیوں آپ کو کیا کام ہے بھائی سے۔" وہ دونوں بھی اٹھ کر دروازے پہ چلی آئیں ضویا نے ہی ہمت کر کے دریافت کیا تھا۔

"میر بخت کو قتل کیا ہے مقتول کے بھائیوں نے ایف آئی آر کٹوائی ہے۔" حالانکہ اس کی اور میر بخت کی جھڑپ کو کسی نے نہیں دیکھا تھا پھر بھی یہ خبر جنگل میں آگ کی مانند پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" الوینہ نے خالہ کو سنبھالتے ہوئے بمشکل آنسو ضبط کیے تھے۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بی بی اگر اس نے آکر گرفتاری نہ دی تو آپ تینوں کو اریسٹ کر کے لے جاؤں گا۔" انسپکٹر نے اب کی بار جانچتی نظروں سے ان دونوں کو سر تا پا گھورا تھا۔

"وہ صبح سے گھر نہیں آیا۔" ضویا اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے اگر وہ کسی قسم کا بھی رابطہ کرے تو فوراً" ہمیں اطلاع دی جائے ابھی یہ دونوں حوالدار تمہارے گھر کے باہر ہوں گے اسے کہنا شرافت سے گرفتاری دے دے ورنہ انجام اچھا نہیں ہو گا ہمیں شک ہے کہ وہ علاقہ غیر کی جانب نکل گیا ہے۔" انسپکٹر اپنا شک ظاہر کرنے کے بعد دھمکی سے نوازتا چلا گیا تھا۔

"ہی بھائی ایسا نہیں کر سکتے۔" ضویا گھنٹہ بھر انہیں دلاسا، حوصلہ، تسلی دینے کے بعد اندر سے بہروز کی نیلی فون ڈائری اٹھا لائی تھی جس میں سے اسے زیان حیدر کا نمبر با آسانی مل گیا تھا۔

جو اس وقت دنیا دکھاوے کی خاطر میر بخت کی میت کو آخری آرام گاہ پہنچانے کا سامان کر رہا تھا۔ وہاں سے شام کے بعد وہ سیدھا ان کے گھر آیا تھا۔

"آنٹی آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا انسپکٹر سے میں بات کر چکا ہوں اب وہ آپ کو تنگ نہیں کرے گا اور بہروز کا بھی ہم پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں اگر آپ کو اس کا کوئی فون وغیرہ آئے تو فوراً" مجھے اطلاع دیجیے گا۔" وہ اپنے طور پر انہیں مصنوعی تسلیاں دے کر چلا گیا تھا۔ جبکہ رات دونوں نے مل کر خوب جشن منایا۔

✡ ✡ ✡

"دل چاہتا ہے زندگی کا ہر پل ہر لمحہ بس تم میرے ساتھ رہو لیکن نہ جانے کیوں ڈر سا لگنے لگا ہے ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کھو جاؤ گی۔" شدید طوفانی بارش میں بھیگتے ہوئے وہ ٹیرس پر کھڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آج بہروز کو گھر سے لاپتا ہوئے سات روز ہو چکے تھے۔

اس کے کہے آخری جملے اس کی سماعتوں پہ ہتھوڑے کی مانند برستے تھے' یہ ان کی شادی کے بعد پہلی بارش تھی اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ برستی بارش میں بھیگتے ہوئے آئس کریم کھائے گا۔ وہ دونوں کہنیاں ریلنگ پہ ٹکائے کھڑی تھی۔

ہاتھوں پر ابھی بھی مہندی کے ہلکے ہلکے نقش و نگار باقی تھے ہری اور جیز کے جوڑے ویسے ہی رکھے تھے بہروز ملک کا وہ سوٹ جو اس نے اپنے ہاتھوں سے استری کیا تھا جو آج کے دن انہیں زیان حیدر کے گھر دعوت پہ پہننا تھا ہینگر پر لٹکا ہوا تھا۔

ابھی تو کمرے میں اس کی مخصوص مہک باقی تھی اور وہ خود کھو گیا تھا سارے وعدے توڑ کر اسے محبت کے آخری جزیرے پر لا کر وہ ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ گیا تھا۔

"الوینہ یہاں کیوں کھڑی ہو۔" ضویا اس کے بیڈ روم میں شفٹ ہو چکی تھی اور اب بھی اسے نہ پا کر باہر

آئی تو اسے ٹیرس پر کھڑے بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھا تھا۔

"ایسے ہی کمرے میں دل گھبرا رہا تھا۔" اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے لیکن نم آلود آواز کی لرزش ضوبا سے مخفی نہیں رہ پائی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے الوینہ کہ بہروز بھائی کسی کو قتل کرسکتے ہیں۔" وہ خود بھی اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ الوینہ نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلادی۔

"لیکن قانون ثبوت اور گواہ مانگتا ہے جو سب کے سب ان کے مخالف ہیں۔" سیل فون کی بیپ پر دونوں اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر بیڈ روم کی سمت لپکی تھیں۔ آج سات روز ہوئے سماعتوں نے یہ گھنٹی سنی تھی۔ ان کی توقع کے برعکس دوسری جانب زیان حیدر تھا۔

☼ ☼ ☼

سات روز ہوٹل میں رہنے کے بعد جب اس کے پاس سارا کریڈٹ ختم ہوچکا تو اس نے بہت سوچ بچار کے بعد زیان حیدر سے رابطہ کیا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کے گھر کے فون ٹیپ کیے جارہے ہوں گے سو اب کسی سے توقع لگتی ہی کم تھی۔

حالانکہ جن حالات سے وہ گزرا تھا اس کے لیے تو اب ہر شخص مشکوک ہوچکا تھا سات روز اس نے خود کو یہ سمجھانے میں لگادیے تھے کہ اسے اس معاملے میں کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی ہوگا۔ اور اب وہ دونوں اس کے سامنے بیٹھے اس المیے پر اظہار افسوس کرنے کے بعد ازخود اسے گرفتاری کا مشورہ دے رہے تھے جسے سن کر وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا تم میر بخت کے بھائیوں کو جانتے نہیں وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے کی خاطر کچھ بھی کر گزریں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا تمہیں ویسے بھی تم نے اپنی جان بچانے کی خاطر اس پر گولی چلائی تھی کوئی قتل نہیں کیا پھر نازلی جائے وقوعہ پر موجود تھی اس واقعے کی چشم دید گواہ ہے اور تمہارے حق میں گواہی دینے کو تیار بھی۔"

"تم نازلی کو کیسے جانتے ہو اور تمہیں کیسے پتا کہ وہ وہاں موجود تھی۔" بہروز نے تعجب سے شیراز کو دیکھا تھا۔

"تمہاری تلاش میں کلب گیا تھا وہیں ملاقات ہوئی تھی۔" زیان نے پیشانی مسلتے ہوئے بتایا تو شیراز نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ بہروز کو بھی یاد آچکا تھا کہ جب وہ پہلی بار نازلی سے ملا تھا تو زیان اس کے ساتھ تھا۔

"دوسرا یہ کہ قتل تمہاری رہائش گاہ پر ہوا ہے یہ بات بھی تمہارے حق میں جاتی ہے پھر میں اور زیان بھی گواہ ہیں کہ میر بخت نے ہمیں تم کو مارنے کی دھمکی دی تھی۔" وہ کیس کے سارے روشن پہلو اس کے سامنے عیاں کرچکا تھا۔ بہروز نے کچھ دیر سوچنے کے بعد واضح دو ٹوک لفظوں میں انکار کردیا۔

"نہیں مجھے کسی پر بھی بھروسا نہیں ہے۔" اس کا اتنا کہنا تھا کہ زیان لب بھینچتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچ کر مسجد میں لے آیا تھا اور وہاں وضو کرنے کے بعد دونوں نے کلام پاک پر ہاتھ رکھتے ہوئے قسمیں کھائی تھیں کہ وہ ہر صورت اس کا ساتھ دیں گے اور پھر الوینہ کو کال کرکے سارا واقعہ اس کے گوش گزار کرنے کے بعد اس نے سیل فون بہروز کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"زیان بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں پلیز گرفتاری دے دو۔" اس کے بعد ضوبا اور پھر خالہ نے بھی فون پر اسے تسلیاں دی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان دنوں میں زیان نے کس طرح بیٹوں کی مانند ان کا خیال رکھا تھا اور پولیس سے ان کی جان بھی چھڑوائی تھی۔ فون بند کرنے تک وہ خود کو پیش کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

اس کی گرفتاری کے بعد ڈی ایس پی صاحب نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا تھا کہ انہوں نے ایک مجرم کو تلاش کرنے میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔

بس اب نازلی کو منانا باقی تھا۔ اسے یاد آیا پچھلے سات روز سے وہ اس سے نہیں ملا۔ قتل کی واردات

بھی اس نے بے حد گھبراہٹ بھرے انداز میں فون پر سنائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز لنچ کے بعد وہ نازنین سے ملنے چلا آیا تھا وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی کالج کے زمانے سے ہی دونوں ساتھ تھے اور وہ جانتا تھا کہ نازنین اس کے لیے کس قدر جنونی اور پاگل ہے۔ وہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوچکا تھا کہ سات روز کی طویل غیر حاضری کے بعد وہ کس قدر خفا اور برہم ہوگی۔ لاؤنج میں اس کا پہلا سامنا زبیدہ آنٹی سے ہوا تھا اور انہوں نے ہمیشہ کی طرح خوشدلی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔

"آؤ شیراز بیٹھو۔"

"آنٹی وہ ناز کہاں ہے؟" بے چینی میں اس نے کھڑے کھڑے ہی دریافت کرلیا تھا لیکن زبیدہ آنٹی کے اگلے سوال نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔

"تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"

"کیوں؟" اس نے الٹا استفسار کیا۔

"تم بہت دن بعد آئے نازنین کا موڈ بھی کچھ اچھا نہیں ہے۔ سات روز سے کمرہ بند کیے پڑی ہے میں تو بہت پریشان ہوں اس سچویشن پر۔"

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" عجلت میں سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر چلا آیا تھا۔ پھر اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر اس کی ناراضی کے متعلق سوچتا رہا عجیب سے وہم و وسوسے دل کو دہلا رہے تھے وہ ان کی شطرنج کا آخری مہرہ تھا اور ہار جیت کا تمام تر انحصار اب اس پر منحصر تھا۔ دروازہ ناک کرنے کے بعد ناب گھما کر جب وہ اندر داخل ہوا تو وہ اسے پژمردہ نڈھال سی بستر پر آنکھیں موندے نیم دراز نظر آئی تھی۔

"ناز یہ کیا حالت بنا رکھی ہے کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ لب بھینچتے ہوئے محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اب خیال آیا ہے میرا۔" اگلے ہی پل اس نے رونا شروع کردیا تھا۔ جس پر وہ مزید بوکھلاتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ارے یہ کیا۔" شیراز نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"مجھے بہت ڈر لگتا ہے آنکھیں بند کرتی ہوں تو ہر طرف خون ہی خون نظر آتا ہے راتوں کو سو نہیں سکتی۔" وہ اس روز سے ہی بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

"اچھا چلو اٹھو کہیں باہر چلتے ہیں۔" شیراز نے نرمی سے اسے بہلایا تو تھوڑی بہت مزاحمت کے بعد وہ چلنے کو تیار ہوگئی تھی۔ لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بہت دور نکل آئے تھے۔ اس کی سنگت میں کچھ وقت گزار کر نازنین کا موڈ کافی حد تک خوشگوار ہوا تھا بلکہ اتنے دنوں سے دل و دماغ پر چھائی مردنی اور قنوطیت بھی کافور ہوچکی تھی۔

جب گاڑی سے اتر کر طویل سیاہ تارکول کی سڑک جو کہ درختوں اور پودوں سے گھری ہوئی تھی پر واک کرتے ہوئے اس نے عجیب سا سوال پوچھا تھا۔

"ناز تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔" وہ رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی پھر اس نے آسمان پر جھلملاتے ستاروں کو دیکھا درختوں میں کھلے جنگلی پھولوں کو خاموش رات کی پیشانی پر چمکتے ۔۔۔ اور متجسس نظروں سے اسے دیکھتے چاند کو مگر کوئی بھی چیز پیمائش میں اس کی محبت سے زیادہ نہیں تھی۔

"لامحدود۔" وہ دونوں بازو پھیلا کر بولی تھی شیراز نے مسکراتے ہوئے سگریٹ سلگالیا۔

"کیا کرسکتی ہو میرے لیے۔"

"بس جان نہیں دے سکتی اور سب کچھ کرسکتی ہوں۔" وہ غیر سنجیدگی سے مسکرائی۔ اس نے ایک کش لگاتے ہوئے دھواں ہوا کے سپرد کیا اور ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا سامنے راوی بہہ رہا تھا۔

"تمہیں بہروز ملک کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔" بالآخر اس نے وہ کہہ دیا تھا جو وہ کب سے کہنے کی کوشش کررہا تھا۔ نازنین کے چہرے کی رنگت یک

لخت بدل چکی تھی۔

"تم نے مجھے کہا تھا تمہارا دوست کسی لڑکی کو لفٹ نہیں کرواتا اور اس کے ساتھ یہ چند روزہ فلرٹ جسٹ ایک ایڈونچر تھا اور کچھ بھی نہیں۔"

"یہ ایڈونچر نہیں تھا۔" شیراز نے اس کی بات رد کی۔

"تو؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"یہ ایک منصوبہ تھا۔" وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا اور پھر اسے شروع سے آخر تک تمام تر حقیقت بتا دی۔ یہ بھی کہ وہ اس وقت موقع واردات پر وہاں پر موجود تھا اور میر بخت کو جو گولی لگی تھی وہ بہروز ملک نے نہیں اس نے چلائی تھی۔

"شیراز۔" وہ سراسیمہ سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"ہاں اور اب اگر تم نے اس کے خلاف گواہی نہیں دی تو ہو سکتا ہے انویسٹی گیشن کی زد میں پولیس اصل مجرم کا سراغ لگا لے۔

کیا تم مجھے مرتا ہوا دیکھ سکتی ہو۔" اور وہ شیراز احمد کو اپنی زندگی میں کبھی مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

عدالت میں اس نے بہروز ملک کے خلاف گواہی دے دی تھی۔ تمام ثبوتوں اور گواہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی اور آج گیارہ سال بعد تقدیر اسے دوبارہ اسی مقام پر لے آئی تھی۔ لیکن آج دوسری جانب بہروز ملک نہیں اس کی بیٹی تھی۔

"ایک گھنٹہ۔" اس نے گھبرا کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ ایک گھنٹے کی مہلت میں سے پینتالیس منٹ کم ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کر بے کلی سے کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ وہ چہرے دماغ کی اسکرین پر روشن ہو کر پھر معدوم ہو جاتے تھے۔ سیڑھیوں کی جانب سے آہٹ ابھری تھی۔ اس نے کھڑکی میں آ کر جھانکا وہ لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"تاوان میں تمہیں اپنے شوہر کو قتل کرنا ہو گا۔" الماری سے ریوالور نکالنے کے بعد۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے آخری مرتبہ جذبوں کی شدت کو آزمانا چاہا تھا۔

"تم شیراز اور زینی میں سے کس کو زیادہ چاہتی ہو۔" اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔

"ایک گھنٹے بعد تمہیں تمہاری بیٹی کے ٹکڑے بوری میں ڈال کر پارسل کر دیے جائیں گے۔" ریوالور پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔

"اب مجھ میں انسانیت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی بہتر ہو گا تم میری درندگی اور حیوانیت کا مظاہرہ نہ دیکھو۔" دروازہ کھلا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش سا وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اپنی بیٹی واپس چاہیے۔" بے رحم لہجہ وہ آج بھی شیراز احمد کو اپنے سامنے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے اس پر گولی چلانے سے قبل اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں پھر اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے اور اگلے ہی پل گھٹنوں کے بل زمین پر جھکتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد دوبارہ کال آئی تھی۔

"مجھے تمہارے لیے جھوٹی گواہی دینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمہارے گھر کے تمام ملازم تمہارے گناہ کے گواہ ہیں اور جانتی ہو میں بھی گیارہ برس تڑپا ہوں اپنی بیٹی کے لیے۔ اب تمہاری باری ہے ہو سکتا ہے حکومت تمہارے اچھے برتاؤ اور حسن سلوک کی وجہ سے باقی کے تین سال کی سزا معاف کر دے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی بیٹی کو آ کر لے جانا۔" فون بند کرنے کے بعد وہ پرسکون سا اپنے اپارٹمنٹ کی سمت چل پڑا تھا۔

شازیہ جمال نیر

اسلام آباد کا سہ روزہ بزنس ٹرپ اس کی توقع سے زیادہ شاندار رہا تھا وہ ایک گہری اطمینان بھری سانس فضا کے سپرد کرتا آفس سے باہر نکل آیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے موبائل اٹھا کر ان باکس کھولا۔ اس کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی کہ رخ کے ساتھ ٹیکسٹ چیٹنگ کرتے وقت اس کے میسجز پڑھنے کے بعد ڈیلیٹ کرنے کی بجائے ان باکس میں رہنے دیتا بعدازاں پڑھتے ہوئے میسجز دوبارہ انجوائے کرکے ڈیلیٹ کردیتا۔

"تمہارا گلا خراب ہے کوک مت پینا۔" اسلام آباد پہنچنے کے فوراً بعد اس کا پہلا ٹیکسٹ موصول ہوا تھا۔

"پیکنگ کرتے وقت تم آف وائٹ شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی رکھنا بھول گئے تھے تم اس شرٹ کے ساتھ گرے ٹائی باندھنا بہت سوٹ کرے گی۔"

دوسرے روز میٹنگ میں جانے کے لیے تیار ہوتے اس نے آف وائٹ شرٹ کے ساتھ گرے ٹائی باندھ لی تھی۔

"راستے میں کچھ مت کھانا۔ میں تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے چکن پلاؤ پکا رہی ہوں۔ مل کر لنچ کریں گے۔" صبح نو بجے موصول ہونے والے اس پیغام کو اس نے دوبارہ پڑھا تھا اور ڈیلیٹ کیے بغیر موبائل ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ بہت مگن انداز میں ڈرائیو کررہا تھا۔

اسی اثنا میں ڈیش بورڈ پر پڑا موبائل گنگنا اٹھا۔ گھر کے نمبر سے کال آرہی تھی۔ اس نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کال اوکے کرکے موبائل کان سے لگالیا۔ دھیان سارا ڈرائیونگ کی طرف تھا۔

"ہیلو...!" اس کی آواز سنتے ہی دوسری طرف برکت بوا رونے لگی تھیں۔

"بوا! کیا ہوا ہے؟" اس کا دل کسی انہونی کے احساس سے لرزا تھا۔

"ماہ رخ... ہماری ماہ رخ بیٹا کو..." اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔

"کیا ہوا ہے رخ کو؟" اس کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ دوسری طرف بوا زاروقطار روئے چلی جارہی تھیں۔

"فار گاڈ سیک بوا! مجھے بتائیں کیا ہوا ہے رخ کو؟" وہ وحشت زدہ ہوکر چلایا تھا۔

"بریک ڈاؤن... نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اسپتال لے کر گئے ہیں۔ وہ ٹھیک نہیں ہے ماہ رخ بیٹا ٹھیک نہیں ہے۔" اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک بری طرح پسینے میں نہا گیا۔ اس نے زندگی میں اتنی تیز ڈرائیونگ کبھی نہیں کی تھی۔ کتنے سگنل توڑے' کتنی بار ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا' کتنی بار لوگوں کے منہ سے چیخیں بلند ہوئیں اسے کچھ خبر نہ تھی۔

اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی پارک کرنے کے بعد اندھادھند بھاگتے ہوئے اس نے درمیانی فاصلہ طے کیا تھا۔

"مما...!" ویٹنگ روم کے بینچ پر مما ساکت بیٹھی تھیں۔

"مما! مجھے اپنی رخ چاہیے۔ بالکل ویسی جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔ صحیح سلامت! اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" وہ لمبا چوڑا بھرپور مرد مما کی گود میں منہ چھپائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر جہاں زیب کے قدم ان کے قریب آن ٹھہرے۔ وہ بابا کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ اس نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر ان کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا اٹھ کر کھڑا ہونے میں بہت مشکل پیش آئی تھی اسے۔

"سخت ذہنی صدمہ پہنچا ہے اسے۔ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ دعا کریں ان بارہ گھنٹوں میں اسے ہوش آجائے ورنہ کچھ بھی غیر متوقع ہو سکتا ہے۔" کچھ الفاظ کتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ ننگی تلوار جیسے! روح کو گھائل کرتے۔

"جہاں زیب انکل! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ابھی ممکن نہیں ہے۔"

"پلیز انکل!"

"بیٹا! اس کی کنڈیشن۔"

"انکل! صرف ایک بار۔"

"اوکے!"

میری زندگی کے بدترین لمحات میں سے ایک تمہیں اس حالت میں دیکھنا ہے۔ سفید چادر اوڑھے، بے خبر زرد چہرے پر پلکیں موندے یہ وہ والی رخ تو نہیں تھی جسے وہ ہمیشہ سے دیکھ دیکھ کر جیتا آیا تھا۔

"رخ! آنکھیں کھولو!" اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"ایک بار آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو رخ! صرف ایک بار۔" اس کے لب خاموش تھے۔

"تم نے کہا تھا کچھ مت کھانا ہم ایک ساتھ لنچ کریں گے۔ دیکھو تم نے کھانے سے منع کیا تھا میں نے تو پانی تک نہیں پیا۔ میں صبح سے بھوکا ہوں۔" اس کی آنکھ سے پہلا آنسو ٹوٹ کر گرا اور اسی وقت رخ نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے محمد خان کا دوسرا آنسو نہیں گرنے دیا تھا۔

"محبت کیا ہے رخ؟"

"محمد خان کی مسکراہٹ!"

"اور زندگی؟"

"محمد خان کی آنکھیں!"

"اور کائنات؟"

"محمد خان کی ذات!"

پوری کائنات آنکھوں میں سمیٹے اس نے پلکوں کا پردہ گرا دیا تھا۔

ڈاکٹر متحرک ہو گئے۔ اس کے کندھے پر ڈاکٹر جہاں زیب کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھا تھا۔ وہ آہستگی سے چلتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

ماہ رخ نے ایک نظر منہ پر دوپٹا رکھے اونگھتی برکت بوا کو دیکھا اور پاؤں میں چپل اڑستی چپکے سے باہر نکل آئی۔ اس گھر میں آئے اسے پورے چار دن ہو گئے تھے اور یہ چار دن اس نے بوا کے ساتھ اس کمرے میں ہی گزار دیے۔ تینوں وقت کا کھانا، دودھ، پھل، جوس وغیرہ سب اسے کمرے میں مہیا کیے جا رہے تھے۔ انتہائی قیمتی ساز و سامان سے مزین یہ کشادہ کمرہ خاص طور پر اس کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔ وال ٹو وال دبیز کارپٹ، گلاس ونڈو کے سامنے سنہری ڈوری سے بندھے نفیس پردے، بیش قیمت گل دانوں میں مہکتے خوب صورت پھول، نرم و گداز کشنوں سے سجا لکڑی کا منقش جھولا! غرض اس کی عمر کے حساب سے اس کے ذہن و دل پر خوش گوار تاثر چھوڑتا بھرپور ماحول اسی کمرے میں سمویا گیا تھا۔

بابا اور بوا کے اصرار کے باوجود وہ خود کو اس کمرے سے باہر جانے پر آمادہ نہیں کر پائی تھی۔ اس کی ذہنی اور قلبی حالت کو دیکھتے ہوئے بابا نے مزید فورس کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بوا تو تھیں ہی اس کی رضا میں راضی ہو جانے والی!

یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اب کھانے پینے کے معاملے میں انہیں زیادہ پریشان نہیں کر رہی تھی۔ رات میں اس کی پلکیں لمحہ بھر کے لیے آپس میں جڑتیں اور نیم غنودگی کی سی کیفیت میں کروٹ بدلتے اس کے لبوں سے سسکاری نکلتی۔ "اماں" اس کے ساتھ نیم دراز بوا اپنی پلکوں کی منڈیر پر بیٹھے نیند کے پنچھی کو پھر سے اڑا کر زیر لب دعائیں پڑھتی اس پر پھونکنے لگتیں اور ساری رات اسی سوتی جاگتی کیفیت میں گزر جاتی۔ صبح کی نماز و تسبیحات سے فارغ ہو کر بوا کی بوجھل پلکوں نے کھلنے سے انکار کیا تو وہ منہ پر دوپٹا رکھے اونگھنے لگیں۔ (لاشعوری طور پر نیند میں ڈوبا ذہن اب بھی اپنے پہلو میں سوئی دس سالہ ماہ رخ میں اٹکا ہوا تھا)

احتیاط سے دروازہ بند کرنے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بغیر سمت کا تعین کیے آگے بڑھی۔

جب اماں ستاروں بھرے آسمان تلے اسے اپنے ساتھ لپٹا کر شہزادی گل جبیں اور اس کے شاہی محل کی کہانی سناتیں تو وہ سوچتی دنیا کی سب سے خوب صورت جگہ شہزادی گل جبیں کا محل ہو گا۔ وہ تصور میں ہی کئی بار خود کو اس محل میں گھومتا پھرتا دیکھ چکی تھی۔ لیکن اماں کی وفات کے سترہ روز بعد بابا کی شہروالی کوٹھی میں پہلا قدم رکھتے ہی اسے لگا جیسے وہ واقعی شہزادی گل جبیں کے شیش محل میں آگئی ہو۔ تب اس پر شکوہ کوٹھی کو نظر اٹھا کر دیکھنے کے بعد اماں کی دائمی جدائی کے صدمے سے بے حال وہ بوا کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے نظریں جھکا کر ماربل کے چمکتے فرش میں اپنا عکس دیکھتی گزر گئی تھی۔ دوسرے دن بابا نے کہا۔

"آؤ ماہ رخ! تمہیں تمہارا گھر دکھاؤں۔" لیکن وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بے آواز روتی رہی۔ بابا مزید اصرار ترک کر کے اسے پیار کرتے بوا کو اس کا ڈھیر سارا خیال رکھنے کی تاکید کرنے کے بعد باہر چلے گئے تھے ان چار دنوں میں بوا ابھی وقتاً "فوقتاً" اسے باہر کھلی فضا میں سانس لینے گھوم پھر کر گھر دیکھنے پر آمادہ کرتی رہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی بیٹھی رہی۔ اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا لیکن آج الٹی سیدھی سوچوں میں الجھتے دل کی گھبراہٹ سوا ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ ماربل کے چکنے فرش پر پاؤں جما جما کر چلنے کے باوجود اسے اچھی خاصی دقت ہوئی تو سلیپر اتار کر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ راہداری میں سے گزرتے اس نے یونہی ایک دروازے کو ہلکا سا پش کیا تو وہ پوری طرح کھل گیا۔

کمپیوٹر کے سامنے کام میں مصروف گہری کالی آنکھوں والے خوبرو لڑکے نے گردن موڑ کر قدرے حیرت اور ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ ماہ رخ بری طرح گڑبڑاتے ہوئے واپس مڑی اور پورا زور لگا کے دروازہ کھینچا جو زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ بند ہوا تھا۔

"اف! نجانے کون تھا وہ؟ اور میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ اس کی آنکھوں میں کتنا غصہ تھا جیسے مجھے۔" اس نے تقریباً "بھاگتے ہوئے راہداری طے کی تھی۔ آخری سرے پر پہنچتے ہوئے یونہی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔ ماہ رخ بری طرح سٹپٹاتی گول زینے کی جانب بڑھ گئی۔ دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھنے کے باوجود اسے لگ رہا تھا وہ

یقیناً" اس کے تعاقب میں آرہا ہے۔ اب کی بار وہ بنا مڑ کر دیکھے سامنے آنے والا پہلا دروازہ کھول کر جلدی سے اندر گھس گئی اور پہلے والی غلطی دہرانے کی بجائے احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔

"ہاہ! اتنا ڈھیر سارا گلابی پن!" اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیل گئیں۔ بیڈ شیٹ' کارپٹ' پردے' کشن کور' گدے وغیرہ سب ہلکے گلابی رنگ کے تھے تب ہی اس کی نگاہ بیڈ پر سوئے بچے پر پڑی تھی۔ وہ آہستگی سے قدم اٹھاتی بیڈ کے قریب آگئی۔ گلابی کاٹن کے ہلکے پھلکے کپڑوں میں معصوم فرشتہ محو خواب تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ تب اسے یاد آیا دو ماہ پہلے ہی تو اماں نے اسے بتایا تھا کہ بابا نے شہر میں دوسری شادی کرلی ہے۔ نئی امی اپنے ساتھ منا بھی لائی تھیں تو اماں اس گلابی گڈے کی بات کر رہی تھیں۔ گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی وہ مبہوت سی اس کا ایک ایک نقش دیکھتی رہی۔

اس کے گلابی نیم وا ہونٹ' نرم پھولے پھولے رخسار' آپس میں جڑی گھنی پلکیں! بے اختیار اس کا دل چاہا وہ اسے اتنا پیار کرے اتنا پیار کرے کہ بس اسے اپنے دل میں اس روئی کے گالوں جیسے بچے کے لیے محبت کے سوتے پھوٹتے محسوس ہوئے نجانے کتنا وقت بیت گیا وہ دیوانوں کی طرح اس کے ایک ایک نقش کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتی رہی۔ پھر قدرے آگے کو ہو کر اس کے ننھے منے گلابی پیروں پر اپنے لب رکھ دیے۔

"میرا چاند!" اسی پل دروازہ ہلکی سی چرر کے ساتھ کھلا تھا اور کوئی دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔ نو وارد نے خاصے اچنبھے سے اسے دیکھا اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوا۔

"چھوٹی بی بی! آپ..." ساجدہ کے لبوں سے نکلا تھا۔

"چھوٹی بی بی؟" اوہ اسے یاد آیا یہاں کے سب ملازم اسے چھوٹی بی بی کہہ کر پکار رہے تھے۔ یعنی کہ سامنے کھڑی وہ نوجوان سانولی لڑکی ایک ملازمہ تھی۔ زور زور سے دھڑکتے دل کی دھڑکن معمول پر آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

"میں محمد خان کی خاص ملازمہ ہوں جی! بڑی بی بی نے ان کی ساری ذمہ داری مجھے سونپی ہوئی ہے۔"

"محمد خان!" ماہ رخ نے زیر لب دہرایا اسے لگا اس کا منہ مٹھاس سے بھر گیا ہو۔

"آج یہ دودھ پیے بغیر ہی سو گیا اور اب تو اس کے سیریلک کھانے کا وقت بھی ہو رہا ہے۔" ساجدہ تشویش سے کہتی آگے بڑھ آئی تھی۔ ماہ رخ نے نظر بھر کے اسے دیکھا اور باہر آگئی۔

☼ ☼ ☼

سترہ روز پہلے اس کی زندگی شفاف ندی کی مانند رواں دواں تھی۔ کہیں کوئی بھنور' کوئی گرداب کچھ نہیں تھا۔ وہ ہیلتھ منسٹر سکندر علی کی اکلوتی اولاد تھی۔ سکندر علی کو خود سے دس سال بڑی اپنی سادہ لوح بیوی زینت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان کا دل تو نیلم مرزا کا اسیر تھا۔ بے حد خوب صورت اور طرح دار نیلم مرزا مشہور فیشن ڈیزائنر ہونے کے ساتھ چین آف بوتیکس نہایت کامیابی سے چلا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان شناسائی کے بعد زبردست انڈر اسٹینڈنگ مضبوط دوستی کا شاخسانہ ثابت ہوئی تھی۔

خوشبو میں بسی نیلم مرزا کو اپنے دل کے ساتھ ساتھ گھر میں بسانے کی شدید ترین خواہش کے باوجود وہ ماں کی خوشی کے لیے زینت سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اماں کی یتیم بھانجی زینت ان کے بچپن کی منگیتر تھی ان کے ہاں اگر کسی لڑکی کی بچپن کی منگنی کسی بھی وجہ سے ٹوٹ جاتی تو وہ لڑکی بنا کسی جرم بے چاری عمر ماں باپ کی دہلیز پر کنواری بیٹھی رہ جاتی کوئی اور اس "داغدار" لڑکی کو بیاہنے نہ آتا۔ دور جدید میں رائج زمانہ جاہلیت کے رسم و رواج! دل کی خواہش نہ سہی لیکن سکندر علی اس گناہ کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مزید یہ وہ ماں کا وقار گھٹانا یا ان کو ناراض کرنا بھی کسی طور گوارا نہ تھا۔ نیلم مرزا کے ساتھ انہوں نے

لمبے چوڑے عہد و پیمان نہیں باندھے تھے' ساتھ نبھانے کی قسمیں نہیں کھائی تھیں۔ دونوں کے مابین ایک خاموش معاہدہ تھا جو اسی خاموشی سے ٹوٹ بھی گیا۔ (یہ ان کا خیال تھا)

زینت بحیثیت عورت اپنے محبوب شوہر کے دل کے راز کو بہت جلد پا گئی تھی۔ لیکن ایک وفا شعار اور خدمت گزار بیوی کی حیثیت سے اس نے کبھی جتلانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنے اور سکندر علی کے درمیان عمر' تعلیم' شکل و صورت کے فرق کو بخوبی سمجھتی تھی۔ اسے آسمان اور خود کو زمین گردانتی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ سکندر علی نے اسے اپنے نام کی چادر اوڑھا کر اپنی اور دنیا والوں کی نظر میں معتبر کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ کی نہ اسے چاہ تھی اور نہ لالچ شادی کے تین سال بعد وہ سکندر علی کو ایک بیٹی کا تحفہ دے کر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئی تھی۔

اپنے عظیم نقصان سے بے خبر کاٹ میں لیٹی معصوم پوتی کو دیکھ کر نتھون خانم کا دل پچھاڑیں کھانے لگا تھا۔ کسمساتی' بھوک کے لیے بے چین ہوتی ماہ رخ کو سینے سے لگاتے ہوئے انہوں نے خود سے عہد کیا کہ اپنی بھرپور توجہ اور محبت اس پر لٹاتے ہوئے وہ اسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیں گی اور جو عہد کیا سو نبھایا۔ ماہ رخ کے ذہن میں کبھی اپنی حقیقی ماں کی شبیہ نہیں لہرائی تھی۔ اس کی کل کائنات "اماں" (دادی) ہی تھیں۔

زینت کی وفات کے بعد سکندر علی انہیں اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتے تھے۔ وہاں ان کا ذاتی گھر' بزنس وغیرہ تھا۔ اپنی ڈھیروں مصروفیات میں گھرے رہنے کے باوجود ان کا ذہن لاشعوری طور پر ان میں اٹکا رہتا۔ نتیجتاً وہ ٹھیک طرح سے اپنے کام پر توجہ مرکوز نہ کر پاتے۔ لیکن نتھون خانم کے لیے اپنے گھر کو چھوڑنا مشکل تھا جس کے کونے کونے سے ان کی یادیں وابستہ تھیں۔

"بیٹا! دنیا میں تو میری جان ہے سکندر علی! یہ نظروں سے اوجھل ہو تو ہمیں سانس لینا دشوار' اس کی تعلیم و

تربیت کے حوالے سے فکر مند مت ہو۔ تمہاری طرح یہ بھی اسی کچے آنگن میں کھیلے گی' اسی پرائمری اسکول میں جامن کے پیڑ تلے ٹاٹ پر بیٹھ کر سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کر تختیاں لکھے گی۔ تصنع و بناوٹ سے پاک صاف ستھرے ماحول میں سانس لے گی۔ میں اپنا خون پسینہ ایک کرکے اسے کندن بناؤں گی۔ انگریزی اسکول اور ڈبوں میں بند خوراک کھانے والے بچوں سے زیادہ قابل نکلے گی تیری بیٹی۔ جس دن یہ آنکھیں بند ہوں بے شک اسی دن اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانا لیکن ابھی نہیں' ابھی دل جدائی کا بوجھ سہارنے پر آمادہ نہیں۔" اس بار بھی سکندر علی نے ان سے ان کی صحت اور ماہ رخ کی تعلیم کے حوالے سے تشویش کا اظہار کرتے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو اماں بی رو پڑی تھیں۔ سکندر علی دوبارہ یہ مطالبہ اپنی زبان پر نہ لا سکے۔

☼ ☼ ☼

اس بار ساون کچھ خفا خفا سا تھا۔ مشرق کی اور سے بادلوں کا ایک قافلہ سا امڈا چلا آتا لیکن دوسرے ہی لمحے ہوا کا کوئی جھونکا انہیں اڑائے دور لے جاتا۔ جلتی بلکتی بوندوں کو ترستی زمین اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔

"یہ بادل برس کیوں نہیں جاتے آخر؟ کتنا پانی بھرا ہے ان کے اندر' لیکن کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھالے بس اڑے چلے جارہے ہیں۔"

اس نے کوفت زدہ انداز میں سر اٹھا کر آسمان کو تکا تھا۔ بادلوں میں گھرے سورج نے تھوڑا سا پردہ کھسکا کر اس کے جھنجلائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے خود کو دانستہ بادلوں میں چھپالیا۔

آسمان سے ایک بوند ٹوٹ کر گری اور پھر لاتعداد بوندوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھما چھم بارش برسنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلائے اوپر چہرہ اٹھائے خوشی سے نہال ہوتی پانی میں چھپا چھپ کرتی رہی۔

"اب بس کر بیٹا رانی! بہت تیز بارش ہے بیمار پڑ جاؤ گی۔" برآمدے میں کھڑی اماں اسے آوازیں دیتی ہلکان ہوتی رہیں۔

"مت روکو زیتون! ابھی تو دن ہیں اس کے کھیلنے کودنے کے۔" پکوڑے تلتی بوا نے کھڑکی کی سلاخوں کے پار محبت سے اسے دیکھا تھا۔

وہ جامنوں سے بھری ٹوکری اٹھائے اندر کو بھاگ گئی۔ برآمدے میں اس کے ننگے گیلے پیروں کے نشان چھپتے چلے گئے تھے۔ اماں نے زبردستی کپڑے بدلوائے' بوا نے بیسن کا حلوہ' پکوڑے اور بھاپ اڑاتا دودھ پتی کا مگ سامنے لا رکھا۔ باہر بارش اب رک رہی تھی۔ اس نے متشکرانہ نگاہوں سے اوپر آسمان کو دیکھا اور جی بھر کے پکوڑوں پر ہاتھ صاف کرنے لگی۔ شام ڈھلی تو اماں کو بخار نے آلیا۔

"بولا مجھے منع کررہی تھیں بارش میں مت نہاؤ اور خود بنا بھیگے بیمار پڑ گئی ہیں۔" اپنے ہاتھوں سے ان کا سر دباتی وہ شرارت سے کہہ رہی تھی لیکن رات تک بخار مزید زور پکڑ گیا۔ اماں بے چینی سے سر پٹخنے لگیں' بوا ادھر ادھر پھرتی کراہیں' بوا کے تلوؤں سے جان نکلنے لگی۔ شکور ڈاکٹر کو لینے بھاگا' بوا نے سکندر علی کو فون کھڑکایا۔ لیکن تب تک دیر ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر اور سکندر علی آگے پیچھے داخل ہوئے تھے۔

"بوا! اماں آنکھیں نہیں کھول رہیں۔" ماہ رخ چلائی تھی۔ بوا کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

"اماں!" اس کی دلدوز چیخوں نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ کہتی تھی اگر اماں کو کچھ ہوا تو میں مرجاؤں گی۔ اب اماں مرگئی تھیں لیکن اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ سکندر علی اسے اور بوا کو اپنے ساتھ شہر لے جارہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے شکور کو دوسرے ملازم لڑکوں کے ساتھ سارا سامان اٹھا کر بڑے کمرے اور اسٹور میں رکھتا دیکھتی رہی۔ اماں کا تخت' مونڈھے' چوکیاں' پاندان' ان کے گاؤ تکیے' زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے سمٹتی جارہی تھی۔

جانے سے پہلے وہ اپنے پیارے گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر خوب روئی تھی۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر بوا کے ساتھ بیٹھی وہ شیشے سے ناک چپکائے برستی آنکھوں سے اپنے گھر کو لمحہ بہ لمحہ خود سے دور ہوتا دیکھتی رہی۔

سکندر علی نے بہت دکھ سے اپنی بیٹی کو دیکھا تھا۔ اس نے آج دوسری بار اپنی ماں کو کھویا تھا۔

"نیلم کالنگ!" موبائل کی اسکرین پر انہوں نے آہستگی سے آن کا بٹن دبایا اور موبائل کان سے لگالیا۔

"سکندر؟" فکر مند لہجہ تشویش لیے ہوئے تھا۔

"راستے میں ہوں ابھی۔ گھر آکر تسلی سے بات کرتے ہیں۔" سنجیدگی سے کہتے رابطہ منقطع کرنے کے بعد انہوں نے موبائل ڈیش بورڈ پر ڈال دیا تھا۔

نیلم مرزا ایک بار پھر بہت چپکے سے ان کی زندگی میں داخل ہوگئی تھی۔ سکندر کی شادی کی خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ غم و غصے نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کرلیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ملک جہانزیب کے ساتھ شادی ہرگز نہ کرتی۔ ملک جہانزیب! جس کے پاس دولت کی ریل پیل تھی لیکن وہ ہرگز اچھا انسان نہیں تھا۔ نیلم نے اس کے ساتھ شادی "انتقاماً" کی تھی۔ معلوم نہیں وہ یہ انتقام کس سے لینا چاہتی تھی۔

وہ ایک چھت تلے رہنے والے دو ایسے اجنبی تھے جن کے درمیان شناسائی کا احساس محمد خان کے وجود نے پیدا کیا تھا۔ یہ ایک لمحاتی احساس تھا جو اگلے چند لمحوں میں ہی فنا ہوگیا۔ جس دن اسے ملک جہانزیب کی کار ایکسیڈنٹ میں موقع پر ہی وفات پانے کی اطلاع ملی وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ انسان لاکھ تاویلیں گھڑے' جواز تراشے' حکمت عملی مرتب کرے۔ تقدیر کے ایک وار کے سامنے سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

انتہائی پر اعتماد' ہمیشہ سر اٹھا کر چلنے والی نیلم مرزا' سکندر کے سامنے سر جھکائے پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ سارا ملال' احساس زیاں آنسوؤں کی صورت بہہ نکلا اور فیصلے کی گھڑی نے اپنا وجود منوالیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نئی امی" کا نام سنتے ہی اس کے تصور میں کامی کی سوتیلی ماں کا سراپا در آتا۔ چمکتے شوخ کپڑوں میں ملبوس' نقلی گھٹیا زیورات پہنے' ڈھیر سارا میک اپ تھوپے بھاری بھرکم وجود والی شبانہ خالہ!

جو نہ تو کامی کو ٹھیک طرح سے کھانے دیتی اور نہ ہی کھیلنے۔ الٹا کامی کے ابا سے اس کی الٹی سیدھی شکایتیں لگا کر پٹائی لگواتی رہتی۔ جب وہ بات بات پر کامی کو گالیاں دیتی تب اس کا دل چاہتا اس کے سرخ ہونٹوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روک دے۔ لیکن ایسا صرف وہ سوچ ہی سکتی تھی۔ بے چارہ کامی!

سنہری بارڈر والی ہلکی گلابی ساڑھی پہنے اٹھی ہوئی گردن والی بے حد خوب صورت "نئی امی" کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ بالوں کا جوڑا بنائے' ساڑھی کی ہم رنگ نفیس سی جیولری پہنے وہ اسے دنیا کی سب سے خوب صورت عورت لگی تھیں۔

"نئی امی" بے ساختہ اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔ سکندر ہنسے تھے۔

"یہ تمہاری مما ہیں بیٹا!"

"آف کورس بیٹا! آپ مجھے بلا جھجک مما کہہ سکتی ہو کیونکہ میں نہیں چاہتی مجھے "نئی امی" کہنے کے نتیجے میں محمد خان انہیں "نئے ابو" کہے۔"

ہنستے ہوئے تو وہ اور بھی پیاری لگ رہی تھیں۔ ماہ رخ نے جھینپ کر اپنا سر جھکا دیا پھر جب تک وہ ان کے سامنے کھڑی رہی اس کی نگاہیں سلور سینڈل میں دمکتے ان کے پیروں پر بھٹکتی رہیں۔

رات کو اماں وزیراں اسے کھانے کے لیے بلانے آئیں تو وہ محمد خان کو دیکھنے کے خیال سے ڈائننگ ٹیبل پر چلی آئی۔ اتنے چھوٹے بچے کی ڈائننگ ٹیبل پر موجودگی تو کہ ممکن نہیں تھی۔ لیکن اس کے لاشعور میں کہیں یہ خیال موجود تھا کہ ہو سکتا ہے مما اسے گود میں بٹھا کر کچھ کھلاتی ہوں۔

لیکن ڈائننگ ہال میں پہنچتے ہی اس کی خام خیالی دور ہوگئی۔ مما کی گود میں محمد خان تو نہ ملا البتہ ایک دھچکا ضرور ملا تھا۔

"برکت بوا!" مما بتا رہی تھیں ان کے ہاں اپنے خاص ملازموں کو ان کی خدمات کے عوض پرکشش تنخواہ اور مراعات دینے کے ساتھ اپنے اور ان کے بیچ "مناسب فاصلہ" ضرور رکھا جاتا ہے۔ ماہ رخ کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

وہ برکت بوا کو ملازمہ کب سمجھتی تھیں؟ اس نے تو ہمیشہ انہیں اماں کے ساتھ گھر کے فرد کی طرح ہر معاملے میں پیش پیش دیکھا تھا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو جمع ہوتے گئے۔ وہ سر جھکائے آنسو پیتی تقریباً اپنی پلیٹ پر جھک گئی تھی۔

نوالہ حلق میں پھنسا تو اس نے جلدی سے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ پھر مزید کھانا کھانے سے معذرت کرتی باہر نکل آئی۔ اس کی متلاشی نگاہیں برکت بوا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ اسے اماں وزیراں کو ساتھ باتیں کرتی نظر آگئیں۔

"بوا۔" وہ بھاگ کر ان کی گود میں منہ چھپائے رونے لگی تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگا بوا! مجھے اچھا نہیں لگا آپ کے بغیر۔"

وہ نم آنکھوں سے اس کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

"جھلی ہو تم تو بالکل! اصلی عزت تو دل میں ہوتی ہے اور ہم نے اپنی بٹیا کا دل کھول کر پڑھا ہوا ہے۔ ہمیں یہ اوپری اوپری عزت اور محبت چاہیے بھی نہیں۔"

☼ ☼ ☼

رات دیر تک بوا کے ساتھ اماں کی باتیں کرنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ تاخیر سے کھلی تھی۔

ساجدہ! محمد خان کو تیار کردو۔ آج اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔"

ادھ کھلے دروازے کے پاس سے گزرتی مما کی آواز اس تک پہنچی تھی۔ اس کے نیم خوابیدہ احساسات یکایک بےدار ہوئے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ پھر جب تک وہ جلدی سے منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر بھاگتے ہوئے باہر نکلی تب تک سیاہ چمکتی کار سرخ روش پہ پھسلتی باہر نکل گئی تھی۔

بے چینی کے مارے اس کا برا حال ہونے لگا۔ کس سے پوچھوں کون بتائے گا کہ اسے کیا تکلیف ہوئی ہے؟ اس کی تکلیف کا سوچ کر اسے خود اپنے اندر کہیں تکلیف ہونے لگی تھی۔ یونہی پریشان خیالی میں چلتے وہ اندھا دھند کسی سے جا ٹکرائی تھی۔

"اف!" آنکھوں کے سامنے جیسے مرے سے ناچ اٹھے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گہری کالی آنکھوں والا خوبرو نوجوان ایک بار پھر اسے گھور رہا تھا۔

"کیا تمہارے حواس ہمیشہ یونہی اڑے سے رہتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ!"

"ایک بات ہاں، نہیں یا وہ؟"

"نہیں!" ماہ رخ نے تیزی سے کہا تھا۔

"اوکے! پھر کیا اندھے پن کی پریکٹس کررہی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ اصل میں!" وہ پھر گڑبڑائی تھی۔

"ایک بات نہیں، وہ یا اصل میں؟"

"اصل میں!" بنا سانس لیے وہ سرعت سے بول اٹھی۔

"اصل میں مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے مما محمد خان کو اسپتال کیوں لے کر گئی ہیں؟ کیا ہوا ہے اسے؟"

اب کی بار اس نے ذرا غور سے اس کے پریشان چہرے کو دیکھا تھا۔

"ماہانہ چیک اپ کروانا ہوتا ہے اس کا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" اسے اپنے دل سے غبار چھٹتا محسوس ہوا۔

"میرے اور تمہارے درمیان مذاق کا رشتہ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اصل میں۔۔۔ کچھ نہیں!"

"ایک بات نہیں، اصل میں یا کچھ نہیں؟" اپنی عادت کے برخلاف اسے اس کو چڑانے میں لطف آرہا تھا۔

"کچھ نہیں!" وہ تڑوتڑے پن سے کہتی واپس مڑ گئی۔ مجتبیٰ سر جھٹکتے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

پھر نجانے کتنا وقت بیت گیا۔ وہ یونہی جلے پیر کی بلی کی مانند چکراتی رہی۔ بوا نے دو ایک بار ٹوکا بھی لیکن وہ سنی ان سنی کرگئی۔ گیراج میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جو بلر سے ٹیک لگائے کھڑی شدت سے ان کی آمد کی منتظر تھی بھاگ کر اس طرف گئی۔ ساجدہ اکیلے اسے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔ مما اس کے ساتھ نہیں تھیں۔

"مما کہاں ہیں ساجدہ؟"

"بڑی بی بی کو کسی کام سے جانا تھا جی! وہ اسپتال سے ادھر چلی گئی تھیں میں ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔"

محمد خان کی آنکھیں آج بھی بند تھیں۔ نجانے وہ اتنا سوتا کیوں تھا؟ ماہ رخ نے پنجوں کے بل تھوڑا سا اچکتے ہوئے اس کی بند پلکوں پر آہستگی سے انگلی پھیری۔ ساجدہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔ جبکہ وہ اپنی شہادت کی انگلی کی پور پر اس کی پلکوں کا لمس محسوس کرتی مسرور سی اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔

☼ ☼ ☼
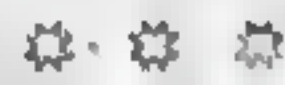
"گڈ مارننگ بیٹا!" صبح وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آئی تو اخبار کی شہ سرخیوں پر نظر دوڑاتے بابا نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے خیر مقدمی مسکراہٹ سے اسے دیکھا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتا شلوار میں بالوں کو طریقے سے کنگھی کیے وہ پہلے کی نسبت انہیں بہت فریش لگی تھی۔

اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر مجتبیٰ سر جھکائے ناشتا کرنے میں مگن تھا۔ اس کی آمد کو ذرا سی بھی اہمیت دیے بنا وہ پوری طرح اپنے ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔

وہ آہستگی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

بابا نے پہلے اس کے لیے سلائس پر جیم لگایا پھر جوس کا گلاس بھر کر سامنے رکھا۔ ناشتے کے معاملے میں وہ ہمیشہ اماں کے صبر کا امتحان لیتی تھی۔ وہ جتنی محبت سے ایک ایک چیز اٹھا کر اسے کھلانے پر مصر ہوتیں وہ اتنے ہی نخرے کیے جاتی۔ جب نخرے اٹھانے والے چلے جائیں تو سارے ناز نخرے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ سلائس اٹھا کر اس نے خاموشی سے کھانا شروع کردیا۔

"ڈونٹ وری ادریس صاحب! میں ابھی خود تھوڑی دیر بعد آپ سے رابطہ کرتی ہوں۔ بائے!" مما فون پر کسی سے بات کرتی اندر داخل ہوئی تھیں اور یونہی کھڑے کھڑے جگ سے جوس گلاس میں انڈیل کر لبوں سے لگالیا۔

"ڈھنگ سے ناشتا تو کرلو بیگم۔" بابا نے ٹوکا تھا۔

"اونہوں! بالکل بھی ٹائم نہیں ہے سکندر! میں نے آپ کو بتایا تھا ناکہ کسی بھی وقت سنگاپور کے سیمینار کے لیے التوا میں پڑا پروگرام فائنل ہوسکتا ہے۔ وہ تو شکر ہے ادریس صاحب نے میری ٹکٹ کنفرم کروالی تھی ورنہ اچھا خاصا مسئلہ ہوجاتا۔"

"فلائٹ کب ہے؟"

"تو گھنٹے بعد!"

"اور واپسی؟"

"کچھ کنفرم نہیں ہے۔ وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔" ماہ رخ اپنا ناشتا بھلائے بہت توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مما جوس ختم کرکے سب سے الوداعی کلمات کہتی تیزی سے باہر نکل گئی تھیں۔

"محمد خان بھی مما کے ساتھ چلا جائے گا۔" ڈھیر ساری اداسی اس کے اندر اترنے لگی۔

بابا مسکرائے تھے۔

"وہ ساتھ نہیں جارہا۔"

"پھر وہ مما کے بغیر کیسے رہے گا؟" اداسی کی جگہ فکر مندی نے لے لی۔

"ساجدہ ہے اسے سنبھالنے کے لیے!" بابا نے

www.paksociety.com

جواب دینے کے بعد مجتبیٰ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ جو اپنا ناشتا ختم کیے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بھئی مجتبیٰ! فری ہو آج؟"

"جی انکل! تقریباً"

"میں سوچ رہا تھا ماہ رخ کا کسی اچھے اسکول میں ایڈمیشن کروادیا جائے اب پہلے ہی اس کا کافی وقت ضائع ہوگیا ہے۔ آج مجھے اگر جرمنی سے آنے والے ڈیلی گیشن کو نہ بھگتانا ہوتا تو خود ہی یہ کام کرلیتا لیکن یار تم "سن رائز" کے احتشام منیر سے آج مل لو۔ ویسے تو میری اس سے بات ہوئی تھی اس سلسلے میں 'باقی تم خود سب دیکھ لینا۔ ماہ رخ تمہارے ساتھ جائے گی۔" اس کی ذات سے متعلق گفتگو ہورہی تھی سو کان کھڑے کیے پوری طرح ان دونوں کی طرف متوجہ تھی۔

"جی انکل! بہتر۔" پاپا کے اٹھنے کے بعد وہ بھی کرسی کھسکا تا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اور ہاں جب تک اس کے لیے کسی اچھے ٹیوٹر کا انتظام نہیں ہوجاتا تب تک مہربانی کرو اپنے سیکنڈ ٹائم میں سے کچھ وقت اس کے لیے بھی مختص کردو۔"

"جی بہتر!" وہ پشت پر ہاتھ باندھے مودب سا کھڑا تھا۔

"اوکے بیٹا! میں ڈرائیور سے کہتا ہوں گاڑی نکالے۔" شفقت سے ماہ رخ کا رخسار تھپتھپاتے وہ باہر نکل گئے تھے۔

"تیار ہوجاؤ تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔" ماہ رخ پر ایک نگاہ ڈالتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

بوا نے اسے بتایا تھا کہ مجتبیٰ ممّا کی بڑی بہن خدیجہ کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ کا انتقال تو اس کی پیدائش سے پہلے ہوگیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بریسٹ کینسر میں مبتلا خدیجہ نے بھی جان ہار دی تو ممّا اپنے بھانجے کو اپنے گھر لے آئی تھیں۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا۔ پھر سکندر نے بھی کھلے دل سے اس کا اپنے ہاں خیر مقدم کیا تھا۔ اسے بہترین تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائی اور گھر کے فرد کی سی حیثیت اور اہمیت دی۔

یہ سب جان کر اسے اپنے پاپا پر فخر محسوس ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ہاتھ سے چابی لے کر مجتبیٰ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

"آپ اتنی آہستہ سے گاڑی کیوں چلا رہے ہیں؟"

وہ جو بہت سنجیدگی سے سامنے نظر جمائے ڈرائیونگ میں مصروف تھا چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"بغیر اجازت کے پہلی بار گاڑی چلانے والوں کی یہی رفتار ہوتی ہے۔"

"آپ پاپا کی اجازت کے بغیر پہلی بار گاڑی چلا رہے ہیں۔" وہ تحیر سے بولی۔ مجتبیٰ نے سامنے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے۔ ماہ رخ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن وہ بنا اس کی جانب دیکھے ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"مجھے ڈرائیونگ کے دوران باتیں کرنا اور سننا پسند نہیں۔ اس لیے چپ کرکے بیٹھی رہو۔" ماہ رخ نے منہ بند کرلیا اور پھر باقی کا سارا وقت بند ہی رکھا۔ البتہ آنکھیں معمول سے قدرے زیادہ کھل گئیں۔ جدید طرز پر بنے اسکول کی شاندار عمارت' صاف ستھرا ماحول' نکھرے' تمیزدار بچے' کاریڈور سے گزرتی ٹپ ٹاپ خوبصورت استانیاں' اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا 8th کلاس میں ایڈمیشن ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بے چینی کے گہرے احساس نے اسے پٹ سے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا تھا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ کھانا کھا کے لمبی تان کر سوگئی تھی۔ اور نجانے کتنی دیر تک بے سدھ سوئی پڑی رہی۔

پوری آنکھیں کھولے' چھت کو گھورتی وہ چند ثانیوں کے لیے غیر معمولی پن کو کھوجتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کی سماعتوں سے بچے کی رونے کی آواز ٹکرائی تھی۔

"محمد خان رو رہا ہے؟" وہ سرعت سے پاؤں سلیپر میں اڑستی باہر کی جانب بھاگی۔ دھاڑ سے دروازہ کھلنے پر ساجدہ نے چونک کر اپنے عقب میں دیکھا تھا۔ محمد خان واقعی رو رہا تھا زور زور سے۔ ماہ رخ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ساجدہ اسے دودھ پلانے کی کوششوں میں ہلکان ہوئی جارہی تھی۔ لیکن وہ مسلسل روتے ہوئے فیڈر والے اس کے ہاتھ کو جھٹک رہا تھا۔

"فیڈر مجھے دے دو ساجدہ! میں اسے پلاتی ہوں۔"

ساجدہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا پھر بے بسی سے فیڈر اس کے ہاتھ میں تھماتی قدرے پیچھے ہوگئی۔

ماہ رخ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور محمد خان کے سر کو اپنے ایک گھٹنے پر رکھے دوسرے ہاتھ سے تھپکتی فیڈر پلانے لگی۔ حیرت انگیز طور پر اس کا لمس پاتے ہی محمد خان رونا چھوڑ کر دودھ پینے لگا۔

"میں ان آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دوں گی کبھی نہیں۔" ممّا اس سے بہت دور تھیں اور پاپا بہت مصروف اسے اپنے دل میں اس کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوا۔ دودھ ختم ہوا تو اس نے فیڈر حیرت زدہ کھڑی ساجدہ کو تھمادیا۔ جبکہ وہ اسے یونہی گود میں لیے اپنا گھٹنا ہلاتی اسے جھلاتی رہی۔ محمد خان خوش ہو کر کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ ساجدہ حیران ہوتا ترک کرکے باہر نکل گئی تھی۔ نجانے کتنا وقت بیت گیا وہ اس کے ساتھ مستیاں کرتی' اسے گدگداتی رہی۔

"مجتبیٰ صاحب اسٹڈی میں آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" ساجدہ کا پیغام سن کر وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

"ہائیں! آج تو پہلا دن تھا۔"

وہ سنجیدہ صورت لیے یقیناً اس کا منتظر تھا۔

مجھے وقت کی پابندی نہ کرنے والے اسٹوڈنٹس سخت برے لگتے ہیں۔" ایک سخت تنبیہی نظر ڈالی گئی۔

"پڑھائی کے دوران ادھر ادھر کی ہانکنا مجھے بالکل پسند نہیں۔" وہ اپنا بیگ ٹیبل پر رکھ کر اسے کھولنے لگی۔

"جو بھی سوال سمجھاؤں ایک ہی بار سمجھ لینا۔ دوسری بار نہیں سمجھاؤں گا۔"

اس نے ساری کتابیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

"ٹھیک ہے؟" وہ پڑھانے سے پہلے ٹیچر بنا اسے اپنے "سنہری اصول" یاد کروا رہا تھا۔

"اونہوں!" ماہ رخ نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بولی۔

"آپ مجھے ایک صفحے پر یہ سب لکھ دیں۔ ایسے تو میں بھول جاؤں گی۔"

مجتبیٰ نے خشمگیں نگاہوں سے اس کے جھکے سر کو گھورتے ایک کتاب اٹھا کر پڑھانا شروع کردیا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دن اس کے لیے ڈھیر ساری مصروفیات لائے تھے۔ ناشتا ادھورا رہ جاتا اور اسکول وین والا ہارن پہ ہاتھ رکھ کر اسے بھاگم بھاگ بیگ اٹھائے باہر لپکنے کو مجبور کردیتا۔ کچھ وہ ذہین تھی اور کچھ من پسند ماحول نے جی جان سے محنت کرنے پر اکسایا۔

اسکول سے واپسی پر کھانا کھاتے ہی نیند کی مہربان پری بانہیں وا کیے اپنی جانب بلاتی تو وہ بوجھل ہوتی پلکوں سے اس کا ہاتھ تھامے خوش رنگ وادیوں میں اتر جاتی۔ دو گھنٹے چٹکی میں گزر جاتے اور اماں بوزیراں کا لایا پیغام اسے پٹ سے حقیقت کی دنیا میں آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیتا۔

کہنیوں تک آستینیں موڑے' رسٹ واچ پر نگاہ جمائے ایک ایک سیکنڈ کا حساب لگاتا' چہرے پر شدید قسم کے سنجیدہ تاثرات لیے اسٹڈی میں محو انتظار مجتبیٰ! جو اپنے اول روز کے لاگو کیے اصولوں پر آج بھی سختی سے کاربند تھا۔ سنتیجتاً" اس دوران وہ اپنی ساری حسیں چوکس کرکے بیٹھتی بسورت دیگر اس کی ایک خشمگیں نگاہ کافی ہوتی۔

باقی کا سارا وقت وہ محمد خان کے ساتھ گزارتی۔ اسے کھلانا' پلانا' سلانا' کپڑے بدلنا اور اس طرح کے دیگر چھوٹے چھوٹے کام وہ عجب سرشاری کے سے عالم میں کیے جاتی۔ محمد خان بہت جلد اس سے مانوس

ہو گیا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی بہکنے لگتا' اس کا لمس محسوس کرتے ہی کھل اٹھتا' اٹکھیلیاں کرتا۔ ان دونوں کو آپس میں مصروف دیکھ کر جہاں ساجدہ مطمئن سی ٹی وی کے سامنے جم کر اپنے سارے پسندیدہ پروگرام دیکھتی وہیں بوا اماں وزیراں کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول ہو جاتیں۔

اس نے زندگی میں کبھی اپنی حقیقی ماں کا لمس محسوس نہیں کیا تھا۔ باپ کی پدرانہ شفقت سے لبریز محبت بھرے اظہار بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے ہوتے تھے ایسے میں ایک اماں تھیں جنہوں نے اپنی بے تحاشا محبتیں اس پر لٹائی تھیں۔ اور ان کے ہوتے ہوئے اسے محبتوں کے لیے اپنا دامن کبھی خالی محسوس نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہاں آکر اس نے محرومی کا ایک اور رنگ دیکھا۔ بے انتہا مصروف سے پاپا کی اگر کبھی محمد خان پر نظر پڑ جاتی تو وہ لمحہ بھر کے لیے اسے پیار کرتے بعجلت آگے بڑھ جاتے بالکل ایسے جیسے راہ چلتے بچے سے کوئی اجنبی پیار کرتا گزر جائے۔

اور ممّا! اس کی اپنی سگی ماں! ماہ رخ کو جھٹکا سا لگا تھا۔

بہت خوشگوار سا دن تھا وہ۔ دوپہر کے رنگ پر سرمئی بادلوں کا رنگ حاوی ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے نم جھونکے ہلکی ہلکی پھوار سے لبریز تھے۔ وہ لان میں محمد خان کو لیے سفید خرگوشوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سرخ روش پر ممّا کی پنسل ہیل کی ٹک ٹک گونجی تو وہ محمد خان کو لیے نرم سبز گھاس کو اپنے پیروں تلے روندتی بھاگ کر ان کی طرف گئی تھی۔

"کیسی ہو ماہ رخ؟"

انتہائی رسمی لہجے والفاظ میں کیے گئے سوال پر وہ محض کندھے اچکا کر مسکرائی تھی۔

"او ماما کا بے بی!"

وہ اب محمد خان کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ ماہ رخ کو لگا تھا اتنے دنوں کی دوری پر وہ اسے گود میں لے کر خوب سارا پیار کریں گی۔ لیکن وہ سن سی کھڑی رہ گئی۔ ممّا جھک کر اس کے چہرے پر پیار کرنے کے بعد اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی آگے بڑھ گئیں۔

بس یہی کچھ!

وہ کم عمر تھی لیکن ناسمجھ نہیں۔ اس ایک لمحے نے اسے آگاہی عطا کر دی تھی۔ وہ محمد خان کے لیے "ماں" بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

برکت بوا کی بات سننے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو قدم دہلیز پر ہی جم گئے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایک' دو' تین محمد خان بغیر کسی سہارے کے قدم اٹھا رہا تھا۔ چھٹے قدم پر وہ ذرا سا لڑکھڑایا اور گرنے کو تھا کہ اس نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور چٹا چٹ خوب سارا پیار کر ڈالا۔

"اور ایک منٹ!"

مسرت کے گہرے احساس سے سرشار وہ محمد خان کو وہیں چھوڑ کر لاؤنج کی جانب بھاگی لیکن شومئی قسمت!

"میں کل سے تمہیں چلنے کے آداب پر ایک بک لا دوں گا آئندہ سے وہ بھی تمہارے سلیبس میں شامل ہوگی۔"

شاید نہیں یقیناً" وہ اس پر طنز کر رہا تھا۔ ماہ رخ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر بنا کچھ کہے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"ہیلو! ممّا! ممّا سے بات کرنی ہے۔" فون ان کی پرسنل سیکریٹری نے اٹھایا تھا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

"اِیوری تھِنگ اِز او کے ماہ رخ؟" عجلت بھرا انداز ہلکی سی تشویش لیے ہوئے تھا۔

"یس ممّا! آپ جانتی ہیں ابھی کچھ دیر پہلے محمد خان نے بغیر کسی سہارے کے قدم اٹھایا ہے پورے پانچ قدم اور۔"

"ہوں! گڈ نیوز!" ایک ٹھنڈی اطمینان بھری سانس اس کی سماعتوں میں منتقل ہوئی تھی۔

"اور ممّا۔"

"بات سنو ماہ رخ! یہ بات گھر میں بھی بتائی جا سکتی تھی۔ میں یہاں بہت بزی ہوں اور تمہاری کال نے اچھا خاصا ڈسٹرب کر دیا ہے مجھے۔ اوکے بائے۔"

دوسری طرف سے ٹوں ٹوں سنائی دی تو اس نے قدرے بے چینی سے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے پھر سے پرجوش ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملازم کو بازار بھیج کر ڈھیر ساری مٹھائی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے ایک ایک کا منہ میٹھا کروایا۔ بوا' اماں' وزیراں' خانساماں' ڈرائیور' مالی بابا' چوکیدار سب۔ آخر میں گلاب جامن کا ایک ٹکڑا محمد خان کے ہاتھوں میں دے کر لاؤ سے کہا۔

"میرا منہ میٹھا کرواؤ خان!" وہ ہنسنے لگا تھا۔ ماہ رخ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خود ہی ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

اس کا شوق اور مجتبیٰ کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس نے 8th میں اے پلس گریڈ لیا تھا۔ پاپا نے ماتھے پر پیار کرتے اسے شاپنگ کے لیے والٹ سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کے دیئے۔ ممّا اس روز گھر پر تھیں اور انہوں نے معمول سے ہٹ کر کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کروا لیا تھا۔ وہ نہ تو کاکی کی سوتیلی ماں کی طرح کینہ پرور تھیں اور نہ ہی سنڈریلا کی ماں کی طرح حاسد۔

انہوں نے اس کے معاملات میں کبھی بے جا مداخلت نہیں کی تھی۔ کوئی روک ٹوک' زبردستی کچھ نہیں!

ماہ رخ کو لگا اس کے پاس ہونے کی سب سے زیادہ خوشی مجتبیٰ کو ہوئی ہے۔ ہمیشہ سنجیدہ اور خشک مزاج "ٹیچر" کو پہلی بار کھل کر مسکراتے دیکھ کر اسے بے حد اچھا لگا تھا۔ اس کے کندھی مغرور نقوش والے چہرے پر مسکراہٹ بہت اجنبی لگتی تھی۔ اجنبی لیکن بے حد بھلی! اگلے دن اسکول سے واپسی پر وہ اسے پک کرنے آیا تھا۔

"آئس کریم کھلاؤں؟" ماہ رخ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"اس بار صرف آئس کریم لیکن میٹرک میں اے پلس گریڈ لانے پر میں تمہیں اپنی طرف سے زبردست ٹریٹ دوں گا اور پرائز بھی!"

اس کے لیے تاحال کسی "اچھے ٹیوٹر" کا انتظام نہیں ہو سکا تھا اور مجتبیٰ نے خوشدلی سے یہ ذمہ داری اٹھائی ہوئی تھی۔ اس کی منتھلی ٹیسٹ رپورٹس کافی تسلی بخش تھیں سو پاپا اس طرف سے مطمئن ہوئے تھے۔

"محمد خان کے لیے بھی پیک کروائیں؟"

"نہیں! اس کا گلا خراب ہو جاتا ہے آئس کریم کھانے سے۔" اس کے فی الفور منع کرنے پر ماہ رخ نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے' ہنستے انجوائے کرتے مجتبیٰ کو دیکھ کر اس نے چپکے سے دل میں اس کا یہ روپ امر ہونے کی دعا کی تھی۔ لیکن اگلے دن ساری خوش گمانی دھری کی دھری رہ گئی۔ جب اسٹڈی میں صرف پانچ منٹ لیٹ پہنچنے پر اس نے اسے بری طرح جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ دل مسوستی کتاب پر جھک گئی۔

☼ ☼ ☼

محمد خان کی ذات سے وابستہ خوشیوں سے لبریز لمحات اس کی زندگی میں بہت بار آئے تھے۔ جب اس نے ممّا' پاپا کی بجائے پہلی بار اپنی زبان سے "رخ" ادا کیا تھا۔ جب پہلی بار بیگ اٹھائے اسکول جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تابعداری سے پوچھ رہا تھا۔

"رخ! میں جاؤں؟"

اور جس رات وہ اسے سلانے کی تمام تر کوششوں میں ناکام ہو کر زچ ہو کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"تم سو کیوں نہیں رہے محمد خان؟" تب اس نے زبردستی کی بند کی ہوئی اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔

"رخ! تم نے کہا تھا آج رات سونے سے پہلے مجھ

سے "ٹوئنکل ٹوئنکل" والی پوری پوئم سنوں گی اور اگر میں نے نہ سنائی تو تم مجھ سے خفا ہو جاؤ گی۔ ابھی سنادوں؟ پھر میں سوجاؤں گا۔"

وہ عمر میں اس سے برسوں کا فرق رکھتی تھی لیکن آپی یا باجی کی بجائے اس کا "رخ" کہنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

اور جب ایک شام وہ اپنا بیگ اٹھائے کوئی چیز تلاش کررہی تھی تب وہ ہچکچاتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور نگاہیں جھکائے معصومیت سے بولا۔

"رخ! تمہارے بیگ کی اس پاکٹ سے چاکلیٹ روز میں نکالتا ہوں۔ تم اسے ڈھونڈ رہی ہو نا؟" وہ بیگ رکھتی پوری طرح اس کی طرف گھومی تھی۔

"سوری رخ!" ٹھوڑی سینے سے ٹکائے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑے وہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

"اور یہ بات میں پہلے دن سے ہی جانتی ہوں۔ اسی لیے تو روز اس پاکٹ میں چاکلیٹ رکھ دیتی اور آئندہ بھی رکھوں گی۔"

اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔

"میرے لیے؟" ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔

"ہاں تمہارے لیے" اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ محبت سے بولی تھی۔ محمد خان کے دودھیا سفید بھرے بھرے ہاتھوں میں اسے اپنے گندمی ہاتھ کچھ سانولے محسوس ہوئے تھے۔

محمد خان کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ ایک سیزن کے کپڑے اگلے سیزن میں اس کے کسی کام کے نہیں رہتے تھے۔ اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے وہ عمر میں کئی گنا بڑا دکھائی دیتا۔ اس کے نقوش میں عجیب سی ملائمت تھی۔ کوئی غلطی ہوجانے پر بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ مارتا جب وہ اپنی گہری آنکھیں پھیلا کر نفی میں دائیں بائیں سر ہلاتا تو ماہ رخ کا دل چاہتا اسے اپنے دل میں کہیں چھپالے۔

☆ ☆ ☆

گھر میں ملازموں کی فوج ظفر موج موجود تھی لیکن کارکردگی صفر۔ وجہ شاید نہیں یقیناً" یہی تھی کہ اہل خانہ کے پاس ان کے سر پر کھڑے ہو کر پوچھ پچھ کرنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ جو جیسا ہے چلتا رہنے دو بس! لیکن ماہ رخ کو بہت شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس گھر کی اکلوتی اور بڑی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اسے یہ ذمہ داری اٹھالینی چاہیے۔ ویسے بھی میٹرک کے امتحانات کے بعد وہ ان دنوں بالکل فارغ تھی اور فراغت کا یہ مصرف بہترین تھا۔

یہاں صرف صفائی وغیرہ کے لیے تین لڑکیاں رکھی گئی تھیں۔ جو اچھی خاصی معقول تنخواہ لینے کے باوجود اوپری جھاڑ پونچھ کرکے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جاتیں۔ لیکن ماہ رخ نے ان کے سر پر کھڑے ہو کر گھر کا کونا کونا چمکوایا تھا۔ اس کا انداز انہیں باور کرواگیا تھا کہ اب موج مستی کے دن خواب و خیال ہوئے۔ اس کے بعد باری آئی تھی کچن کی۔ بہترین کراکری' ملکی اور غیر ملکی مسالا جات' شاندار کیبنٹس اور تمام تر سہولیات سے آراستہ جدید طرز پر بنے کچن کی حالت سب سے ابتر تھی۔

فریج کھولتے ہی اسے ابکائی سی آگئی۔ دودھ' چکن' فروٹ' جوسز' نعمتوں کی اتنی فراوانی اور اتنی ناقدری' اس کے مالکانہ تیور خانساماں اور اس کے معاون دو لڑکوں کو ہولکائے دے رہے تھے۔ وہ اپنی کوتاہی اور بے خبری پر افسوس کرتی دن میں کم از کم ایک بار کچن کا از خود جائزہ لینے کا تہیہ کرچکی تھی۔

انتہائی مہنگے پودوں اور انواع و اقسام کے پھولوں سے مہکتے لان کی حالت اگرچہ بہت بہتر تھی۔ لان کے وسط میں شفاف پانی کے فوارے کے قریب ٹہلتے مور اپنے پنکھ پھیلائے لان کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ مالی بابا اس کی نظروں میں سرخروئی کی سند پائے چند نئے پودے لگانے کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔ وہ بہت توجہ سے ان کی باتیں سننے کے بعد سر ہلاتی اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ طویل راہداری سے گزرتے اس کی نگاہ مجتبیٰ کے کمرے کے بند دروازے پر پڑی تو اس نے بے ساختہ جھاڑ پونچھ کرتی

سکینہ کو آواز دے کر اپنے پاس بلالیا۔

"وہ جی مجتبیٰ صاحب تو اپنے کمرے کی ہفتے میں ایک دن اپنی نگرانی میں ہی صفائی کرواتے ہیں۔" سکینہ متذبذب تھی۔ ماہ رخ چونکہ ملازموں کی کام چوری کے عملی مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ اس لیے سکینہ کے کنی کترانے کو بھی کام چوری پر محمول کیا۔

"چلو تم میری موجودگی میں صفائی اور ڈسٹنگ وغیرہ کرو باقی ڈسٹنگ میں خود کرلوں گی۔" سکینہ مزید کوئی تعرض برتے چپ چاپ صفائی میں جت گئی تھی۔

جو سوبرپن اس کی شخصیت میں جھلکتا اس کا ہر رنگ کمرے کی ترتیب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ یونہی ٹہلتی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی اپنی سمجھ کے مطابق مناسب رد و بدل بھی کرتی رہی۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ رائٹنگ پیڈ سے ایک صفحہ نکال کر مسکراتے ہوئے لکھنے لگی۔

"کچھ لوگوں کو اگر یہ معلوم ہوجائے کہ وہ مسکراتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں تو شاید وہ مسکرانے میں بھی اتنی کنجوسی سے کام نہ لیں۔"

اس نے احتیاط سے اس کے بک ریک میں ترتیب سے رکھی کتابوں میں سے ایک میں رکھ دیا۔ سکینہ اپنا کام ختم کرکے اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی تو اسے باہر جانے کا کہہ کر وہ خود سارے کمرے میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالتی قدرے مطمئن سی باہر نکل آئی۔

مسلسل گھومنے پھرنے سے وہ بری طرح تھکان محسوس کررہی تھی۔ سو اچھی طرح شاور لے کر کھانا کھائے بغیر سوئی تو شام کی خبر لائی تھی۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارتی ہاتھوں سے بالوں کو سلجھاتی وہ باہر آگئی تھی۔ بھوک تو ابھی بھی کچھ خاص محسوس نہیں ہورہی تھی البتہ چائے کی طلب ہوئی تو ملازمہ کو اچھی سی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا لانے کا کہہ کر لان کی جانب بڑھ گئی۔

سفید پھولوں کے کنج کے پاس جھولے پر پلکیں موندے ہولے ہولے کچھ گنگناتی وہ ہوا میں رچی پھولوں کی باس اپنی سانسوں میں اتار رہی تھی۔ محمد خان کچھ ثانیے تک اسے یونہی کھڑا دیکھتا رہا پھر سفید پھولوں کی ڈھیر ساری کلیاں توڑ کر اس کی جھولی میں ڈال دیں۔

ماہ رخ نے جھٹ سے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ بلو نیکر پر سفید شرٹ پہنے وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔ ماہ رخ اپنی جھولی میں پڑی سفید کلیاں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"ماہ رخ! ایک بات کہوں؟"

"ہاں!"

"ابھی جب میں وہاں سے آرہا تھا تو تم اتنی پیاری لگ رہی تھیں اتنی پیاری کہ بس!" اپنے مخصوص انداز میں ماتھے پر گرے بالوں کو جھٹکتا وہ جوش سے کہہ رہا تھا۔ ماہ رخ کو ہنسی آگئی۔

"کوئی نہیں' اتنی کالی تو ہوں کیا ہوتا جو میں مما کی طرح خوبصورت ہوتی۔" اس نے گویا سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

"مما خوبصورت ہیں اور تم پیاری ہو' بہت پیاری!" کتنی گہری بات کہہ گیا تھا وہ۔ ماہ رخ کو وہ ایک دم بڑا بڑا اور بہت سمجھدار دکھائی دیا تھا۔ اسی وقت نذیراں چائے کے ساتھ مجتبیٰ کا پیغام لے کر آئی تھی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں بلا رہا تھا۔ ماہ رخ واپس آکر چائے پینے کا ارادہ کرتی کچھ حیران سی ہوتی اس کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"کس سے پوچھ کر میرے کمرے میں گھسی تھیں تم؟" غضب ناک لہجہ' اکھڑے تیور' ماہ رخ کا حلق خشک ہونے لگا۔

"وہ میں نے سکینہ سے۔"

"میری چیزوں کو چھیڑنے سے پہلے مجھ سے پرمیشن لی تھی؟"

"نہیں اصل میں۔"

"میں اپنے کمرے میں گھسنے اور اپنی چیزوں کو چھیڑنے کی اجازت ہر کسی کو نہیں دیا کرتا۔"

"جی! لیکن میں نے سوچا۔"

"اوئے!" اس بار بھی اس کی بات پوری سننے سے قبل وہ دھاڑا تھا۔

ماہ رخ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی اور پلٹتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ آنسوؤں کی دھند کے سامنے سب کچھ دھندلا رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

✲ ✲ ✲

پورے دو دن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

قصور کیا تھا میرا جو اتنی باتیں سنا ڈالیں۔ لیٹے لیٹے رو رو کر یہی خیال ستاتا اور آنکھیں چھم چھم برسنے لگتیں۔ بوا کی جان پر بن آئی تھی۔ منت سماجت' لاڈ' پیار' چمکارنا سب بے کار گیا تھا۔ اور ابھی بھی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ اس نے جھلا کر کشن کانوں پر رکھ لیا۔

"چھوٹی بی بی! محمد خان۔"

"اوہ!" ساجدہ کی بات پوری سنے بغیر وہ کشن ایک طرف پھینکتی باہر کی جانب بھاگی تھی۔ وہ لان کی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے اتنا اداس لگ رہا تھا کہ ماہ رخ نے سو بار خود پر لعنت بھیجی۔

"محمد خان!" وہ اس کے قریب سیڑھی پر بیٹھ گئی تھی۔ محمد خان کی گہری بھوری آنکھیں دھندلا گئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ ماہ رخ کی جان نکلنے لگی۔

"میں تمہیں برا نہیں کہہ رہا لیکن تم کبھی کبھی بری بن جاتی ہو۔" دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا تھا۔ ماہ رخ ساکت رہ گئی پھر کھینچ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمہیں بھوک لگی ہے خان؟"

"میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔" وہ بمشکل اپنے آنسو پیتی اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں آ گئی۔

"آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ایسے مزے کا لنچ کراؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔" اسے چیئر اپ کرنے کے لیے اس نے خوب دل لگا کر پھرتی سے اس کا فیورٹ پاستا اور چکن سینڈوچ بنائے پھر کوک کا ٹن نکال کر دیں کچن میں ڈائننگ ٹیبل سیٹ کر دی۔ محمد خان برابر اس کی ہیلپ کراتا رہا تھا۔ بھوک چونکہ دونوں کو لگ رہی تھی اس لیے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد انہیں ریکٹ اٹھائے لان میں جاتا دیکھ کر بوا کی جان میں جان آئی تھی۔

✲ ✲ ✲

اگلے دن اس کا میٹرک کا رزلٹ آ گیا۔ اس نے حسب توقع فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ محمد خان کے ساتھ رقص کرتی وہ سارے گھر میں گول گول گھوم رہی تھی۔ مما ایک فیشن شو میں شرکت کے لیے دبئی گئی ہوئی تھیں اور پاپا اسلام آباد اس لیے وہ اپنی خوشی محمد خان کے ساتھ انجوائے کر رہی تھی۔

"ہم ہو گئے کامیاب!" رقص کرتے پاؤں اچانک تھمے تھے۔

"مبارک ہو!" اس دن کے بعد اس کا آج مجتبیٰ سے سامنا ہوا تھا۔

"تھینکس!" پیچھے رلتے سبز دوپٹے کا پلو اٹھا کر پیچھے ڈالتے ہوئے وہ سنبھلی ہوئی تھی۔

"تیار رہنا تم دونوں آج ڈنر باہر کریں گے۔"

"یاہو!" محمد خان خوشی سے اچھلا تھا۔ وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔ مجتبیٰ اس پر ایک نگاہ ڈالتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

پہلی بار یوں گھر سے باہر نکلنے کا موقع مل رہا تھا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ محمد خان بلیک پینٹ پر سرخ ٹی شرٹ پہنے بہت جاذب نظر لگ رہا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے بھی سرخ و سیاہ امتزاج کا نفیس ٹخنوں کو چھوتا فراک پہن لیا اور نکلتے وقت گاڑی کا دروازہ کھولے مجتبیٰ کو دیکھ کر وہ کھل کر مسکرائی تھی۔ اس نے بلیک جینز پر سرخ دھاریوں والی بلیک شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

بات بات پر مسکراتا" محمد خان کے بچکانہ تبصروں پر محظوظ ہوتا ہمیشہ سے بھی خشک مزاج مجتبیٰ نہیں لگ رہا تھا۔ اس بار ماہ رخ نے اس کا یہ روپ ازبر ہو جانے

کی دعا نہیں کی تھی۔ لیکن کچھ دعائیں بنا مانگے مستجاب ہو جاتی ہیں۔ اس کا اندازہ اسے آنے والے اگلے چند دنوں میں بخوبی ہو گیا تھا۔

ایک دن اسے "The Button Button" پڑھاتے وہ اچانک کہہ رہا تھا۔

"ماہ رخ! تم کچھ عجیب سی نہیں ہو؟ تمہاری عمر کی لڑکیاں فیشن' پارٹیز' شاپنگ کے لیے ہلکان ہوئی جاتی ہیں لیکن تمہیں ملازماؤں کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کروانے' خانساماں کو نت نئی ہدایات دینے' مالی بابا کے ساتھ پودوں کی اقسام پر گھنٹہ بھر بحث کرنے اور محمد خان کے ساتھ ٹینس کھیلنے کے علاوہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔" ماہ رخ کو اس کے تجزیے پر ہنسی آ گئی تھی۔

اس کی دوستوں نے اسے سننے کے لیے "جسٹن بیبر" کی سی ڈی دی تھی۔ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کے بعد سننے کی پرزور تاکید بھی کی۔ اس نے خاموشی سے سی ڈی لینے کے بعد دوسرے دن بغیر سنے واپس بھی کر دی۔ اسے کمپیوٹر چلانا نہیں آتا تھا۔ مجتبیٰ کو پتا چلا تو عقب سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا۔

"آج کل ٹیکنالوجی عروج پر ہے اور تمہیں ابھی تک ہارڈ ویئر اور سوفٹ ویئر کا ہی پتا نہیں۔ شام میں جب فارغ ہو جاؤ تو میرے کمرے میں آ جانا تمہیں تھوڑا بہت گائیڈ کر دوں گا۔" اور دوسرے ہی دن سے مجتبیٰ کے کمرے میں اس کی کمپیوٹر کلاسز کا آغاز ہو گیا۔ مجتبیٰ کے سمجھانے کا طریقہ اتنا واضح اور بھرپور تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ خود کو "کمپیوٹر ماسٹر" سمجھنے لگی تھی۔

ایک دن اس کی بات پر بے ساختہ ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ مجتبیٰ نے ایک صفحہ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔

"کچھ لوگوں کو اگر یہ پتا چل جائے کہ وہ ہنستے ہوئے اتنے پیارے لگتے ہیں کہ نظر لگ جانے کا خدشہ ہوتا ہے تو شاید وہ ہنسنے میں اتنی فیاضی سے کام نہ لیں۔" ماہ رخ پڑھ کر جھینپ گئی تھی۔ اسے اپنے لکھے الفاظ یاد آ گئے تھے۔

✲ ✲ ✲

"محمد خان۔۔۔!"

"ہوں؟"

"Describe me in 2 words!"

(مجھے دو لفظوں میں بیان کرو) کتاب پر جھکے محمد خان نے سر اوپر اٹھایا تھا پھر پر تیقن لہجے میں کہا۔

"No Comparison!"

ماہ رخ کھل کر مسکرائی تھی۔ اپنے کمرے کی جانب بڑھتے مجتبیٰ کے قدم تھمے تھے۔

"ماہ رخ! یار اچھی سی چائے تو پلاؤ۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ محمد خان کی گہری بھوری آنکھوں میں ناگواری در آئی۔ اس نے بے ساختہ اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا۔

"کیا ہوا؟" ماہ رخ کو یکایک اس کے بگڑتے موڈ کا اندازہ ہوا تھا۔

"مجھے ان کا تمہیں یار کہنا اچھا نہیں لگا۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

"ارے!" ماہ رخ کو ہنسی آ گئی۔

"وہ کیوں بھلا؟"

"بس تمہیں کوئی بھی یار کہے گا مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" عجب بے نیازی بھرا انداز تھا۔

"تو میرا غیرت مند خان!" وہ پیار سے اس کے بال بکھیرتی چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ مجتبیٰ کو اس کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی اس لیے وہ اکثر فرمائش کر کے اس سے بنواتا رہتا۔

مما پاپا لاکھ مصروف سہی لیکن وہ ماہ رخ اور محمد خان کی برتھ ڈے منانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اس دن ایک شاندار سے کیک کا آرڈر دیا جاتا اور چند ایک قریبی دوستوں کو مدعو کر کے گھر کے لان میں ہی چھوٹی سی پارٹی ارینج کی جاتی مجتبیٰ کو اپنی سالگرہ منانا پسند نہیں تھا۔ وہ زندگی کا ایک سال کم ہونے پر جشن منانے کو

فضولیات گرادیتا آج شام محمد خان کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ اور ماہ رخ نے اس سلسلے میں ساری ارینج منٹس خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔

محمد خان نے اس کے منتخب کردہ سفید کاٹن کے شلوار قمیص پر سیاہ جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ جبکہ وہ خود گرے کلر کے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ لانگ شرٹ پہنے اپنی تیاری کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ کمر تک آتے سلکی بالوں کو تھوڑا سا اوپر کر کے کیچر میں قید کیا باقی پیچھے کھلے چھوڑ دیے۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی وہ سینڈل کے اسٹرپ بند کرنے کے لیے جھکی تو سلکی بالوں کی آبشار بائیں کندھے پر آگری اس نے یونہی جھکے جھکے دروازے کی سمت دیکھا اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

مجتبیٰ مسکراتے ہوئے اندر آگیا تھا۔

"تمہارا ایک گفٹ ڈیو تھا مجھ پر۔ مجھے لگا اسے دینے کا مناسب موقع پھر نہیں ملے گا۔"

اپنے اور اس کے بیچ چند قدموں کا فاصلہ بہت آسانی سے پاٹتا وہ عین اس کے سامنے آن ٹھہرا تھا۔ وہ ماہ رخ کی سانسیں الجھنے لگیں۔ مجتبیٰ اس کا ہاتھ تھام کر ننھے منے ڈائمنڈ سے جگمگاتا انتہائی نفیس بریسلیٹ اس کی کلائی میں پہنانے لگا۔

"کیسا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"بہت پیارا۔" ماہ رخ نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑوالیا تھا۔

"تم پیاری چیزیں ڈیزرو کرتی ہو۔" ماہ رخ کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس نے پوری طرح خود کو اس لمحے کے فسوں میں جکڑا محسوس کیا باہر دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری اور اس کے نام کی پکار پڑنے لگی۔ فسوں ٹوٹ گیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکلے تھے۔ انہیں ایک ساتھ آتا دیکھ کر سکندر علی کچھ چونک سے گئے۔ انہوں نے آج پہلی بار اپنی جوان بیٹی کو باپ کی نظر سے دیکھا تھا۔ اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ سنجیدگی سے ماہ رخ کی شادی وقت پر کرنے کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ ان کی نظر میں ایک دو اچھے رشتے تھے۔ لیکن یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔

مجتبیٰ اور ماہ رخ! ماہ رخ اور مجتبیٰ!

انہیں اپنے اندر سکون کی لہر اترتی محسوس ہوئی تھی۔

محمد خان کے دائیں جانب مما اور بائیں جانب بابا کھڑے تھے۔ وہ اس کے عقب میں جاکر کھڑی ہو گئی۔ محمد خان کے لمبے چوڑے مضبوط سراپے کے پیچھے اس کا کانچ سا وجود تقریباً" چھپ گیا تھا۔ اس کا قد ماہ رخ سے اونچا ہو گیا تھا اس کے مضبوط شانوں کو دیکھ کر اسے ویسا ہی احساس ہوا تھا جیسا اپنے ہاتھ سے لگائے کسی پودے کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھلتا پھولتا دیکھ کر کسی مالی کو ہوتا ہے۔

اس نے کیک کا ٹکڑا کاٹ کر مما بابا کی بجائے پلٹ کر اپنے عقب میں کھڑی ماہ رخ کے منہ میں دے دیا۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرائی تھی پھر اس کے ہاتھ سے ٹکرا کے کراس کے منہ میں دے دیا۔ اس کی کلائی میں پڑے بریسلیٹ کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو بجے تو نظر بے اختیار اپنی طرف دیکھتے مجتبیٰ کی طرف اٹھی تھی۔ اس کا دل مختلف لے پر دھڑکنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"محبت کیا ہے رخ؟"

"محمد خان کی مسکراہٹ!"

"اور زندگی"

"محمد خان کی آنکھیں!"

"اور کائنات؟"

"محمد خان کی ذات!"

بابا نے ماہ رخ کی سفارش پر اسے بائیک خرید کر دی تھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ بہت احتیاط سے اسے چلائے گا اور اب ماہ رخ کو لیے تارکول کی سیاہ شفاف سڑک پر اسے اڑائے پھر رہا تھا۔ اس کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھے وہ ہوا سے اڑتے اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس

کررہی تھی۔ اس پل ایک عجیب سی خواہش نے اس کے اندر انگڑائی لی تھی۔ محمد خان کے ساتھ اسی بائیک پر بیٹھ کر پوری دنیا گھومنے کی خواہش۔ اپنے اس خیال پر اسے بہت زور کی ہنسی آئی تھی۔

"اکثر پاگل لوگ بلاوجہ ہنستے ہیں۔"

"نہیں کبھی کبھی پاگلوں کو دیکھ کر عقل مندوں کو بھی ہنسی آجاتی ہے۔"

"آئس کریم کھاؤ گی؟"

"نہیں تمہارا گلا خراب ہو جائے گا۔"

"میں اپنی نہیں تمہاری بات کررہا ہوں۔" اس نے سڑک کے کنارے ایک آئس کریم پارلر کے قریب بائیک روک دی تھی۔ ماہ رخ دوپٹا سنبھالتی اس کے پیچھے اتر آئی۔

ہر قسم کی فکر سے آزاد یوں سرراہ آئس کریم کھاتے اور آس پاس کے لوگوں پر بچکانہ تبصرے کرتے اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔

"واہ بھئی! کیا عیش ہیں؟" پاس سے گزرتے دو آوارہ لڑکوں نے آواز کسی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچ پاتی محمد خان نے چیتے کی طرح ان دونوں کو دبوچ لیا تھا۔

"محمد خان! چھوڑو انہیں۔" ماہ رخ بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ آس پاس کے لوگ بنا ٹکٹ کے تماشا دیکھنے لگے تھے۔ محمد خان پہ جیسے خون سوار ہو گیا تھا۔ وہ مضبوط جسامت کا مالک کرائے کے لوائے دو منٹوں میں دونوں لڑکوں کو گیدڑ کی طرح کھگھیا کر بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔

"محمد خان! چلو پلیز۔" وہ آستین سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتا بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ ماہ رخ نے اپنا لرزتا کانپتا ہاتھ اس کے کندھے پر ٹکایا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" یہ بات اسے پوچھنی چاہیے تھی لیکن پوچھ وہ رہا تھا۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں۔" اس نے خود پر قابو پانے کی سعی کی۔

"تمہیں یوں خود پر سے کنٹرول نہیں کھونا چاہیے تھا محمد خان۔"

"جو تمہاری طرف انگلی اٹھائے گا میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ کانوں میں ہیڈ فون گھسائے صوفے پر نیم دراز آنکھیں موندے پاؤں جھلا رہا تھا۔ ماہ رخ کی نظریں ایک بار پھر اس کی طرف اٹھی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ہاتھوں میں تھاما ریموٹ پٹخا اور اس کے کانوں سے ہیڈ فون کھینچ لیا۔

"مجھے تم سے ایک بات شیئر کرنی ہے۔" اس کی استفہامیہ نگاہوں پر وہ آرام سے بولی۔ محمد خان صوفے سے پاؤں نیچے رکھتا پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کچھ اس طرح کہ اس سے کچھ فاصلے پر وہ کشن گود میں لیے اس کے عین سامنے بیٹھی تھی۔

"مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔"

"لائف پارٹنر والی محبت؟" کتنی پریکٹیکل سوچ رکھتا تھا وہ ماہ رخ کو اس وقت اندازہ ہوا تھا۔

"ہاں۔" اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

"کون ہے' کیسا ہے؟" کے بجائے وہ پوچھ رہا تھا۔

"مجھے کب ملواؤ گی اس سے؟"

"جب وہ ایسی کسی مستحکم حیثیت سے میری زندگی میں شامل ہوگا' تو سب سے پہلے تم سے ہی ملواؤں گی۔"

"اور اگر وہ مجھے پسند نہ آیا تو؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اتنا یقین ہے اس پر؟"

"اس پر نہیں تمہاری پسند ناپسند پر یقین ہے۔"

"پھر بھی چلو فرض کرتے ہیں' اگر میری وجہ سے تمہیں اس شخص کی محبت سے دستبردار ہونا پڑے تو؟"

"بات اگر تمہاری خوشی کی ہوئی تو ایسی سو محبتیں قربان۔" وہ دم بخود سا ہو کر رہ گیا تھا۔

خانساماں کو کھانے کے سلسلے میں چند ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو

بوا کو اماں وزیراں کے ساتھ اپنے گاؤں کی باتیں کرتا دیکھ کر اس کے دل میں بے اختیار اپنا پرانا گھر دیکھنے کی خواہش شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ اپنا گاؤں' وہ کچا پکا گھر اور اماں اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ لان کی سیڑھیوں پر اسے گم سم بیٹھا دیکھ کر محمد خان ٹھٹکا تھا۔ وہ اداس تھی تو آدھا ادھورا چاند' پیڑ پودے' پتے پھول سب اداس دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت خاموشی سے جا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"محمد خان! گاؤں چلیں؟" اس نے گھٹنوں پر گرا سر اوپر اٹھالیا تھا۔

"گاؤں؟ وہاں کیا ہے؟"

"میرا گھر' میری اماں کی یادیں اور میرا بچپن۔" اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کے رنگ اتر رہے تھے۔

"ہم کل گاؤں چلیں گے رخ۔" محمد خان نے وہی کہا جو اسے کہنا تھا۔

صبح اس نے بابا سے ذکر کیا تو انہوں نے کیفیت سمجھتے ہوئے گاؤں جانے کی اجازت دے دی۔ مجتبیٰ کو اس کا گاؤں جانے کا فیصلہ خاصا احمقانہ لگا تھا۔

"اتنی دھول مٹی والے سہولیات سے عاری ماحول میں جا کر کیا کرو گی تم؟ اور محمد خان کو تو ویسے بھی سانس کی پرابلم ہوتی ہے ڈسٹ سے۔"

"میرا کوئی مسئلہ نہیں' ویسے بھی ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔ گھوم پھر کے واپس آجائیں گے۔" اس کے چہرے کا ایک رنگ پھیکا پڑا تھا لیکن محمد خان کو ساری کائنات بے رنگ دکھائی دی۔ ماہ رخ کو لگا وہ مجتبیٰ کو اپنی فیلنگز سمجھا نہیں پائے گی سو خاموش رہی۔

"رات سارہ کا بھی فون آیا تھا کہہ رہی تھی اس بار چھٹیاں گزارنے آپ کے ہاں آنے کا پروگرام بنا رہی ہوں۔" مما نے جوس کا سپ لیتے ہوئے اطلاع دی تھی۔ سارہ ان کے اکلوتے بھائی حیدر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گاؤں جانے کا سن کر بوا کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن جوڑوں میں درد کے سبب وہ سفر کرنے سے قاصر تھیں بس آنکھوں کی نمی پونچھ کر رہ گئیں۔ نکلتے وقت بابا نے ڈرائیور کو بارہا احتیاط سے ڈرائیو کرنے کی تاکید کی تھی۔ وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

گاڑی جانے پہچانے کچے پکے راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ برگد کے پیڑ تلے حقہ گڑگڑاتے مرد' گلی میں کھیلتے بچے' پانی کے مٹکے کمر پر اٹھائے دوپٹے کا گھونگھٹ منہ میں دبائے پگڈنڈی پر چلتی نوخیز کنواری لڑکیاں' وہ پیاسی نگاہوں سے ایک ایک منظر اپنے دل میں جذب کر رہی تھی۔ گھر کی دیکھ بھال پر مامور ملازم حسین اور اس کی بیوی انہیں یوں اچانک اپنے سامنے پا کر کچھ بوکھلا سے گئے۔

"بی بی صاحب! آپ لوگ یوں اچانک۔ کوئی اطلاع بھی نہیں دی اپنے آنے کی' ہم کوئی انتظام کر لیتے۔" ملازم حسین انہیں لیے اندر آگیا' اس کی بیوی ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے کچن میں بھاگی۔

اس کا باغ' جامن کا درخت' املی کے پیڑ پر چڑھی گلہریاں' نیم کے درخت سے بندھا جھولا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ بیچ کے سال تو پلک جھپکتے گزر گئے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں روکتی مختلف آوازوں کی بازگشت میں گھری کھڑی رہی۔

"جھولا جھلائیں ناں اماں! خوشیاں منائیں میں اور اماں۔"

"اماں! آئیں میں آپ کو جھولا جھلاؤں' بوا کو بھی لیتی آئیں۔"

"تو بھلا یہ عمر ہے ہم بڑھیوں کی جھولا جھولنے کی' گر گرا کر ہڈی تڑوا بیٹھیں تو باقی کے دن بستر پر لیٹے کاٹنے پڑیں گے۔" سیدھی سادی اماں منہ پہ دوپٹا رکھے ہنستی چلی گئیں۔

"اماں! ادھر آئیں' ذرا مجھے ڈھونڈیں تو۔"

"ارے بیٹا! کہاں اوپر چڑھی بیٹھی ہو؟ نیچے اترو' اچھی لڑکیاں درختوں پر نہیں چڑھتیں۔"

"یہ گلہریاں کیوں چڑھی رہتی ہیں سارا دن؟" کھینچ کر ایک کچی املی گلہری کو ماری گئی۔

"ان کا تو کام ہی یہی ہے۔"

"یہ کیسا کام ہے؟" شوخ کھلکھلاہٹ پر گلہری نے پتوں کی اوٹ سے جھانکا تھا۔

"اچھا یہ بتائیں لڑکے درخت پر چڑھتے ہیں یا نہیں؟"

"لڑکوں کو کاہے کا ڈر؟ درختوں پر چڑھیں بھلے سے کھمبے پر لٹکیں۔"

"اچھے یا برے لڑکے؟"

"برے لڑکے۔"

"اچھے لڑکے کیوں نہیں چڑھتے؟ انہیں ڈر لگتا ہے؟"

"اپنے بابا سے پوچھنا۔" اماں خفگی سے واپس پلٹی تھیں۔

"ارے اماں! رکیں تو۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور سارے سنہری منظر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ماہ رخ سسکنے لگی تھی۔

"رخ' پلیز۔" وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ ماہ رخ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ رومال سے اپنی آنکھوں سے نکلتے پانی کو پونچھتا وہ بہت دقت سے سانس لے رہا تھا۔ چہرے کی سپید رنگت بہت سرخ پڑ گئی تھی۔ اسے ڈسٹ سے الرجی تھی۔

"اوہ! محمد خان تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں تم پلیز رو مت۔"

"تمہیں سانس لینے میں پرابلم ہو رہی ہے؟ اوہ گاڈ! آئی ایم سوری محمد خان' مجھے دھیان نہیں رہا۔" وہ شرمندگی سے کہتی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

ملازم حسین کی بیوی نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ وہ محمد خان کی وجہ سے اب ایک منٹ یہاں رکنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن ان کا خلوص بھرا اصرار۔

"کھانا کھا کر چلتے ہیں رخ۔" محمد خان کو بھی بغیر کچھ کھائے اٹھ کر چلے جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن وہ بمشکل نوالے حلق سے اتارتی تشویش سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر جلد ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے رہ رہ کر خود پر افسوس ہو رہا تھا۔

"ہائے!" گاڑی کا دروازہ کھولتے وہ ٹھٹکی تھی۔ ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس وہ لمبا تڑنگا یقیناً "کاشی" ہی تھا۔

"ملے بغیر ہی جا رہی تھیں؟" وہ شکوہ کناں لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کیسے ہو کاشی؟" وہ اس کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں ایک ساتھ کھیلے تھے۔

"گھر آؤ گی یا یہیں کھڑے کھڑے سب پوچھو گی؟"

"نہیں کاشی! ابھی ہمیں جلدی واپس جانا ہے۔ پھر کبھی چکر لگایا تو تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔ تمہاری اماں کیسی ہے؟ کیا اب بھی وہ تمہیں مارتی ہے کاشی؟"

"وہ اس کاشی پر ہاتھ اٹھاتی تھی جو کمزور اور اس کا دست نگر تھا۔ اب وقت کا سکہ الٹا ہے۔ ابے کی وفات کے بعد اسے کاشی اپنے چھوٹے بچوں کا سہارا اور اپنی محفوظ پناہ گاہ لگتا ہے۔" وہ ہنسا تھا۔ ماہ رخ' محمد خان اور کاشی! تینوں ایک جیسے تھے' ماں اور باپ کے بارے میں' ان تینوں کی تکون کا تیسرا حصہ کر گیا تھا۔ محمد خان کی طبیعت کے پیش نظر وہ جلدی سے گفتگو سمیٹتی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

ان دنوں بابا کو انجائنا کی معمولی سی تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس لیے وہ آفس کی بجائے اپنا زیادہ تر وقت گھر میں گزار رہے تھے۔ البتہ مجتبیٰ باقاعدگی سے آفس جا رہا تھا۔ محمد خان کا انٹرسٹ بزنس میں تھا۔ اور وہ پڑھائی کے ساتھ اپنا سیکنڈ ٹائم بزنس کو دینے کا سنجیدگی سے سوچ چکا تھا۔ اور بابا کے نزدیک یہ بہت خوش آئند بات تھی۔

مما کی مصروفیت کا البتہ وہی عالم تھا۔ لیکن سارہ کی وجہ سے وہ اپنی مصروفیات میں سے اچھا خاصا ٹائم نکال کر گھر پر گزار رہی تھیں۔

بے حد گوری چٹی' خوبصورت اور نخریلی سی سارہ حیدر' محمد خان کی ہم عمر تھی۔ کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا جاتا' نت نئے پروگرام بنتے' کبھی سی سائیڈ' کبھی

لانگ ڈرائیو تو کبھی شاپنگ۔ کبھی کبھار آفس سے جلدی آنے پر مجتبیٰ بھی انہیں جوائن کرلیتا اور بہت غیر محسوس انداز میں اس کا کوئی معنی خیز جملہ اور ایک گہری نظر ماہ رخ کو اپنی جگہ مسحور کردیتی۔ وہ خود کو اس کی محبت میں پور پور ڈوبا محسوس کررہی تھی۔ مجتبیٰ بارہا ڈھکے چھپے الفاظ میں اس سے اپنی فیلنگز کا اظہار کرچکا تھا۔ ایسے میں ماہ رخ کی ایک شرمیلی مسکان اس کا کل جواب ہوتی۔

آج سارہ کے کہنے پر ریس کورس جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ ماہ رخ کو فلو ہورہا تھا۔ اس نے جانے سے معذرت کرلی۔ اس کی غیر موجودگی محمد خان کے لیے بنا نمک کے آٹے کی مانند ہوتی تھی۔ پھیکی اور بدمزا اس لیے اس نے فی الفور پروگرام کینسل کردیا۔ نک سک سے تیار سارہ کا موڈ بری طرح آف ہوگیا پھر مما کی خفگی اور ماہ رخ کے اصرار پر وہ سارہ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن وہاں جاکر اس کا سارا دھیان ماہ رخ کی طرف لگا رہا تھا۔ سارہ کے ساتھ پہلو بہ پہلو موجود ہوتے ہوئے بھی وہ اسے اپنے ساتھ موجود محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا رخ نامہ سنتے ہوئے بور ہونے سے کہیں بہتر اسے واپس گھر جانا لگا تھا' سو بہت جلد دونوں واپس آگئے۔

گھر پہنچتے ہی وہ اپنی طرف کا گاڑی کا دروازہ بند کرتا تقریباً" بھاگتے ہوئے اندر چلا گیا تھا۔ سارہ بے حد سبکی محسوس کرتی خود ہی گاڑی سے اتر کے اندر آگئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے تنہا ڈائننگ ٹیبل پہ چمچے کانٹے کے ساتھ الجھا دیکھ مما ٹھٹکی تھیں۔

"سارہ! جانو' اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟ کھانا کھالیا تم نے؟"

"مجھ سے اکیلے کھانا نہیں کھایا جاتا پھپھو اور آپ کا صاحب زادہ مجھ سے جان چھڑوا کر نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔" وہ سخت جھلائی ہوئی تھی۔ خوب صورت چہرے پر برہمی کے آثار بہت واضح تھے۔ مما کو محمد خان سے اس بدتہذیبی کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ماہ رخ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"مائی گاڈ! اچھا خاصا ٹمپریچر ہورہا ہے تمہیں اور صبح سے رٹ لگا رکھی تھی معمولی سا فلو ہے ابھی ٹھیک ہوجائے گا۔"

"آئی ایم ناٹ اے بے بی محمد خان۔"

"ملیں آپ بٹ یو آر لکنگ لائیک اے بے بی۔"

"مما!" اس نے گردن موڑ کر دروازے پر ایستادہ مما کو دیکھا تھا۔

"مما! رخ کو ٹمپریچر ہورہا ہے۔ آپ پلیز ملازمہ سے منگوا کر اسے کچھ کھانے کو دیں' پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں' ٹھیک ہے رخ؟" وہ تیزی سے بات ختم کرتا اٹھ کر باہر نکل گیا اور مما جو اسے غلط رویے کا احساس دلانے آئی تھیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ کچھ ایسا تو تھا جو انہیں کھٹک گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟" رات کو انہیں اضطراری انداز میں کچھ سوچتا دیکھ کر بابا پوچھے بنا نہ رہ سکے۔

"اں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ آپ کو سارہ کیسی لگی سکندر؟" وہ کہنا کچھ اور چاہ رہی تھیں لیکن نکل کچھ اور گیا۔

"اچھی بچی ہے۔"

"میں اس کے لیے محمد خان کا سوچ رہی تھی۔ ویسے بھائی جان نے بھی مجھ سے ڈھکے چھپے لفظوں میں ایک آدھ بار سارہ اور محمد خان کے رشتے کی بات کی ہے۔" بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے بابا نے سر ہلاتے گویا ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"اور ماہ رخ! وہ بڑی ہے' ہمیں پہلے اس کے بارے میں سوچنا چاہیے۔" ان کی نگاہیں بیگم کے چہرے پر جم گئیں' کچھ کھوجتی' اخذ کرتی نگاہیں۔

"ماہ رخ کے لیے مجھے مجتبیٰ کا پرپوزل بیسٹ لگا ہے۔ وہ خود بھی ماہ رخ میں انٹرسٹڈ ہے۔ باقی جو آپ کو مناسب لگے۔" ایک اطمینان بھری سانس ان کے لبوں سے خارج ہوئی تھی۔

"بہرحال! میں ماہ رخ کا عندیہ ضرور لینا چاہوں گا۔"

"ظاہر ہے اس کی مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

ماہ رخ نے محمد خان کے ہفتہ بھر کے استری شدہ کپڑوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور کچھ مطمئن سی ہوتی اس کے کمرے میں چلی آئی۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ یقیناً" شاور لے رہا تھا۔ ماہ رخ مگن انداز میں اس کی الماری میں کپڑے ترتیب سے رکھنے لگی۔ اسی اثنا میں بیڈ پر پڑا محمد خان کا موبائل بج اٹھا۔ تھوڑی دیر بجتے رہنے کے بعد خود ہی خاموش ہوگیا۔ ماہ رخ کام ختم کرکے الماری بند کرتی پلٹی تو موبائل ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل اٹھالیا۔

"ڑالے کالنگ۔" حیران سی ہوتی وہ کال اوکے کرکے موبائل کان سے لگا چکی تھی۔

"ہیلو محمد خان! کہاں غائب ہو؟ کال ریسیو کیوں نہیں کررہے تھے میری؟ تم جانتے ہو۔" بے تکلف لب ولہجہ استحقاق جتاتے الفاظ ماہ رخ شاکڈ سی بیٹھی رہ گئی۔

کال بے جان ہوئی تو اس نے جلدی سے ان باکس کھولا۔ جوں جوں وہ میسجز پڑھتی جارہی تھی' اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جارہا تھا۔ وہ ایک دم موبائل غصے سے بیڈ پر اچھالتی باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ بند کیا تھا۔

اگلے کچھ دنوں میں ہوا یوں کہ محمد خان اچھا خاصا زچ ہوکر رہ گیا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کرتا رہ جاتا۔ ادھر سے جواب ملتا میں کھانا کھاچکی ہوں۔ رات کو حسب عادت لان میں چہل قدمی کرتا وہ اپنی ریسٹ واچ پر نگاہیں دوڑاتے برابر اس کا انتظار کیے جاتا لیکن خبر ہوتی کہ محترمہ سوچکی ہیں۔ اس کے پسندیدہ ڈرامے کا ٹائم شروع ہوتے ہی ٹی وی لگا کر بیٹھ جاتا لیکن معلوم ہوتا وہ اب سیکنڈ ٹائم ڈرامہ دیکھتی ہے۔ محمد خان اپنے بال نوچنے والا ہوگیا۔ پورے سات دن بعد وہ اسے کچن سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ محمد خان نے وہیں اسے جا لیا۔

"کیوں کررہی ہو میرے ساتھ ایسا؟"

"ہٹو سامنے سے' مجھے تمہارے جیسے دھوکہ باز انسان سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچتا لان کی سیڑھیوں کی جانب لے آیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ دو چبھتی نگاہوں نے بہت تنفر سے یہ منظر دیکھا تھا۔

"اب بتاؤ کون سے دھوکے کی بات کررہی ہو؟"

"ڑالے کون ہے؟" اس نے چبا چبا کر پوچھا تھا۔

"اوف۔۔" محمد خان سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے' میں اس کے تمام میسجز پڑھ چکی ہوں اور اپنے کانوں سے اس کی کال بھی سن چکی ہوں' اس لیے کوئی جھوٹ مت بولنا۔"

"کلاس فیلو ہے میری' پہلے اسکول' پھر کالج اور اب یونیورسٹی' پٹھان فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ اب تک میں اسے اپنی صرف ایک دوست ہی سمجھتا رہا لیکن اب۔۔۔ اب کچھ عرصے سے مجھے محسوس ہوا' مطلب میرے دل میں مختلف فیلنگز' اکچھولی۔۔۔" کچھ کنفیوژ سا' سر جھکائے اٹک اٹک کر بولتا' ماہ رخ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ امڈی تھی' جسے اس نے مہارت سے دانتوں تلے دبالیا۔

"کتنے افسوس کی بات ہے' تم نے اتنی بات مجھ سے چھپائی اور اگر اس دن اتفاقاً" مجھے وہ سب پتا نہ چلتا تو تم مجھے بھی نہ بتاتے۔"

"نہیں رخ! ایسا نہیں ہے۔ قسم سے میں یہ بات سب سے پہلے تمہیں ہی بتانے والا تھا وہ تو بس ابھی میں کچھ کنفیوژ سا تھا کہ آیا یہ کوئی وقتی جذبہ ہے یا واقعی اسپیشل فیلنگز۔" اس نے ایک بار پھر سر جھکالیا تھا۔ کچھ جھینپا' کچھ شرمایا سا' ماہ رخ کو اس پر ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔

"پھر کنفیوژن دور ہوئی' کوئی وقتی جذبہ ہے یا

واقعی اسپیشل فیلنگز؟"

"میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں رخ!"

"مجھ سے کب پلوار ہے ہو اسے؟"

"تم اس سے ملو گی رخ؟ پتا ہے میں نے اسے تمہارے بارے میں سب بتایا ہے اور وہ تمہارے بارے میں شدید بے یقینی کا شکار ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا ہے تم اس سے جیلسی فیل کرو گی۔"

"تم نے اسے بتایا نہیں کہ میری رخ ایسی نہیں ہے؟" اس کا لہجہ بہت مدھم تھا۔

"نہیں' میں نے اس سے کہا دوبارہ رخ کے بارے میں ایسی بات کی تو میں تمہیں تھپڑ دے ماروں گا۔" اس کا مضبوط لہجہ اور کھرے الفاظ' ماہ رخ کو خوف آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے دوست کی بہن کی شادی میں ماہ رخ کے جانے کی کیا تک بنتی ہے بھلا؟" مما اور مجتبیٰ کا اعتراض ملتا جلتا تھا۔ ژالے نے اپنی بڑی بہن کی شادی میں ان دونوں کو شمولیت کی بصد اصرار دعوت دی تھی۔ ماہ رخ اس سے ملنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے جانے کے لیے فوراً" تیار ہو گئی۔

"مما! اب میں شادی بیاہ کی تقریب میں اکیلا جاتا اچھا لگوں گا کیا؟ آپ نے اپنی میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے' سارہ بی بی کے سر میں درد ہے اور پھر انہوں نے اتنے اصرار سے بلایا ہے میرا جانا لازمی بنتا ہے۔" اسے مما اور مجتبیٰ کا اعتراض بے جا لگا تھا۔

سارہ نے ماہ رخ کی وجہ سے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معقول بہانہ سر درد کی صورت میں موجود تھا۔ ان دونوں کے ساتھ کہیں بھی جاتے ہوئے نہ جانے کیوں اسے اپنی ہتک کا احساس شدت سے ہوتا۔ ایک دوسرے میں مگن محض لمحہ بھر کے لیے اس کی جھولی میں اپنی توجہ کے سکے ڈالنے کے بعد وہ پھر سے اس سے بے نیاز ہو جاتے۔ سارہ حیدر کو ادھورے پن سے نفرت تھی۔ وہ اتنے کم پر قانع ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔

بلیک پینٹ پر لائٹ گرین شرٹ پہنے ڈھیر سارا پرفیوم خود پر انڈیلے' ہاتھوں سے بالوں کو سنوارتا محمد خان بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ماہ رخ پرپل کلر کے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ ہلکے کام والی لانگ شرٹ پہنے ساتھ میں بڑا سا ہم رنگ دوپٹا پھیلائے اپنی تیاری کے بارے میں اچھی خاصی کانشس ہو رہی تھی۔

"اب بائیک پر مت بیٹھ جانا تم دونوں' میری گاڑی لے ۔۔۔" مجتبیٰ کی آواز بائیک اسٹارٹ ہونے کے شور میں دب گئی تھی۔ وہ لب بھینچے جلتی آنکھوں سے محمد خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتی ماہ رخ کی پشت کو دیکھے گیا۔

"اتنا پروٹوکول' اتنا دارم ویلکم۔" ماہ رخ حیران رہ گئی تھی۔ وہ سب محمد خان اور اسے خوب اہمیت دے رہے تھے۔ ژالے کی ماں زر جان بی بی نے جس طرح والہانہ انداز میں محمد خان کی پیشانی چومی تھی' ماہ رخ نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

قندھاری انار کی طرح سرخ ژالے آفریدی اس کے سامنے اچھی خاصی کنفیوژ ہو رہی تھی۔ ماہ رخ کو وہ بہت پسند آئی تھی اور اس نے اپنی پسندیدگی کا اس کے سامنے کھلم کھلا اظہار بھی کر دیا۔ (مجھے تو ہر اس چیز سے محبت ہو جاتی ہے جسے محمد خان چھوتا ہے' پھر تم تو ایک جیتی جاگتی انسان اس کی محبت ہو' تمہیں میں کیسے ناپسند کر سکتی ہوں۔) ژالے کی بھابھی پلوشے محمد خان کا ہاتھ پکڑے اسٹیج پر لے گئی تھی جہاں مختلف رسمیں عروج پر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ژالے کو کسی نے پکارا تو وہ معذرت کرتی اس طرف چلی گئی۔ ماہ رخ یوں ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔

وہ سفید کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس شموئیل خان آفریدی کی نگاہ بھٹکانے کا سبب بن رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ کولڈ ڈرنک کے دو گلاس لیے اس کی جانب چلا آیا تھا۔

"لگتا ہے آپ بور ہو رہی ہیں؟" اس کی طرف کولڈ ڈرنک کا گلاس بڑھاتے وہ بے تکلفی سے ساتھ والی

کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔ ماہ رخ نے ہاتھ میں پڑے بریسلیٹ کو گھمانے کا شغل ترک کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک کا گلاس لے لیا۔

"شادیوں میں کون بور ہوتا ہے؟" وہ بہت جلد کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی لیکن یہاں وہ سب کو محمد خان کے ہونے والے سسرال کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ سو اپنی عادت کے برخلاف کولڈ ڈرنک کے سب لیتی اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ یوں ہی چھوٹی چھوٹی بے ضرر باتیں۔ (یہ پٹھان لوگ اتنے خوب صورت کیوں ہوتے ہیں۔) اسٹیج پر سے ہوتی اس کی نگاہ ساتھ بیٹھے شموئیل خان کے سنہری روئیں والے سرخ و سفید مضبوط ہاتھوں پر بھٹکی تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر سامنے سے آتے محمد خان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"شموئیل لالہ! آپ نے رخ کو اچھی کمپنی تو دی نا؟" وہ ہنستے ہوئے ان سے پوچھ رہا تھا۔ شموئیل کندھے اچکاتا اسے دیکھنے لگا جو محمد خان کے آتے ہی سب سے بے نیازی اس سے واپسی کا پوچھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مما کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا۔ انہوں نے خاصے اچنبھے سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھا تھا۔ جو اپنا جواب دے کر مکمل طور پر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ان کی کولیگ مسز آفندی نے اپنے گھر گیٹ ٹو گیدر رکھی تھی۔ وہ ماہ رخ' محمد خان اور سارہ کو بھی اپنے ساتھ ان کے ہاں لے کر گئی تھیں۔ مسز آفندی اپنی چھوٹی بیٹی انوشہ کے لیے ان سے محمد خان کی بابت تذکرہ کر چکی تھیں۔ ان کی سوسائٹی میں اپنے منہ سے بیٹی کے لیے خود سے ذکر کرنا معیوب بات نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے خاصے اعتماد کے ساتھ محمد خان کو اپنی فرزندی میں لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگرچہ مما کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ محمد خان کے لیے سارہ کو فائنل کر چکی تھیں۔ لیکن واپسی پر انہوں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ محمد خان سے پوچھ لیا۔

"تمہیں انوشہ کیسی لگی محمد خان؟"

"رخ کو اس کے بیٹھنے کا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا اس لیے وہ مجھے بھی اچھی نہیں لگی۔" اس کے اطمینان بھرے جواب نے انہیں اچھا خاصا بے اطمینان کر دیا تھا۔

ان کے بیٹے کو ایک بے حد خوب صورت' ویل مینرڈ لڑکی اس لیے اچھی نہیں لگی کیونکہ ماہ رخ کو اس کے بیٹھنے کا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا۔ ان دنوں زیادہ تر وقت گھر پر گزارنے کی وجہ سے وہ اتنا تو جان گئی تھیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت اٹیچ تھے۔ لیکن یہ اٹیچمنٹ اس حد تک ہو گی ان کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

"مما! رخ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے ریسٹ کرنے دیں اور سارہ ابھی یہیں پر تو ہے' پروگرام پھر کبھی بن جائے گا۔"

"رخ! تھکی ہوئی ہے' مجتبیٰ بھائی! آپ نذیراں سے کہہ کر چائے بنوالیں۔"

"میری وائٹ شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی نہیں مل رہی رخ۔" مختلف اوقات میں مختلف جملے ان کے کانوں سے ٹکرائے تھے۔ لیکن وہ پوری توجہ سے اب انہیں سن رہی تھیں' مفہوم اخذ کر رہی تھیں۔

"اف! آندھی آنے والی ہے' محمد خان کے کمرے کا دروازہ بند کر دو' ڈسٹ اندر چلی جائے گی۔" وہ دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتی وہ خود دروازہ بند کرنے کے لیے بھاگی تھی۔

"اوہ نہوں ۔۔۔ سکینہ کھانے کی ٹیبل پر آج سلاد نہیں ہے' محمد خان سلاد کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔" وہ اپنا کھانا ادھورا چھوڑ کر سلاد بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔

"یہ والے شوز اچھے طریقے سے پالش کر دو۔ محمد خان فرائیڈے کو یہ شوز پہنتا ہے۔"

"نہیں سارہ! آئس کریم رہنے دو' محمد خان کا گلا خراب ہو جاتا ہے آئس کریم سے۔" آوازوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

"محمد خان یہ ۔۔۔ محمد خان وہ ۔۔۔" محمد خان اور ماہ

www.paksociety.com

رخ۔۔ ماہ رخ اور محمد خان۔

"اومائی گاڈ۔" وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اس نے اضطراری انداز میں ایک بار پھر وال کلاک کی جانب دیکھا تھا۔ بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ گھڑی کی ٹک ٹک اور دل کی دھک دھک آپس میں الجھ رہی تھیں اور پھر جوں ہی سوئی نے بارہ کے ہندسے کو چھوا وہ خود پر ضبط کھوتی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اتنی اہمیت اختیار کر گئی ہے ژالے آفریدی تمہارے لیے کہ تم رخ کی برتھ ڈے تک بھول جاؤ۔" منہ پر ہاتھ رکھے وہ اپنی سسکیوں کا گلا دبانے کی سعی کر رہی تھی لیکن آنسوؤں کے سیل رواں کے آگے سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ جو ہر سال کئی دن پہلے ہی اہتمام سے اس کی برتھ ڈے منانے کی تیاریاں شروع کر دیتا تھا اس بار اسے وش تک کرنا بھول گیا۔

نہ جانے کتنا وقت بیت گیا' وہ یوں ہی ہچکیوں سے روتی رہی پھر اچانک تختی سے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی میری برتھ ڈے بھول جانے کی۔" وہ غصے سے تن فن کرتی اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دھاڑ سے دروازہ کھولا اور پہلا قدم اندر رکھتے ہی فریز ہو گئی۔ گلاب کی ڈھیر ساری سرخ پتیاں اس کے سر پر سے نچھاور ہوتی قدموں میں گری تھیں۔ کمرے کے وسط میں دو کرسیوں کے بیچ کرسٹل کی گول میز پر اس کے فیورٹ چاکلیٹ کیک پر موم بتیاں روشن کرتا وہ ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔" اور اسے نہ جانے کیا ہوا' دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو دی۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب آگیا تھا۔

"اپنی برتھ ڈے پر کون روتا ہے؟" اس نے اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے تھے۔

"مجھے اپنی سوچ پر رونا آرہا ہے۔ تم نہیں جانتے محمد خان ابھی کچھ دیر پہلے میں تمہارے بارے میں۔" محمد خان نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔

"وجہ چاہے جو بھی ہو مجھے تمہارے آنسو ہمیشہ تکلیف دیتے ہیں' پلیز رخ۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔ ادھ کھلے دروازے پر کچھ چٹکا تھا۔ اس کی نظر بھٹک گئی لیکن محمد خان اس کا ہاتھ کھینچتا ٹیبل پر لے آیا تھا۔ اس کے لمس میں ڈھیر ساری اپنائیت' مان' اعتماد' پناہ سب کچھ تھا۔

"تمہارا بریسلیٹ بہت پیارا ہے۔ اس نے دیا ہے۔" وہ اس کی کلائی کی طرف اشارہ کرتا پوچھ رہا تھا۔ ماہ رخ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"بہت اچھی چوائس ہے اس کی۔"

"اس کا اندازہ تمہیں بریسلیٹ نہیں مجھے دیکھ کر ہو جانا چاہیے تھا۔" اس نے مصنوعی کالر اکڑائے۔ محمد خان کو ہنسی آگئی۔

بہت انمول پل تھے وہ۔ اسے لگا اس نے اپنی پوری زندگی جی لی ہو۔ "تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو محمد خان! سدا ایسے مسکراتے رہو۔" اس نے جھلملاتی نگاہوں سے اس کے معصوم خوب رو چہرے کا بوسہ لیا تھا۔ دروازہ بند کرکے وہ پلٹی تو ٹھٹک کر رک گئی۔ مجتبیٰ کی شعلے برساتی آنکھیں اس کا چہرہ جھلسانے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیاری کی یہ کیسی آگ تھی جس نے لمحہ بھر میں ماہ رخ کا وجود خاکستر کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بابا کی انجائنا کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ ان کے بزنس فرینڈ اپنی ریڑھ کی ہڈی کے چیک اپ کے لیے لندن جا رہے تھے۔ انہوں نے لگے ہاتھوں بابا کو بھی اپنے ساتھ چل کر اپنا تفصیلی چیک اپ اور مکمل علاج کروانے کی آفر کی۔ جو انہوں نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد قبول کر لی تھی۔ بزنس کے حوالے سے انہیں کوئی ٹینشن نہیں تھی۔ مجتبیٰ نے سب کچھ بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیا تھا اور اسلام آباد والی نئی

برانچ انہوں نے محمد خان کے حوالے کر دی تھی۔ یہ نئی برانچ اس کے لیے ٹاپ فلور پر چڑھنے کے لیے پہلی سیڑھی کی مانند تھی اور وہ اس سلسلے میں بہت پراعتماد تھا۔ مجتبیٰ' ماہ رخ کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہا تھا۔

اسے اکیلے میں اس سے بات کرنے کا کوئی موقع نہیں مل پا رہا تھا اور سب کی موجودگی میں وہ یوں اس سے لاتعلق ہو کر بیٹھتا کہ نگاہ غلط ڈالنے کا بھی روادار نہ ہوتا۔ ماہ رخ کے لیے یہ صورت حال بہت پریشان کن تھی۔ وہ اس سے کھل کر بات کرنا چاہتی تھی۔ اپنی پریشانی میں گھرے رہنے کے باوجود اسے محسوس ہوا محمد خان کچھ بجھا بجھا سا ہے' گم صم اور اداس۔

"محمد خان! کیا مجھے تم سے یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ تمہیں کیا چیز پریشان کر رہی ہے؟" اس کی گہری بھوری آنکھیں اس وقت بہت اداس لگ رہی تھیں۔ پژمردہ وجود اور تھکے تھکے اعصاب۔

"ان کے ہاں وٹے سٹے کا رواج ہے رخ! انہوں نے بدلے میں شمویل لالہ کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔" ماہ رخ سناٹوں میں گھر گئی۔ محمد خان نے محض ایک نظر اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا تھا۔

"تم پریشان مت ہو رخ! میں اس معاملے میں تمہیں انوالو نہیں کروں گا۔"

"تم نے ژالے سے بات کی؟ وہ کیا کہتی ہے؟"

"وہ بے بس ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔" اس کا انداز شکست خوردہ سا تھا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے رخ! خواہش کی خوشنما تتلی خود ہی ہتھیلی پر آ بیٹھتی ہے اور اگر چھونے کے لیے ہاتھ بڑھائیں تو اڑ کر دور کہیں بسیرا کر لیتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے رخ۔" ماہ رخ کا دل پگھلنے لگا تھا۔ وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے چپ چاپ پگھلتی رہی۔ موم کی مانند! مجتبیٰ کا رویہ' محمد خان کی خواہش اور میری محبت' اسے اپنا وجود کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوتا محسوس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تمہاری شادی سارہ کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا ہے محمد خان! تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟" مما نے بہت آرام سے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"واٹ؟" وہ اچھل ہی تو پڑا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا برائی ہے سارہ میں؟"

"کوئی برائی نہیں ہے سارہ میں۔ لیکن میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں مما۔" بلا ارادہ اس کے منہ سے پھسل گیا تھا۔ وہ ایسی کسی بھی سچویشن میں مما کو یہ بات بتانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ رخ نے کہا تھا میں خود مما سے اس سلسلے میں بات کر لوں گی تم جلد بازی سے کام مت لینا' لیکن اب۔

"لیس! آئی نو۔" مما کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیلی تھی جبکہ محمد خان اپنے رنگ کرتے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کی بہت اہم کال تھی۔ اسے ضروری میٹنگ میں شرکت کے لیے فوراً" اسلام آباد پہنچنا تھا۔

"اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے مما۔" وہ جلدی سے باہر نکل گیا تھا۔

"او پھپھو! اس نے آپ کی مصروفیت اور حد سے بڑھے اعتبار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے گھر کے ساتھ ساتھ محمد خان پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔ وہ محمد خان کو اپنی ذاتی پراپرٹی سمجھتی ہے۔ پھانس لیا ہے اس نے محمد خان کو۔"

اگر سارہ مجھے اس بات کا احساس نہ دلاتی تو۔ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ میری حد سے بڑھی ہوئی لاتعلقی نے اسے اتنا دلیر بنایا ہے کہ میرے بیٹے سمیت آہستہ آہستہ سب پر اپنا قبضہ جما لیا۔ سوتیلی اولاد پر اتنا اعتماد' مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی بے وقوف ہو گا؟ ان کے پاس کف افسوس ملنے کے لیے وجوہات کی کمی نہیں تھی۔

"مجتبیٰ! رکیں پلیز۔" سیڑھیاں اترتے مجتبیٰ کو دیکھ کر ماہ رخ تیر کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ وہ بادل ناخواستہ رکا تھا۔

"کیوں کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا؟ میرا قصور تو بتائیں کس بات کی اتنی کڑی سزا دے رہے ہیں؟ میری طرف دیکھیں مجتبیٰ پلیز۔" اتنے دنوں کی

اذیت آنکھوں کے رستے لہو بن کر ٹپکنے کو بے تاب تھی۔ وہ لب بھینچے غصے سے اسے دیکھتا زہرخند لہجے میں بولا۔

"خود کو ذرا غور سے آئینے میں دیکھو تمہارا ایک ایک عضو تمہیں تمہاری اصلیت بتائے گا۔"

"ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کریں مجھ سے پلیز میں نے تو آپ سے محبت کی ہے۔"

"محبت کا لفظ تمہاری زبان پر جچتا نہیں ہے۔ جسے رشتوں کے تقدس کے احترام کا پتا نہ ہو اسے کیا معلوم کہ محبت کیا ہے؟ تمہاری اصلیت' تمہارا بے نقاب چہرہ سب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔"

"نہیں' آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلیز مجھے بے اعتباری کی موت مت ماریں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں' آپ کے علاوہ۔۔۔"

اسے لگا آج روز حشر ہے۔ لیکن نہیں روز حشر انسان سے اس کے ناکردہ گناہوں کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے تپتی ریت پر نہیں گھسیٹا جائے گا۔

"بکواس بند کرو' الو کا پٹھا سمجھ رکھا ہے کیا مجھے؟ کون لگتا ہے وہ تمہارا؟ بھائی' اپنی عمر سے چھوٹے سوتیلے بھائی کے ساتھ۔۔۔ چھی۔" اس نے زمین پر تھوکا تھا اور ماہ رخ کو لگا اسے کسی نے بے رحمی سے دہکتے الاؤ میں پھینک دیا ہو۔ اس کا وجود جلنے لگا تھا۔ آنکھیں' خواب' خواہش' محبت ایک ایک کر کے سب جل کر خاکستر ہوئے۔

"مما!" ان اذیت ناک لمحوں میں اس نے خدا کے بعد پاپا اور محمد خان کو پکارنا چاہا لیکن سامنے سے آتی مما کو دیکھ کر اس کی امیدوں کا گل ہوتا چراغ ایک بار پھر بھڑک کر جل اٹھا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ گل ہوتا چراغ بجھنے سے پہلے ایک بار ضرور بھڑک کر جل اٹھتا ہے ہمیشہ بجھنے کے لیے۔

"مما! مجتبیٰ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے وہ مجھ سے۔۔۔ انہیں لگتا ہے۔" آنکھوں کے سامنے تنی دھند کی چادر میں مما کا چہرہ دھندلا رہا تھا۔ وہ مما کے سامنے مجتبیٰ کی غلط فہمی کو زبان نہیں دے پا رہی تھی۔

"کیوں کھیل رہی ہو یہ ڈبل گیم؟ ایک طرف مجتبیٰ دوسری طرف محمد خان! کیا تم نہیں جانتیں دو کشتیوں کا مسافر کبھی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔" اس کے قدموں سے کسی نے زمین کھینچ لی تھی۔

"مما! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"اب ہی تو ٹھیک سمجھی ہوں۔ میرے بیٹے کو تمہارے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا' اٹھتے' بیٹھتے' سوتے جاگتے' کھاتے پیتے اس کے حواسوں پر صرف رخ چھائی رہتی ہے اسے میں کیا نام دوں ہاں؟" اس نے اذیت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"کیوں آکاس بیل کی مانند میرے بیٹے کے وجود سے چمٹ گئی ہو؟ دور کیوں نہیں ہو جاتیں اس سے' پیچھا چھوڑ دو میرے بیٹے کا۔" اتنے بے رحم الفاظ تو کائی کی ماں بھی استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس کے مکوں' طمانچوں اور گھونسوں سے اتنی تکلیف کائی کو نہیں ہوتی ہو گی جتنی اس وقت اسے ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کیں۔ اسے لگا اگر اس وقت خاموش رہی تو ان الزاموں کا بوجھ ساری زندگی اس کے لیے خلش بنا رہے گا۔

"مما! ایسا کچھ نہیں ہے آپ۔۔۔"

"اچھا! تو پھر یہ کیا ہے؟" انہوں نے تمسخرانہ انداز میں کتنے ہاتھوں میں پکڑی تصویریں اس کے منہ پر اچھال دیں۔ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی' انگلی کی پوروں سے اس کے آنسو چنتا محمد خان' اس کا ہاتھ کھینچ کر کیک کی طرف لے جاتا' گفٹ کھولنے پر مصر محمد خان اور اسے مصنوعی خفگی سے گھورتی رخ۔ وہ انمول' قیمتی پل اس وقت اس کے قدموں میں پڑے سسک رہے تھے۔ تو یہ سب کچھ باقاعدہ پلان شدہ تھا۔ اس کی پتھرائی نگاہیں بے ساختہ ریلنگ پر جھکی سارہ کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ کندھے اچکاتی عیاری سے مسکرا دی اور اسی پل ماہ رخ غش کھا کر پورے قد سے ڈھے گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

"نا میں! جب تک رخ اپنے ہاتھوں سے نہیں کھلائے گی میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ رخ! مجھے ڈر لگ رہا ہے تم میرے ساتھ سو جاؤ نا' پلیز۔"

"رخ! کہاں ہو تم' جلدی سے میرے سامنے آجاؤ۔" وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھے سامنے آتی ایک ایک چیز سے ٹکرا رہا تھا۔

"اف محمد خان! کیوں کر رہے ہو ایسا؟ چوٹ لگ جائے گی تمہیں۔"

"آج کا دن میرے لیے لکی ہے نا تو میں سب سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں آکاس بیل کی مانند میرے بیٹے کے وجود سے چمٹ گئی ہو؟"

"مما! خوب صورت ہیں اور تم پیاری ہو' بہت پیاری۔"

"پیچھا چھوڑ دو میرے بیٹے کا۔ کیوں اس کے حواسوں پر سوار ہو؟" اس کی بند آنکھوں سے آنسو کنپٹی سے بہتے تکیے میں گم ہو رہے تھے۔ وہ آنکھیں کھولنے سے گریزاں ساری دنیا سے کترا رہی تھی۔

مجتبیٰ نے حقارت سے اس پر تھوک دیا تھا۔ ریلنگ پر جھکی سارہ زور زور سے قہقہے لگاتی اپنی فتح کا جشن منا رہی تھی' مما کی کٹیلی۔۔۔ تمسخر اڑاتی نگاہیں اس کے وجود کے آر پار ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے گلابی کمبل میں لپٹا اپنا گلابی گڈا یاد آ رہا تھا۔ اپنا پلو پکڑے پیچھے پیچھے پھرتا نیکر اور بنیان میں ملبوس اپنا شہزادہ یاد آ رہا تھا۔ اسے آوازے کسنے والے آوارہ لڑکوں پر پل پڑتا اپنا غیرت مند بھائی یاد آ رہا تھا۔

"ہاں بھائی! بھائی ہی تو ہے وہ میرا' اس نے میری ماں کی کوکھ سے جنم نہیں لیا' اس کی رگوں میں میرے باپ کا خون نہیں دوڑ رہا' میں نے اسے زبان سے کبھی بھائی نہیں کہا' لیکن میرے لیے وہ میرا سب سے حقیقی اور شرعی رشتہ ہے۔ میرا جرم یہی ہے کہ میں نے رشتے کو رشتے کے نام سے نہیں پکارا۔ اتنا چھوٹا جرم اتنی بڑی سزا۔"

"آہ۔۔۔" اس کے لبوں سے ایک ٹوٹی ہوئی کراہ نکلی تھی۔ محمد خان سرخ چہرہ لیے اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ بے حد فکر مند اور ملول۔

"جہاں زیب انکل نے کہا ہے تمہیں کوئی شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ میرے پیچھے ایسا کیا ہوا تھا رخ؟" اسے محمد خان کی لہو رنگ آنکھوں سے خوف آیا تھا۔ مرنے یا مرجانے پر تلی آنکھیں۔ (بیٹیوں کو ماؤں کے راز رکھنے آتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے' ماں سگی ہے یا سوتیلی؟)

"تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا محمد خان؟"

"تمہاری اس حالت کا ذمہ دار کون ہے رخ مجھے بتاؤ؟"

"میں نے تمہیں کھانا کھانے سے منع کیا تھا' تم نے پانی کیوں نہیں پیا؟"

"رخ! کسی نے تم سے کچھ کہا تھا؟"

"کیا تم میرے ساتھ باسی چکن پلاؤ کھانا پسند کرو گے محمد خان؟"

"رخ میں تم سے۔۔۔"

"مجھ سے اونچی آواز میں بات مت کرو۔" اس نے خفگی سے ٹوکا۔

"اوکے! سوری!" وہ فوراً" دھیما ہوا تھا۔ وہ بڑی تھی' اس نے رعب جھاڑا وہ چھوٹا تھا' فوراً" رعب میں آگیا۔ لیکن یہ بات وہ دنیا کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ وہ دنیا کو اپنا دل کھول کر نہیں دکھا سکتی تھی کہ دلوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔

✲ ✲

چار دن بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا اور ان چار دنوں میں محمد خان کو اس کے سوا نہ کوئی دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی کچھ سجھائی' پانچویں دن وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"تم مجھے اپنی کیا سمجھتے ہو محمد خان؟"

"میں نہیں جانتا ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے' یہ تعلق کی کون سی قسم ہے؟ مجھے بس اتنا پتا ہے کہ تمہاری ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے' مجھے لگتا ہے میری کامیابیوں کی سب سے زیادہ خوشی تمہیں ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار تم

نے یہ ہتھیلی چومتے ہوئے کہا تھا۔ ان ہاتھوں سے کبھی کوئی غلط کام مت کرنا خان ورنہ اس کے نتیجے میں خود کو ذمہ دار سمجھوں گی۔ اس دن سے لے کر ہر پل ہر لحہ مجھے تمہاری بات یاد رہی۔" ماہ رخ کے جلتے دل پر نرم ٹھنڈی میٹھی پھوار برسنے لگی تھی۔ دل پہ دھرا سارا بوجھ آہستگی سے سرک رہا تھا۔ ایک جذب کی سی کیفیت میں وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھتا جا رہا تھا۔

"بس! میرے لیے یہی کافی ہے۔ مجھے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں' میں مزید کسی کو وضاحت نہیں دوں گی۔"

شام کو اس کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرتے وہ کہہ رہی تھی۔

"تم ژالے سے کہو مجھے شموئیل آفریدی کا رشتہ منظور ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں بھیگنے نہیں دی تھیں۔

"نہیں! میں ایسا کچھ نہیں کہوں گا۔ تم نے کہا تھا ناکہ تم کسی سے محبت کرتی ہو؟"

"میں نے تو یہ بھی کہا تھا۔ اگر تمہاری خوشی کی بات ہوئی تو ایسی ہزار محبتیں قربان۔" لیکن محمد خان اس کے ارمانوں پر اوس گرا کر اپنا گلشن آباد نہیں کر سکتا تھا' کبھی نہیں۔

"نہیں! رخ میں تمہاری محبت۔"

"وہ محبت نہیں تھی محمد خان۔" اس کا لہجہ بہت پست تھا۔

"اس نے دھوکہ دیا ہے؟"

"نہیں! میں نے دھوکہ کھایا ہے۔" اس نے اپنی آنکھوں کی ساری نمی اپنے اندر اتار لی تھی۔ محمد خان نے کہا تھا' وجہ چاہے جو بھی ہو مجھے تمہارے آنسو تکلیف دیتے ہیں اور وہ اسے تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔

بابا لندن سے واپس آگئے تھے اور ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اس رات انہیں سوپ پلاتے وہ کہہ رہی تھی۔

"بابا! مجھے شموئیل آفریدی سے شادی کرنی ہے' ان کے ہاں وٹے سٹے کا رواج ہے' تو وہ بدلے میں محمد خان کے ساتھ ژالے آفریدی کی شادی کرنے پر تیار ہیں۔" بابا نے بہت چونک کر اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

"لیکن بیٹا! میں نے تو تمہاری شادی مجتبی کے ساتھ کرنے کا سوچ رکھا تھا؟"

"میں ان کے قابل نہیں ہوں بابا۔" اس نے اپنا سر مزید جھکا لیا تھا۔

"اور تمہاری مما! وہ تو محمد خان کی شادی سارہ سے کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہیں۔" انہیں صحیح معنوں میں پریشانی ہوئی تھی۔ حالانکہ لندن سے واپسی کے بعد وہ سب سے پہلے اس موضوع پر اس سے بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن کچھ تھا ایسا جو انہیں روک گیا تھا اور اب۔ اس پر گزرے واقعہ کو ان سے بہت آسانی سے چھپا لیا گیا تھا۔ وہ بہت غور سے بادل میں چھپے ہاتی اپنی بے حد سلجھی ہوئی بیٹی کو دیکھ رہے تھے' جس نے زندگی کے کسی مقام پر انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔

"سارہ کے لیے اور بہت سے رشتے مل جائیں گے بابا! لیکن محمد خان کو پھر کوئی ژالے نہیں ملے گی۔" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر' زور سے پلکیں جھپکتی باؤل اٹھائے باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼

اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکائے محویت سے اپنے سفر کا ہمسفر چاند کو تک رہی تھی۔ مٹا سا کاجل اس کی آنکھوں کے کنارے پھیل گیا تھا۔ کلائیوں میں سجے گجرے مرجھا چکے تھے۔ اس نے سبز وپیلے امتزاج کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ اس کے وجود سے مہندی اور ابٹن کی ملی جلی مہک اٹھ رہی تھی۔ آج اس کی اس گھر میں آخری رات تھی۔ اس کے ولیمہ والے دن محمد خان کا ژالے کے ساتھ نکاح تھا۔

بابا نے کہا تھا وہ سب سنبھال لیں گے اور انہوں نے واقعی سب سنبھال لیا تھا۔ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا' اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ محمد خان اداسی سے مسکراتا اندر آگیا تھا۔

"آئس کریم کھانے چلوگی؟"

"نہیں! تمہارا گلا خراب ہو جائے گا۔" نم آنکھوں سے مسکراتے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں اپنی نہیں تمہاری بات کر رہا ہوں۔" کون کہتا ہے مرد رویا نہیں کرتے۔ صرف آنکھ سے آنسو ٹپکانے ہی کو تو رونا نہیں کہتے' کوئی ان کے اندر جھانکے' نمکین آنسوؤں کا سمندر موجزن دکھائی دے گا۔

"اس حلیے میں؟" وہ جان بوجھ کر ہنسی تھی۔

"ہاں! کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اس وقت سب سو رہے ہیں خان! ہمارا یوں باہر نکلنا مناسب نہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو رخ! لیکن میں تمہارے ساتھ اس آخری رات کے چند حسین پل اپنی مٹھی میں قید کرنا چاہتا ہوں۔" اور وہ بڑی سی چادر اوڑھ کر اس کے پیچھے پلنگ پر بیٹھی آہستگی سے اپنی انگلی کی نوک سے آنسو جھٹکتی پونچھ رہی تھی۔

"جب کبھی تم اپنی یہ مٹھی کھولو گے تو کیا نکلے گا محمد خان؟"

"خوب صورت مہکتی یادیں! جو میری ساری اداسی کہیں دور لے جائیں گی۔"

☼ ☼

اگلے دن اس نے نم آنکھوں کے ساتھ دلہن بنی ماہ رخ کو قرآن مجید کے سائے تلے رخصت کیا تھا۔ شدید ترین حیرت اور بے یقینی میں گھری مما ان دونوں کے چہروں پر بے سکونی تلاشتی رہ گئی تھیں۔ جن کی نیتوں میں کھوٹ اور دلوں میں چور ہوں' ان کے چہروں پر اس قدر اطمینان نہیں جھلکا کرتا' بہت غلط وقت پر انہیں اس بات کا احساس ہوا تھا۔ انہوں نے بیسویں بار آنکھیں مسلتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید کہ سامنے کا منظر کوئی الوژن' کوئی واہمہ' کوئی خواب ہو' لیکن حقیقت مجسم ہو کر اپنا وجود منوا چکی تھی۔

سامنے اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی ماہ رخ کے دائیں جانب کسی فاتح کی مانند سر اٹھائے سرشار سا شموئیل آفریدی' بائیں جانب سجی سنوری' کچھ جھینپی جھینپی سی ژالے اور ان کے عقب میں ہنستا مسکراتا محمد خان' کچھ منظر کتنے خوب صورت اور مکمل ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا' یہ کیسا احساس زیاں تھا؟ ماہ رخ نے مجتبی کی ہتھیلی پر بریسلیٹ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"زندگی دوبارہ کسی کو یہ پہنانے کا موقع دے تو اس سے محبت بے شک مت کریں لیکن اس پر اعتبار ضرور کیجیے گا کیونکہ وہ آپ کی محبت کے بغیر ساری زندگی رہ لے گی لیکن اعتبار کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ پائے گی۔" مجتبی کی ہتھیلی پر آگ لگ گئی تھی۔ اس نے سارہ کو اور سارہ نے اسے دیکھا تھا اور پھر دونوں نے ایک ساتھ مما کو' دوسرے ہی لمحے تینوں کی نگاہیں جھک گئیں۔ انہیں حقیقت کے آئینے میں اپنا اپنا عکس نظر آگیا تھا۔

شموئیل آفریدی شادی کے بعد اسے اپنے ساتھ پشاور لے آیا تھا۔ اس کے اور محمد خان کے بیچ ڈھیر سارا زمینی فاصلہ در آیا تھا۔ لیکن اس نے ہواؤں کو اپنا پیامبر نہیں بنایا تھا۔ سرمئی گاتے پنچھیوں کے پنجوں میں محبت نامے نہیں اڑسے تھے۔ اس نے چاند میں چاند چہرے کا عکس ڈھونڈ لیا تھا۔

"یہ تم چاند میں ہر وقت کیا تلاشتی رہتی ہو؟" شموئیل کو اپنی محبوب بیوی ہمیشہ ایک خوب صورت راز لگتی تھی۔ مہربان اور پاکیزہ۔

"مجھے اس میں کسی کا عکس نظر آتا ہے۔" وہ مبہم سا مسکرائی تھی۔ بابا کا فون آیا تھا' پوچھ رہے تھے۔

"شموئیل کیسا ہے ماہ رخ؟" تب اس نے کہا تھا۔

"میں نہیں جانتی بابا وہ کیسے ہیں' جب آپ میرے سامنے ہوتے ہیں مجھے وہ بھول جاتا ہے لیکن جب میں اسے دیکھتی ہوں مجھے آپ یاد آجاتے ہیں۔" بابا مسکرا دیے تھے اور شموئیل کا انتظار کرتے حسب معمول چھت پر ٹہلتے ہوئے وہ اپنے دو سالہ بیٹے کو گود میں لے کر دور چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"احمد خان! وہ دیکھو چندا ماموں!" بھائی بہنوں کے لیے چاند ہی تو ہوتے ہیں۔

☼ ☼

شعلہ عنبر

کرن کرن خوشبو

ظلم اور بخل کی تباہ کاریاں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ظلم سے بچو' کیوں کہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہوگا اور بخل سے بچو' کیوں کہ بخل نے ان لوگوں کو ہلاک کردیا' جو تم سے پہلے تھے۔ اس نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ انہوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا اور حرام چیزوں کو حلال سمجھا۔" (صحیح مسلم)

خالدہ پروین ۔۔۔ بھائی پھیرو

حقیقی عشق

مولانا رومی ایک دن خرید و فروخت کے سلسلے میں بازار تشریف لے گئے۔ ایک دکان پر جاکر وہ رک گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت سودا سلف لے رہی ہے۔ سودا خریدنے کے بعد اس عورت نے رقم ادا کرنی چاہی تو دکاندار نے کہا۔ "عشق میں حساب کتاب کیسا؟ پیسے کی بات چھوڑو اور گھر جاؤ۔" اصل میں یہ دونوں عاشق اور معشوق تھے۔

مولانا رومی اس کی بات سن کر غش کھا کر گر پڑے۔ دکاندار یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس دوران وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب مولانا کو ہوش آیا تو دکاندار نے پوچھا۔ "مولانا صاحب! آپ کیوں بے ہوش ہوگئے تھے؟"

مولانا رومی نے جواب دیا۔ "میں اس بات پر بے ہوش ہوا کہ تم دونوں میں عشق اتنا قوی اور مضبوط ہے کہ آپس میں کوئی حساب کتاب نہیں جبکہ اللہ کے ساتھ میرا عشق اتنا کمزور ہے کہ میں تسبیح کے دانے بھی گن گن کر کرتا ہوں۔"

بشریٰ مزمل فاطمہ ۔۔۔ پھول نگر

سنہرے حروف

☆ بری صحبت سے تنہا رہنا بہتر ہے۔

☆ مجھے وہ دوست پسند ہے جو محفل میں میری غلطیاں چھپائے اور تنہائی میں میری غلطیوں پر مجھے سمجھائے۔

☆ کمزور انسان کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ معاف کرنا مضبوط لوگوں کی صفت ہے۔

☆ گناہوں کی بدبو کی وجہ سے ہماری دعائیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

☆ بات الفاظ کی نہیں' لہجے کی ہوتی ہے۔

☆ زندگی بہت مختصر ہے۔ اسے عداوتوں کے پیچھے ضائع نہ کیجیے۔

☆ بڑا انسان وہ ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا نہ سمجھے۔

☆ آزادی کی تکلیف' غلامی کے آرام سے بہتر ہے۔

☆ ہم صرف اپنی پیدائش ہی پر غور کرلیں تو ہمارا سارا غرور و تکبر خاک میں مل جائے۔

☆ نیکی کرنا آسان ہے لیکن نیکی کی حفاظت کرنا بہت مشکل ہے۔

انیقہ ثنا ۔۔۔ چکوال

موتی

☆ نفس کو تین چیزوں سے قابو میں رکھا جاسکتا ہے

خاموشی کے خنجر سے

بھوک کی تلوار سے

تنہائی کے نیزے سے

☆ غم کھاری پانی والے سمندر کی طرح ہے
وہ سمندر جس سے قیمتی موتی نکلتے ہیں
اور
خوشی میٹھے پانی کا دریا ہے جس سے مچھلیاں نکلتی ہیں۔

☆ دل کو تین چیزیں سخت کردیتی ہیں
زیادہ سونا' زیادہ کھانا اور زیادہ بولنا۔

☆ قلب و نظر اور جسم و جاں کا گداز انسان کو دونوں عالم میں سرفراز کرتا ہے۔ سوز و گداز کے بغیر نہ محبت کا کوئی مفہوم ہے نہ زندگی کا کوئی ماحاصل۔

آمنہ امداد ۔۔۔ سرگودھا

"دو پتھر"

میرا حسن ہے قسلوی میں ہوں پتھروں کا عادی
میرے دل پر پتھروں کا بڑا سخت ہے دباؤ
پکھراج اور نیلم یاقوت اور زمرد
انہی پتھروں کو لے کر اگر آسکو تو آؤ

ثمینہ کوثر عطاری ۔۔۔ ڈوگہ گجرات

شاعر
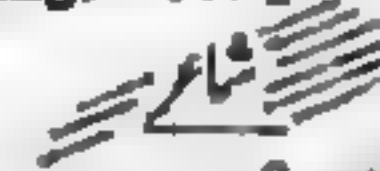
کیسے کاریگر ہیں یہ؟
آس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں اور سیڑھیاں بناتے ہیں
کیسے باغبان ہیں یہ؟
غم کے بیج بوتے ہیں اور دلوں میں
خوشیوں کی کھیتیاں اگاتے ہیں
کیسے چارہ گر ہیں یہ؟
وقت کے سمندر میں کشتیاں بناتے ہیں
آپ ڈوب جاتے ہیں

انیقہ ثنا ۔۔۔ چکوال

سوچ کے رخ

☆ بے شک دلوں میں برے خیالات آتے ہیں مگر عقل و دانش انسان کو ان سے دور رکھتی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ تم اچھا کرو اور زمانہ تم کو برا سمجھے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے بجائے اس کے کہ تم برا کرو اور زمانہ تم کو اچھا سمجھے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ کردار ایک ایسا آئینہ ہے' جس میں ہر کوئی اپنا عکس دیکھتا ہے۔ (گوئٹے)

☆ عقیدت کا براہ راست تعلق دل سے ہوتا ہے دماغ سے نہیں۔ (برنارڈشا)

☆ توکل کے معنی یہ نہیں کہ روزی کی جستجو نہ کی جائے بلکہ جو اپنی روزی آپ پیدا نہ کرے وہ جاہل ہے۔ (امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ)

☆ کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں
اس لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ (الزبتھ بشپ)

ثریا شاہ ۔۔۔ کوٹ ٹکا

خیال میرا خوشبو سا

☆ اگر ہر رات مجھے آٹھ گھنٹے کی نیند نہیں ملتی تو میں خاکروب کی بالٹی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ (نیوٹن)

☆ اکثر کامیاب لوگوں کو شادی میں کامیابی نہیں ہوتی۔ (پال کیٹی)

☆ دنیا کے تمام اسرار پر ہم جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں۔ وہ اسی قدر اور زیادہ پراسرار بنتے جاتے ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اور تمام نظام عالم کے اوپر ایک ازلی و ابدی قوت موجود ہے۔ جس کی تمام چیزوں پر حکومت ہے۔ (فیثا غورث)

☆ عورت کے لیے قدرت کا پہلا تحفہ "حسن" ہوتا ہے اور قدرت اس سے یہی تحفہ سب سے پہلے چھین لیتی ہے۔ (مرے)

☆ وہ تو اچھا ہوا کہ ابلی کے پر نہیں ہوتے ورنہ اس دنیا

میں چڑیوں کی نسل مٹ جاتی۔ (شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ)
☆ کامیابی کے دو اہم زینے "لگن" اور خود اعتمادی ہیں (ہٹلر)
☆ اتنے غلط نصیب نہیں جتنے غلط وعدے ہیں۔
☆ کسی کا دل نہ دکھا تیرے پہلو میں بھی دل ہے۔ (ٹالسٹائی)
☆ دوسروں کی خوشی اپنے زخموں کو تازہ کرتی ہے اور غم اپنے غموں کو ہلکا کرتا ہے۔ (فرینکلن)
☆ پہلے قہقہے سے آخری مسکراہٹ بہتر ہے۔ (برطانوی کہاوت)
☆ پر "قاز" کے بھی ہوتے ہیں اور "باز" کے بھی مگر جیسے پرویسی اڑان۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کھوڑ کا

اہم بات

جو حق دار ہیں ان کو بھی دو۔ اور جو ناحق کا مانگنے والا ہے اس کو بھی دو۔ تاکہ ہمیں جو ناحق کا مل رہا ہے۔ کہیں وہ ملنا بند نہ ہو جائے۔ (اشفاق احمد)

فوزیہ ثمریٹ ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

مشورہ

سنو! صاحب اک مشورہ چاہیے تھا
دل توڑا ہے ایک بے وفا نے
جان دوں یا جانے دوں۔۔۔

فوزیہ ثمریٹ۔۔۔ گجرات

کرنیں

☆ محبت کا رشتہ ایک کچے دھاگے کی طرح ہوتا ہے جو ٹوٹنے کے بعد جڑ تو جاتا ہے پر اس میں گرہ آجاتی ہے۔
☆ اس دنیا میں کوئی غروب آخری نہیں ہر غروب کے بعد ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے بشرطیکہ آدمی اپنی شام کو صبح میں بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔
☆ انسان اپنے اوصاف سے ہی عظیم ہے۔ کبھی بلند مینار پر بیٹھنے سے عقاب نہیں بن جاتا۔
☆ آسمان پر نگاہ ضرور رکھو مگر یہ مت بھولو کہ تمہارے قدم زمین پر ہیں۔
☆ اپنی شمع جلانے کے لیے ضروری نہیں کہ دوسروں کے چراغ بجھائے جائیں۔
☆ وہ لوگ کبھی تنہا نہیں ہوتے جن کے ساتھ خوب صورت خیالات ہوتے ہیں۔
☆ چلتے وقت دھیان رکھو کہ تمہارے قدموں کی دھول سے کسی کی منزل نہ کھو جائے۔

صبا نوشاہی۔۔۔ ڈوگہ گجرات

بات سے بات

☆ جس کا آغاز نہ ہو اس کا انجام نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر آغاز سے پہلے ہے اور ہر انجام کے بعد۔
☆ یتیم کا مال کھانے والا ہزار یتیم خانے بنائے سکون نہیں پائے گا۔
☆ پیٹ میں آگ ہو تو دل میں سکون کہاں۔
☆ رزق حلال نہ ہو تو سکون قلب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
☆ اگر کہیں بھی شک ہو کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کے قریب ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ۔
☆ قائم ذات سے محبت کرو گے تو تم بھی قائم ہو جاؤ گے۔
☆ عبادت اس مقام پر نہیں پہنچا سکتی جہاں غریب کی خدمت پہنچاتی ہے۔

دن رات

اب میسر نہیں فرصت کے وہ دن رات ہمیں
لے اڑی جانے کہاں صرصر حالات ہمیں
کیسے اڑتے ہوئے لمحوں کا تعاقب کیجیے
دوستو! اب تو یہی فکر ہے دن رات ہمیں
نہ سہی کوئی ہجوم گل و لالہ نہ سہی
وشت سے کم بھی نہیں کنج خیالات ہمیں
(شکیب جلالی)

صائمہ۔۔۔ کراچی

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے

انیقہ انا، کی ڈائری میں تحریر

سراج اورنگ آبادی کی غزل

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی!
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم، جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں کروں بیاں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جوں دھری تھی توں دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری کوں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

مہرین، کی ڈائری میں تحریر

فہمیدہ ریاض کی نظم

پچھتاوا

خدائے ہر دو جہاں نے جب آدمی کو پہلے پہل سزا دی
بہشت سے جب اسے نکالا گیا
تو اس کو بخشا گیا یہ ساتھی
یہ ایسا ساتھی تھی جو ہمیشہ ہی آدمی کے قریں رہا ہے
تمام ادوار جہاں ڈالو
روایتوں میں، حکایتوں میں
ازل سے تاریخ کہہ رہی ہے
کہ آدمی کی جبیں ہمیشہ ندامتوں سے عرق رہی ہے
وہ وقت جب سے کہ آدمی نے
خدا کی جنت میں شجر ممنوعہ چکھ لیا
اور سرکشی کی
تبھی سے اس پھل کا یہ کسیلا سا ذائقہ
آدمی کے کام و دہن میں ہر پھر کے آ رہا ہے
مگر ندامت کے تلخ سے ذائقے سے پہلے
گناہ کی بے پناہ لذت

حرا قریشی، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

دل فکر دوا سے بچ گیا ہے
اب درد رگوں میں رچ گیا ہے

ماتم تھا یہ کس کا شہر جاں میں
صحرا میں بھی شور مچ گیا ہے

رائج ہے زباں مصلحت کی
اب شہر سے جھوٹ بچ گیا ہے

منصف کا حساب، خیر چھوڑو
قاتل کو تو قتل بچ گیا ہے

اب گرد کی تہہ کو کیا ہٹاؤں
ملبوس یہ تن پہ بچ گیا ہے

محسن وہ عجیب سخت جاں تھا
جو زہر بھی پی کے بچ گیا ہے

رضوانہ، کی ڈائری میں تحریر
وفا بریلوی کی غزل

اب ہیں کانٹے میری زبان میں کیا!
کچھ کہہ دیا ہے شان میں کیا!

بے حسی، خودسری و بے زاری
اور رکھا ہے اس جہان میں کیا!

ہر طرف ہیں مہیب سناٹے
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا!

سب اثاثے فروخت کر ڈالے
اب رکھا ہے میری دکان میں کیا!

اپنے موقف سے کیسے ہٹ جاؤں
فیل ہو جاؤں امتحان میں کیا!

حوصلے ہی ہمارے پست ہوئے
ورنہ رکھا ہے اس چٹان میں کیا!

سنتے ہی چل دیا وفا یک لخت
ایسا کچھ کہہ دیا کان میں کیا!

ارم، کی ڈائری میں تحریر
ارشد معراج کی نظم

محبت کا کہاں پرانت ہوتا ہے؟

کبھی ترک تعلق سے محبت مر نہیں سکتی
خرابے اس وحشت سے صدا آباد رہتے ہیں
جنوں کی انتہا کب ہے؟
کبھی سورج بھی ڈوبا ہے؟
سمندر کا کہیں پرانت ہوتا ہے؟
کبھی تارے مدار وقت سے باہر نکلتے ہیں؟
پتنگے آگ میں جلنے سے ڈرتے ہیں
ازل سے تا ابد یہ اک تسلسل ہے
زمینوں اور زمانوں سے کہیں آگے
تمہارے اور میرے جسم و جاں کی
داستانوں سے کہیں آگے

نوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
جون ایلیا کی غزل

مستی حال کبھی تھی کہ نہ تھی، بھول گئے
یاد اپنی کوئی حالت نہ رہی بھول گئے

حرم ناز و ادا تجھ سے بچھڑنے والے
بت گری بھول گئے، بت شکنی بھول گئے

یوں مجھے بھیج کے تنہا سر بازار فریب
کیا مرے دوست مری سادہ دلی بھول گئے

میں تو بے حس ہوں مجھے درد کا احساس نہیں
چارہ گر کیوں روش چارہ گری بھول گئے

اب کوئی مجھ کو دلائے نہ محبت کا یقین
جو مجھے بھول نہ سکتے تھے، وہی بھول گئے

اور کیا چاہتی ہے گردش ایام کہ ہم
اپنا گھر بھول گئے، اس کی گلی بھول گئے

کیا کہیں کتنی ہی باتیں تھیں جواب یاد نہیں
کیا کریں ہم سے بڑی بھول ہوئی بھول گئے

شگفتہ سلیمان

تاج ور ملک ـــــــ ڈڈوال
رفاقتوں کے دور میں وصل ہوگا حادثہ
مل جائے وہ شخص تو نایاب ہو جائیں گے ہم

نوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات
اجاڑ دے نہ کہیں آنکھ کو یہ ویرانی
گزر گئی ہے اب اک عمر کھل کے روئے ہوئے

عذرا، اقصیٰ ناصر ـــــــ کراچی
ہم ہی ممکن ہے ترے ناز اٹھانے لگ جائیں
پہلے یہ زخم پرانے تو ٹھکانے لگ جائیں
روتے روتے کبھی آنکھ چھلک اٹھتی ہے
کیا کریں دل کو اگر روگ پرانے لگ جائیں

عائشہ خان ـــــــ ٹنڈو محمد خان
تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز مرے گھر میں اتر شام کے بعد

سائرہ عیسیٰ ـــــــ کراچی
سنا ہے اس کے عہد وفا میں ہوا بھی مفت نہیں ملتی
ان گلیوں میں ہر ہر سانس پہ مرتے ہیں جرمانے لوگ

بینش صدف ـــــــ فیصل آباد
دشمن تو پھر دشمن تھا اور اک مدت سے تاک میں تھا
اپنا گھر ویران ہوا ہے اپنوں کی نادانی سے
اب کیا ڈھونڈ رہے ہو ہاتھوں کی بے ربط لکیروں میں
اب کیا حاصل ہوگا تم کو آنکھ کے بہتے پانی سے

راشدہ پروین، محمد وارث ـــــــ لالہ موسیٰ
نگاہ قیس سے دیکھو ہمیشہ حسن لیلیٰ کو
صنم جس کا بھی ہو بے مثال ہوتا ہے

شمع مسکان ـــــــ جام پور
تیری جدائی نے غم ناک کر دیا ہم کو
تیری جدائی کا عالم بھی کیا قیامت ہے
نجانے کب کا تجھے ہم بھلا چکے ہوتے
مگر یہ بات کہ تجھ سے ہمیں محبت ہے

تہمینہ نور ـــــــ ڈھوک کشمیریاں
جمع تم ہو نہیں سکتے منفی سے مجھے نفرت ہے
تمہیں تقسیم کرتا ہوں تو حاصل کچھ نہیں ہوتا

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ
نہیں فرصت یقیں مانو کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں، تیری باتیں بہت مصروف رکھتی ہیں

نوشین اقبال نوشی ـــــــ گاؤں بدو مرجان
تو آئے تو تیری نظر اتاریں ہم
خود کو پھینک دیں تیرے سر سے وار کر

عابدہ نشاط ـــــــ کراچی
بھول جانے کا تجھے کیسے تصور کر لوں
میری ہر سانس سے وابستہ ہیں یادیں تیری

حنا ـــــــ گجرات
گم ہیں یادوں کے بیاباں میں بہت دیر سے ہم
گوشہ دل سے ذرا تم ہی صدا دو ہم کو

ناہید راشد ـــــــ کراچی
وہ جان ہی گئے کہ ہمیں ان سے پیار ہے
آنکھوں کی مخبری کا پتا ہم سے پوچھیے

صدف عمران ـــــــ کراچی
بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل
غزل بھی وہ جو کسی کو ابھی سنائی نہ تھی

قمر یوسف ـــــــ محراب پور
آیا ہوں کہاں سے سر شام نہ پوچھا
بستی کے چراغوں نے مرا نام نہ پوچھا
میں نے بھی اسے دیکھ کے رخ پھیر لیا تھا
اس نے بھی مرا حال سر عام نہ پوچھا

نمرہ، اقرا ـــــــ کراچی
انکار کی جو بات سے آگے نہیں گیا
وہ شخص ممکنات سے آگے نہیں گیا

عائشہ ______ گوجرہ

سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان بُرا لگتا ہے
ظلم سہتا ہوں انسان بُرا لگتا ہے
کس قدر ہوگئی معروف یہ اپنی دنیا
ایک دن ٹھہرے تو مہمان بُرا لگتا ہے

مریم شہباز ______ حیدرآباد

ٹوٹ کر امید اپنی کرچیوں میں بٹ گئی
ریزہ ریزہ ہوگئے ارمان پتھر کی طرح

ندا مدیحہ یوسف ______ کراچی

ہر بات پہ نفرت کا یہ اظہار سا کیوں ہے
اب میری محبت سے وہ بے زار سا کیوں ہے

سمیرا انور ______ جھنگ صدر

عمر کیسے کٹے گی سیف یہاں
رات کٹتی نظر نہیں آتی

زاہدہ ______ نواب شاہ

عمر گزری عذاب جاں سہتے
دھوپ میں زیر آسماں رہتے
ہم ہیں سنسان راستوں کے شجر
جو کسی کو بھی کچھ نہیں کہتے

جاسمہ مریم ______ کراچی

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

زبیدہ، ثمینہ ______ کراچی

ہر قدم امید سے خوشبو نکل آئے
تنہائی کے صحرا میں اگر تو نکل آئے
کیسا لگے اس بار اگر موسم گل میں
تتلی کا بدن اوڑھ کے جگنو نکل آئے

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لادے

صائمہ سندھو ______ خانیوال

موسم کو بدلنا ہے بدل جائے گا آخر
سورج ہے کوئی شخص تو ڈھل جائے گا آخر
آنکھیں ہیں تو ہو جائیں گی بے آب کسی روز
دل ہے تو کسی روز سنبھل جائے گا آخر

امبر گل ______ جھڈو (سندھ)

سُرخ ہو جاتی ہے جب صحن چمن کی مٹی
اسی موسم میں نئے پھول کھلا کرتے ہیں

سدرہ ______ خیرپور

قدرت کے فیصلوں کا بھی لازم تھا احترام
دل ورنہ چاہتا تھا میرے ساتھ تو رہے

نادیہ ______ ٹنڈو آدم

جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل
مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

تحریم ______ کراچی

یہ شرارت بھرا لہجہ تو مری عادت ہے
تو ہر اک بات پہ یوں نم نہ کیا کر آنکھیں

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑ پکا

تشخیص یہ بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا
نسخے میں لکھو ان سے ملاقات فرمائیں

انیقہ انا ______ چکوال

کر دو میری شب کو شاداں اس طرح
اُجالے کا پھر کبھی احساس نہ ہو
میں رُک بھی جاؤں تو تم نہیں رُکنا
میرے قدموں کی پھر چاہے پرواز نہ ہو

نسرین یوسف ______ لاہور

اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ بگڑ جاتے ہیں
ہم تو پاگل ہیں ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں
تم بضد ہو کہ چلو ساتھ ہمارے لیکن
ہم مسافر ہیں بہت جلد بچھڑ جاتے ہیں

مان جٹ ______ عبدالحکیم

خمار آلودہ نظروں کی ہر اک جنبش ہے افسانہ
الٰہی ہم انہیں دیکھیں کہ ان کا دیکھنا دیکھیں

حمنہ حبیب ______ عبدالحکیم

تم بھی سادہ ہو کبھی چال بدلتے ہی نہیں
ہم بھی سادہ ہیں اسی چال میں آجاتے ہیں

افشاں اسلم ______ کراچی

کہیں کچھ اللہ نہ ہو جاؤں ریزہ ریزہ
ایسا ٹوٹا ہوں کہ جڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے

باعث تشویش

ضیغم نے اپنے دوست عباس کو بتایا "یہ بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی 'میری بیوی کو باہر گئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے ہیں' پتا نہیں فون بھی اٹینڈ نہیں کر رہی وہ کہاں ہوگی؟"

"یار ضیغم! فکر نہ کرو۔ بھابھی آجائیں گی" عباس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ضیغم نے کہا "یار عباس! فکر کی ہی تو بات ہے کہیں اسے کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو یا اسے کسی نے اغوا نہ کرلیا ہو یا پھر ممکن ہے کہ وہ شاپنگ کر رہی ہو۔"

"خدا کرے بھابھی شاپنگ نہ کر رہی ہوں۔"

عباس نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

فرح بشیر۔۔۔ بھائی پھیرو

ہم سا ہو تو۔۔۔۔

ہر شخص کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آتے ہیں۔ جب وہ ششدر رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک حیران کن لمحہ مشہور اداکار ٹام سلیک کے حصے میں بھی آیا وہ اپنی فلمی زندگی کے عروج پر تھا فلمی شائقین میں اس کی مقبولیت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ایک دن صبح کے وقت وہ سڑک پر آوارہ گردی کر رہا تھا کہ اس نے سامنے سے ایک خوب صورت باوقار معمر جوڑے کو ہاتھوں میں کیمرہ تھامے اپنی جانب آتے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے ٹام سلیک نے ان کا ارادہ بھانپنے میں غلطی نہیں کی اور فوراً ایک خوب صورت پوز بنا کر ان کے سامنے کھڑا ہوگیا تاکہ وہ اس کی تصویر اتار لیں۔

"نہیں نہیں آپ غلط سمجھے" بڑے میاں نے اس سے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کیمرے سے ہماری ایک خوب صورت سی تصویر کھینچ دیں۔"

ثریا شاہ۔۔۔ کہروڑ پکا

گارنٹی بھی تو ہے

ڈاکٹر حیدر کا ۔۔۔ ٹی وی خراب ہوگیا۔ الیکٹریشن نے اسے چیک کرنے کی اجرت ایک ہزار روپے بتائی اور کہا "اگر کوئی پرزہ خراب نکلا تو آپ خود منگوائیں گے۔"

ڈاکٹر حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی تم تو ہم سے بھی بڑھ گئے ہم مریضوں سے فیس صرف ۔۔۔ پانچ سو روپے لیتے ہیں۔"

الیکٹریشن "وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر حیدر! مگر ہم تو گارنٹی بھی دیتے ہیں۔"

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑ پکا

ایک سے بڑھ کر ایک

امریکی سفارت خانے میں ویزے کے حصول کے لیے بے انتہا رش تھا ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی' قطار میں کھڑے ہوئے ایک خوب صورت اور ماڈرن نوجوان نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی ہے اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ایک حسین و جمیل دوشیزہ شہزادے کھڑی تھی جو اس کی آنکھیں ور کر رہی تھی۔

شہزادے نے کہا "مسٹر منہل! قطار میں کھڑے کھڑے میرا گلا خشک ہوگیا ہے۔ میں ذرا سامنے والے

اسٹال پر کولڈ ڈرنک پینے جا رہی ہوں" منہال دل ہی دل میں تو بہت خوش ہوا مگر بظاہر بے توجہی سے بولا "مس شانزے ضرور جائیے! مجھے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"سر منہال مجھے اندازہ تھا کہ آپ کا جواب ایسا ہی روکھا ہو گا اسی لیے میں نے آپ کی شرٹ پر چیونگم چپکا دی ہے تاکہ مجھے اپنی جگہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔" شانزے نے اطمینان سے جواب دیا۔

سیدہ نسبت گیلانی ۔۔۔ کہوٹا

کفایت شعاری

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتایا۔ "ہم ہر تیسرے سال کسی نہ کسی مقام پر چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں۔"

"باقی دو سالوں میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟" سہیلی نے تجسس سے پوچھا۔

"ایک سال تو ہم پچھلے سال کی ۔ باتیں کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں جبکہ دوسرے سال میں ہم آئندہ آنے والی چھٹیوں کے بارے میں منصوبے بناتے رہتے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

عمارہ ۔۔۔ کراچی

معذرت

پاگل خانے کا دورہ کرنے والی ایک سماجی خاتون کو راستے میں ایک ادھیڑ عمر پاگل کھڑا نظر آیا تو وہ اس سے انٹرویو کرنے لگی۔ "آپ یہاں کتنے عرصے سے ہیں؟"

"بارہ سال سے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے دیا۔

"یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟" خاتون نے جاننا چاہا۔

"نہیں ۔۔۔!" اس شخص نے جواب دیا۔

خاتون اس سے مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد آگے بڑھیں تو رہنمائی کی غرض سے ان کے ساتھ چلنے والے صاحب کو گویا کوئی خیال آیا اور انہوں نے خاتون سے پوچھا۔ "آپ ان صاحب کو پاگل تو نہیں سمجھ رہی تھیں؟"

"ہاں ۔۔۔! میں تو پاگل سمجھ کر ہی ان کا انٹرویو کر رہی تھی۔" خاتون نے اعتراف کیا۔

"ارے میڈم! وہ پاگل نہیں ۔۔۔ وہ تو ہمارے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔" گائیڈ نے بتایا۔

"اوہ ۔۔۔!" خاتون نے تاسف سے کہا۔ پھر پلٹ کر ان صاحب کے قریب جا کر بولیں ۔ "معاف کیجیے گا ۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی آئندہ میں محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کروں گی۔"

عائشہ بشیر ۔۔۔ پھول نگر

باعث اطمینان

بس میں خواتین کے کمپارٹمنٹ کے عین قریب دو غیر ملکی سیاح بیٹھے جوش و خروش سے انگریزی میں مسلسل باتیں کیے جا رہے تھے کہ اچانک ایک سیاح کو کھانسی آ گئی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین میں سے ایک نے گہری سانس لے کر دوسری سے کہا۔ "کمبخت مارے یہ لوگ اتنی دیر سے انگریزی میں گٹ پٹ کیے جا رہے تھے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن شکر ہے کہ یہ کھانستے تو اردو میں ہیں۔"

رفعت ۔۔۔ ملتان

آزمائش

"کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک نئی قسم کا ناشتا تیار کیا ہے۔ میں اس وقت آزمائشی طور پر اسے کھا کر دیکھ رہا تھا جب میری آنکھ کھل گئی۔" ایک شخص نے اپنے دوست کو بتایا۔

"اچھا ۔۔۔ تو پھر کیا ہوا؟" دوست نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے دیکھا کہ میرے فوم کے گدے کا ایک کونا غائب تھا۔" اس شخص نے ذرا مایوسی سے جواب دیا۔

ثمرین شیخ ۔۔۔ مظفر گڑھ

دو میڈل

ایک گلوکار ہر وقت اپنے ساتھ دو میڈل لے گھوما کرتے تھے۔ ایک میڈل چھوٹا تھا اور دوسرا بڑا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک دوست نے خیال ظاہر کیا۔ "شاید آپ کو چھوٹا میڈل کسی ہلکے پھلکے گانے پر اور بڑا میڈل کوئی کلاسیکل مقابلہ جیتنے پر ملا ہو گا؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" گلوکار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک مرتبہ گلوکاری کا مقابلہ ہوا تھا۔ چھوٹا میڈل مجھے اس میں بہترین گانا گانے پر ملا تھا۔"

"اور بڑا میڈل ۔۔۔؟" دوست نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بڑا میڈل مجھے وہی گانا بند کرنے پر ملا تھا۔" گلوکار نے بتایا۔

دانیہ عامر ۔۔۔ کراچی

اجازت

پینے پلانے والوں کی محفل برخاست ہوئی تو ایک شخص نے اپنے دوست کو مشورہ دیا۔ "تمہاری حالت ڈرائیونگ کرنے کے قابل نہیں ہے' بہتر ہے کہ تم بس میں گھر چلے جاؤ۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" دوست نے خمار زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہیں تو معلوم ہے کہ میری بیوی کتنی جھگڑالو اور بدمزاج ہے' وہ بس کو گھر کے گیراج میں کھڑی کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے گی۔"

یاسمین ملک ۔۔۔ ملتان

نصیحت

لڑکی کے باپ نے نوجوان کے سامنے اپنی معمولی شکل صورت والی بیٹی کی خوبیاں گنوانے کے بعد ناصحانہ لہجے میں کہا۔ "مرد کو عورت کی صرف خوب صورتی نہیں دیکھنی چاہیے ۔۔۔ خوب صورتی کا کیا ہے ۔۔۔ وہ تو محض ظاہری چیز ہے۔ کھال کے نیچے تو سب انسان تقریباً" یکساں ہوتے ہیں۔"

"میرے لیے کھال تک کی خوب صورتی کافی ہے' میں آدم خور نہیں ہوں۔" نوجوان نے متانت سے جواب دیا۔

رومینہ سرفراز ۔۔۔ کراچی

غیر ذمہ دار

میرا دھوبی بہت ہی غیر ذمہ دار ہے۔ میری قمیصیں دھو کر لاتا ہے تو ان پر دوسری قمیصوں کے بٹن لگے ہوتے ہیں۔" ایک صاحب اپنے دوست سے شکوہ کر رہے تھے۔

"ارے بھائی! شکر کرو ۔۔۔ تمہارا دھوبی پھر بھی غنیمت ہے' میرا دھوبی میرے بٹن تو واپس لاتا ہے مگر ان پر دوسری قمیصیں لگی ہوتی ہیں۔" دوست نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

سونیا ۔۔۔ لاہور

وجہ تسمیہ

شراب کے نقصانات پر لیکچر دیتے ہوئے ایک صاحب نے مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر ایک گدھے کے سامنے ایک بالٹی میں پانی اور دوسری بالٹی میں بیئر رکھی جائے تو وہ کس بالٹی میں سے پیے گا؟"

"پانی والی بالٹی میں سے ۔۔۔" ہال میں سے ایک آواز آئی۔

"بالکل ٹھیک ۔۔۔" مقرر خوش ہو کر بولے۔ "مگر وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

"کیونکہ وہ گدھا ہے۔" جواب آیا۔

ثنا مسعود ۔۔۔ لطیف آباد

✿ ✿

حسن و صحت

ادارہ

انسانی صحت کے لیے قدرت کا حسین تحفہ ' ناریل

قدرت نے ہمیں بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں انہی نعمتوں میں پھل اور سبزیاں بھی شامل ہیں جو ہماری صحت کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر پھل اور سبزی میں کوئی نہ کوئی ایسی خاصیت ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانی زندگی کے لیے لازمی بن جاتی ہے ڈاکٹرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی صحت اور فٹنس کے لیے زیادہ سے زیادہ سبزیوں اور پھلوں پر انحصار کیا جائے۔ آج ہم آپ کے لیے جس پھل کا تذکرہ کر رہے ہیں اسے ناریل (کھوپرا) کہتے ہیں۔ ناریل انتہائی خوش ذائقہ اور میٹھا پھل ہوتا ہے جو بہت شوق سے کھایا جاتا ہے اس کا پانی خاص طور پر بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

کھانوں میں بہتر ذائقے کے لیے ناریل کا استعمال کیا جاتا ہے ناریل کے استعمال سے نہ صرف کھانوں میں ذائقہ بڑھ جاتا ہے بلکہ یہ ہاضمہ کے نظام کو درست کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اس کے استعمال سے آنتوں اور جگر کے افعال میں بھی بہتری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ناریل کے پانی کو دنیا کے محفوظ ترین پانی کی حیثیت دی جاتی ہے اس کا پانی بہت شوق سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے پانی کو استعمال کرنے سے جگر کی گرمی ' تلووں اور ہتھیلیوں کی کراہٹ کو کم کیا جاتا ہے۔ یہ جگر ' تلووں اور ہتھیلیوں کو ٹھنڈک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ناریل وہ پھل ہے جس نے صدیوں سے انسانوں پر اپنی افادیت ثابت کر رکھی ہے۔ بے شمار فوائد رکھنے والے اس پھل کا درخت بھی اپنی مثال آپ ہوتا ہے اسے جنت کا تحفہ بھی کہا جاتا ہے جبکہ بعض لوگ اسے فطرت کی سپر مارکیٹ ' زندگی کا درخت ' پام کا درخت بھی پکارتے ہیں۔ یہ پھل زیادہ تر مرطوب ممالک میں پایا جاتا ہے اور ان ممالک میں اس پھل کو بطور خوراک ' مشروب اور صحت بخش چکنائی کے استعمال کیا جاتا ہے اس کا گودا خاص طور پر فائبر سے بھرپور ہوتے ہیں۔

جس طرح قدرت نے ہر پھل اور سبزی میں کوئی نہ کوئی خاصیت رکھی ہے اسی طرح ناریل بھی اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے قدرت کا ایک ایسا بہترین اور نایاب تحفہ ہے جو مجموعی طور پر آپ کے پورے جسم کی حفاظت کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے روغن ناریل کے علاوہ ناریل کا پانی اور گودا نہ صرف آپ کی صحت کے لیے ایک انمول تحفہ ہے بلکہ اس سے تیار کی گئی کریم کو آپ کی خوب صورتی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔

ناریل کے چند فوائد

ناریل کے پانی کو خاص طور پر گرمی میں باقاعدگی سے استعمال کرنا چاہیے کیونکہ اس کے استعمال کرنے سے پورے دن آپ کو گرمی کا احساس نہیں ہوتا یہ پورے دن آپ کے لیے پھکلی ہیٹ کا کام کرتا ہے۔

ناریل کی یہ خوبی ہے کہ یہ آپ کی جلد کو نہ صرف ٹھنڈک کا احساس دلاتا ہے بلکہ جسم کے داغ دھبوں کے نشانات کو بھی صاف کرنے میں بھرپور مددگار ثابت ہوتا ہے۔

ناریل کے تیل کو صدیوں سے بالوں کی نشوونما اور صحت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اب چونکہ زمانہ نے ترقی کرلی ہے لہٰذا مختلف قسم کے شیمپوز اور ہیئر کنڈیشنرز کی تیاری میں بھی ناریل کے تیل کو استعمال کیا جاتا ہے۔

ناریل کے تیل میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ یہ آپ کے بے جان اور خشک بالوں میں نہ صرف جان ڈالتا ہے بلکہ ان کی نشوونما میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بہت سے لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ناریل کا تیل بالوں کے ہر مسئلہ کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

ناریل کے پانی کو دنیا کا سب سے محفوظ اور صحت بخش مشروب کہا جاتا ہے۔

ناریل کے تیل کی افادیت پر دنیا بھر میں تحقیقات ہو رہی ہیں اور ہر نئے دن اس کی کوئی نہ کوئی خوبی سامنے آتی ہے۔

اس میں شامل Kasha کو بالوں کی نشوونما کے لیے لاجواب قرار دیا گیا ہے۔

مشرقی خواتین زیادہ تر اپنے بالوں کی نشوونما کے لیے ناریل کا تیل ہی استعمال کرتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے بال مغربی خواتین کے مقابلے میں زیادہ دلکش دکھائی دیتے ہیں۔

ناریل کی یہ بھی خوبی ہے کہ اس کے استعمال سے نہ صرف آپ کی رنگت میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے آپ کا نظام ہاضمہ بھی درست رہتا ہے۔

جو خواتین سن یاس کی حدود میں داخل ہو رہی ہوتی ہیں ان کے لیے ناریل بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

جو لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ ان کی ہتھیلیاں اور تلوے جلتے رہتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ناریل کا پانی استعمال کریں بہت مفید ثابت ہوگا۔ آپ ناریل کو پیس کر ہتھیلیوں اور تلووں پر لیپ بھی کر سکتی ہیں۔

ناریل کی یہ خوبی بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ زخم کو بھرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے خاص طور پر اگر گرمی کی وجہ سے نشانات پڑ گئے ہوں تو اس کے لیے روغن ناریل کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

اگر گرمی کی وجہ سے سوزش ' جلن یا کوئی اور تکلیف ہو رہی ہو تو اس کے لیے ناریل کا پانی بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ناریل کی یہ خوبی ہے کہ یہ نہ صرف چربی کو پگھلاتا ہے بلکہ کولیسٹرول کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ یہ جسم کے گوشت کے اندر پوشیدہ زہریلے جراثیم کو بھی ختم کرتا ہے۔

ناریل کی پسندیدگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ یہ پھل کھانے میں بہت مزے دار ثابت ہوتا ہے۔

ناریل کی مندرجہ بالا خوبیوں کے علاوہ یہ مختلف قسم کی مصنوعات کی تیاری میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے مثلاً " صابن ' لوشن ' کریم ' ہونٹوں پر لگانے والا بام وغیرہ کے لیے ناریل سے نکالے جانے والا تیل ' انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ناریل کے پھل سے دو طرح کے تیل نکالے جاتے ہیں

01 Oil Vco Virginncoconut

02 دوسرا خشک کھوپرے سے نکالا جانے والا تیل جس میں وٹامن "ای" کی خاصی مقدار موجود ہوتی ہے۔

ناریل کے تیل اور کڑی پتا میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ یہ سفید ہوتے ہوئے بالوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں ان دونوں کا ملاپ بالوں کے لیے کرشماتی ثابت ہوتا ہے۔

تھوڑے سے کڑی پتے لے کر گرائنڈ میں تھوڑا سا پانی ڈال کر پیسٹ تیار کرلیں پھر اس میں دو کپ ناریل کا تیل ملا کر گرم کرلیں اس وقت تک گرم کرنا ہے جب تک اس سے بھاپ نہ اٹھنے لگے اس کے بعد اسے ٹھنڈا کر کے کسی بوتل میں محفوظ کرلیں اور سفید ہوتے ہوئے بالوں میں لگاتی رہیں اور دیکھیں کہ قدرت نے ان چیزوں میں کیا خوبیاں چھپا رکھی ہیں۔

بہرحال اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ناریل ایک انتہائی صحت بخش اور سود مند پھل ہے جو کسی بھی موسم میں صحت اور تندرستی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

☆ ☆

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

بریٹوس وِد پینا کولاڈا

بھنے ہوئے قیمے کی اشیا :

قیمہ	200 گرام
لال لوبیہ	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد درمیانی
ٹماٹر پیسٹ	آدھی پیالی
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچے

پوری کی اشیا :

گیہوں کا آٹا	ایک پیالی
میدہ	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	تلنے کے لیے

سجانے کے لیے :

شملہ مرچ (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد درمیانی

چیڈر چیز (پنیر کش کیا ہوا) آدھی پیالی

پینا کولاڈا کی اشیا :

انناس کا رس	ایک پیالی
ناریل پسا ہوا	آدھی پیالی
چینی	دو کھانے کے چمچے
ٹھنڈا پانی	آدھی پیالی

بھنے ہوئے قیمے کی ترکیب :

لوبیہ کو دو پیالی نیم گرم پانی میں پندرہ سے بیس منٹ بھگو کر رکھنے کے بعد دیگچی میں ڈال کر اتنی دیر ابالیں کہ اچھی طرح گل جائے۔

ایک علیحدہ دیگچی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے پانچ منٹ تک ہلکا سا گرم کریں۔ اس میں پیاز اور لہسن کو تین سے چار منٹ تک ذرا سا نرم ہونے تک فرائی کریں۔ پھر قیمہ ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔

نمک، لال مرچ اور ٹماٹر کا پیسٹ ڈال کر ڈھک کر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ پہلے سے ابال کر رکھی ہوئی لوبیہ کو ملا کر چولہے سے اتار لیں۔

پوری بنانے کی ترکیب :

میدہ اور آٹے کو ملائیں اور ان کو نمک اور دو کھانے کے چمچے کوکنگ آئل ڈال کر پانی کی مدد سے سخت سا گوندھ لیں۔

کڑاہی میں درمیانی آنچ پر کوکنگ آئل کو تین سے پانچ منٹ تک گرم کرلیں۔ آٹے کی چھوٹی چھوٹی پوریاں تل کر گولڈن فرائی کرلیں۔

چپٹی ہوئی ڈش میں پوریاں رکھ کر ان پر ایک کھانے کا چمچہ قیمہ ڈال دیں۔

پینا کولاڈا کی ترکیب :

تمام اجزا کو ملا کر بلینڈ کرلیں۔ خوب صورت سے گلاس میں نکال کر انناس کے ٹکڑوں سے سجا کر ٹھنڈا پیش کریں۔

رشین سلاد

اشیا :

سیب	دو سے تین عدد درمیانے
انناس کے چھوٹے ٹکڑے	ایک پیالی
آلو	دو سے تین عدد درمیانے
گاجر	دو عدد درمیانی
مٹر کے دانے	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
مایونیز	ایک پیالی
فریش کریم	آدھی پیالی

مایونیز کی اشیا :

انڈوں کی زردی	دو عدد
نمک	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سفید مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہوئی رائی	آدھا چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ یا لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
کوکنگ آئل	ایک پیالی

سجانے کے لیے :

کشمش (بھنے ہوئے)	آدھی پیالی
اخروٹ کی گریاں	آدھی پیالی

ترکیب :

مایونیز بنانے کے لیے صاف خشک پیالے میں نمک، سفید مرچ، چینی اور پسی ہوئی رائی کو انڈے کی زردیوں کے ساتھ ہلکا سا پھینٹ لیں۔

مستقل پھینٹتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کرکے کوکنگ آئل ڈالتے جائیں۔ آخر میں سرکہ ڈال کر اتنی دیر پھینٹیں کہ مکسچر اچھی طرح گاڑھا ہو جائے، مایونیز تیار ہے۔ کچھ دیر فریج میں رکھ دیں۔

تمام پھلوں اور سبزیوں کو ایک سائز کے چھوٹے چوکور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔

ایک لیٹر ابلتے ہوئے پانی میں سبزیوں کو علیحدہ علیحدہ تیز آنچ پر تین سے پانچ منٹ تک ابالیں اور گرم پانی سے نکال کر ان پر ٹھنڈا پانی بہادیں۔

پھلوں اور سبزیوں کو ملا کر ان میں لیموں کا رس، نمک، سفید مرچ اور چینی شامل کرلیں۔

فریش کریم کو پھینٹ کر مایونیز میں ملائیں اور مکس پھلوں اور سبزیوں پر ڈال کر اچھی طرح ملالیں۔

فریج میں رکھ کر خوب اچھی طرح ٹھنڈا کرلیں۔

سلاد کے پتوں سے سجے ہوئے خوب صورت سے پیالے میں نکال لیں۔ اخروٹ اور کشمش سے سجا کر ٹھنڈا پیش کریں۔

آپ چاہیں تو اس سلاد میں ابلی ہوئی چکن یا بشریف بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شیریں نذیر۔۔ راولپنڈی

س۔ بھیا! انگلی پکڑ کر ذرا راستہ بتادو۔ میں انجان ہوں؟

ج۔ آنکھیں تو ہیں انگلی پکڑ کر راستہ بتانے کی کیا ضرورت۔

س۔ نین بھیا! یہ مو حضرات شکی کیوں ہوتے ہیں۔ ذرا تصدیق تو کر دیں؟

ج۔ عورتوں سے کم۔

ثروت ناصر۔۔ کراچی

س۔ نقوی! بال سفید ہو جائیں تو خضاب لگایا جاتا ہے۔ اگر خون سفید ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

ج۔ خون سفید ہی اچھا لگتا ہے۔ کم از کم زخم لگنے پر احساس تو نہ ہوگا کہ خون بہہ رہا ہے۔

خورشید جمل۔۔ کراچی

س۔ نادان ماں کو، عقلمند کمال کو ڈھونڈتا ہے تو عام آدمی کیا ڈھونڈے گا؟

ج۔ ان دونوں کو۔

زبیدہ رانی۔۔ نامعلوم

س۔ ماں کے پیروں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے ساس کے قدموں کے نیچے کیا ہوتا ہے؟

ج۔ وہاں مجازی خدا کی جنت۔

عارفہ ادریس۔۔ لاہور

س۔ نینو صاحب! پلیز مجھے بتایئے تو سہی! نکاح پر چھوہاروں کے بجائے بادام کیوں نہیں بانٹے جاتے؟

ج۔ کان قریب لاؤ۔ ہاں بھئی بڑی نادان ہو۔ بادام مہنگے جو ہوتے ہیں۔

شکیلہ جاوید۔۔ بہاول پور

س۔ ہری اپ۔ اگر کسی امیر کو دولت مل جائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی اندھے کو دولت مل جائے تو کیا ہوگا؟

ج۔ بھئی وہ تو پہلے سے ہی اندھا ہوگا۔

حسینہ نقوی۔۔ فیصل آباد

س۔ نین جی! شیطان اور انسان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جو مجھ میں اور شیطان میں۔

☆ ☆

مُدیرہ کرن

نامے میرے نام
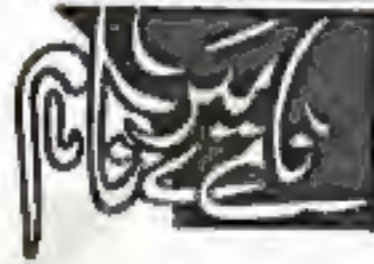
ثمینہ کوثر عطاری۔۔ گجرات

خوب صورت سرورق سے سجا سالگرہ نمبر 18 کو ملا شدید ترین انتظار کے بعد سب سے پہلے اداریہ پڑھا باتیں بہت اچھی تھیں پھر حمد و نعت سے دل و روح کو منور کیا پھر دوڑ لگائی "دست کوزہ گر" کی طرف انجام بالکل سوچا سمجھا تھا سب۔ اب الیان کے رومیلہ کو منانے کا انتظار باقی رہ گیا ہے مجرم تو اپنے انجام تک ضرور پہنچیں گے۔

سب سے زیادہ کوفت "دردِل" کو نہ پا کر ہوئی پلیز نبیلہ صاحبہ ہر دو ماہ بعد گم نہ ہو جایا کریں ایک ایک دن ہم نے کس کے گزارا ہوتا ہے تو بہت کوفت ہوتی ہے۔

نئے ناول کا آغاز تو اچھا لگا آگے دیکھتے ہیں فرحانہ صاحبہ اپنے قلم کا کتنا جادو ہم پہ چلا پاتی ہیں۔

"مجھے یہ شعر پسند ہے" میں بینش کرن، شمع مسکان، عائشہ، تحریم اور فوزیہ کا انتخاب اچھا لگا۔

"یادوں کے دریچے سے" تو خزاانجم اور حجاب کا انتخاب دل کو چھو گیا۔

"کرن کرن خوشبو" سے امبر گل کی "معصوم سی فرمائش" اور منال کا "ریت کا دھاگہ" پسند آیا۔

"کرن کا دسترخوان" بہترین کاوش ہے۔ یہاں سے دیکھ کر ہم پکاتے ہیں اور سب سے واہ واہ وصول کرتے ہیں اب کھانے والوں کو کیا پتا کہ ہم کہاں سے دیکھ کر بنا رہے ہیں شکریہ کرن۔

"مسکراتی کرنیں" یہاں سے شائستہ نفیسہ اور گل شاہ کے لطیفے پسند آئے۔

حسن و صحت ہمیں فٹ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے کافی معلومات مل جاتی ہیں۔

"نامے میرے نام" سے عائشہ خان، شمع مسکان کا خط پسند آئے اف یو ڈونٹ مائنڈ، فوزیہ اس دفعہ آپ کے تبصرے میں جان نہیں تھی ایسے لگ رہا تھا بڑی جلدی میں لکھا گیا ہے۔

"مقابل ہے آئینہ" کرن سے ملاقات زبردست رہی ان کے جواب پسند آئے۔

"وہ اک پری" ہے ریحانہ نے بہت اچھے طریقے سے زری کے ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا ویلڈن۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" پہلی قسط سے لے کر آخر تک مجھے نا جانے کیوں پسند نہیں آیا سوری۔

"سحرش بانو" کی تحریر بہت زبردست تھی افسانے دونوں اچھے تھے۔

عائشہ خان۔۔ ٹنڈو محمد خان

کرن 12 تاریخ کو مل گیا ٹائٹل ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ مصنوعی نتھ تو مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ ناک میں پہنی ہوئی نتھ کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔

حمد و نعت پڑھیں اچھی لگیں۔ نعت کے آخری شعر پر بے اختیار بے شک نکلا بے شک ہمارے پیارے نبی ہی شافع امت ہیں۔

اداریہ پڑھا۔ مدیرہ کی بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ بلاشبہ کرن شعاع اور خواتین صاف ستھرے پرچے ہیں۔ حد سے تجاوز کرتی کہانیاں کبھی ان پرچوں کی زینت نہیں بنیں۔ آواز کی دنیا سے محمد نعمان شیخ کی باتیں اچھی لگیں۔

عائشہ نصیر کے "اس سے پہلے" میں بے وجہ ہی اتنا جھگڑ بنالیا۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہو گئی تھی۔ پھر جب فرہاد کو آنا ہی تھا تو جلدی آجاتا۔ دل میں اک کسک سی رہ گئی۔

"ایپل اینڈ اسٹرابری" زبردست شاندار ناولٹ لگا۔ صدف ریحان کو مبارک باد پہلے غلط فہمی پھر غم کے بادل چھٹ جانا۔ اچھا لگا۔

"دست کوزہ گر" آخری قسط کی طرف رواں دواں

ہے۔ زوبیہ کا قتل ہو جائے گا یہ عندیہ تو ل ہی چکا تھا سو دل تھام کے ہی پڑھا اینڈ کی اتنی جلدی نہیں تمام کرداروں کو اپنے مقام تک پہنچا دیجیے گا۔ پھر اینڈ کیجیے گا۔

"قصے کہانیاں اور پھول" میں تمام کے جوابات اچھے لگے۔ خاص طور پر رخ چوہدری 'ثمینہ ہمایوں کے۔

بلال قریشی سے ملاقات، بھی اچھی رہی۔ کسی کرکٹر کا انٹرویو شائع کریں نا۔

"کرن کرن خوشبو" سارے ہی بہت اچھی تھیں۔

"نہلے پہ دہلا" بھی اچھے سوالات تھے اور جواب تو ہوتے ہی لاجواب ہیں۔

"حسن و صحت" میں بہت اچھی ٹپس دی ہیں۔ مجھے ضرورت تھی کیوں کہ سردیوں میں کم پانی پینے کی وجہ سے اسکن خراب ہو چکی ہوتی ہے۔ پھر مارچ اپریل میں ایک ساتھ اپنا چہرہ ٹھیک کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

"میری بھی سنیے" "رز کمالی کو ان کے بھائی اپیل کرتے ہیں' زیبات ہمیں حفظ ہو چکی ہے۔ (ہاہا)

نیا قسط وار ناول حسب روایت دو تین قسطیں جمع کر کے پڑھوں گی تب ہی رائے دے سکتی ہوں۔

"یادوں کے دریچے" میں سائرہ پردا کی ڈائری سے نوشی گیلانی کی نظم پسند آئی۔

"مسکراتی کرنیں" میں۔ "خوش فہمی" شائستہ خان "خمیازہ" خالد عزیز اور "ناقابل برداشت" حنا سلامت خان پر ہنسی آئی۔

افسانہ "نادان تھے ہم" سمیرا غزل کا اچھا تھا۔ حالانکہ موضوع روایتی تھا۔ پھر بھی اچھا لکھا۔

"نامے میرے نام" پڑھے۔ ایک تجویز ہے 'اگر کرن کتاب میں فیشن اور ڈیزائن وغیرہ دیا کریں تو تصویریں کلرڈ میں دے دیا کریں تاکہ ہمیں کلر کامبی نیشن بھی سمجھ آجائے۔ شکریہ۔

یاسمین حنفی۔۔۔ کراچی

اس بار کرن 17 تاریخ کو ملا۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" کی آخری قسط کچھ خاص اچھی نہیں لگی یوں لگا کہ بس جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش کی ہے رائٹر صاحبہ نے۔

"دست کوزہ گر" بہت اچھے طریقے سے اختتام ہونے والا ہے اس شاندار ناول کا۔۔۔ پلیز جلدی جلدی مت سمیٹ دیجیے گا خرم اور کمل کی شادی پوری تفصیل سے بتایئے گا۔

"دردل" تو سرے سے ہی غائب تھا مکمل ناول "اس سے پہلے کہ" بہت زبردست رہا۔ اینڈ بالکل بھی پسند نہیں آیا۔۔۔ محبت انسان اتنی جلدی کیسے بھول سکتا ہے۔ بھلے سے آگے کوئی کتنا ہی چاہنے والا کیوں نہ ہو پھر بھی دل میں ایک کسک رہ جاتی ہے۔

"ایپل اینڈ اسٹرابیری" ہلکی پھلکی اچھی تحریر تھی۔۔۔ افسانے دونوں ہی اچھے تھے۔

"مجھے یہ شعر پسند ہے" میں امبر گل کا شعر پسند آیا۔

"مسکراتی کرنیں" میں ساری ہی پرانی کرنیں تھیں۔

"نامے میرے نام" میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

بلال قریشی سے ملاقات خوب رہی۔ "رز کمالی" ان کا انٹرویو تو بہت بار پڑھ چکے ہیں تو ان کو دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی "آواز کی دنیا" سے نعمان شیخ کی تصویر تو دیے ایسے انٹرویو پڑھنے میں مزا نہیں آتا۔

امبر گل۔۔۔ ٹھنڈو سندھ

اس بار کرن خلاف توقع 12 تاریخ کو ہی مل گیا۔ بڑی حیرانی ہوئی پھر سر پہ ہاتھ مارا 'ابھی یاد جو آگیا تھا کہ فروری کا مہینہ گزرے تو ہی مارچ آتا ہے نا چلیں جی یہ معمہ تو حل ہوا پھر بغور جائزہ لیا نا مکمل ناول ہوں کچھ خاص پسند نہیں آیا پھر اس سے پہلے کہ ہر چیز ماڈل کی پرپل دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے بھی ہر چیز جامنی رنگ میں ڈھلنے لگتی' میں نے سارے سلسلے کھنگالنے شروع کر ڈالے 'تاکہ پتا چلے کہ بابدولت کدھر کدھر براجمان ہیں مگر خود کو صرف شعر اور ایک نظم تک ہی محدود پا کر دل کو بڑا ہی۔۔۔ دکھ ہوا۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلی بار اتنا مختصر اور منفرد تبصرہ کیا ہے تو لازما "شائع کریں گی مگر نہیں کیا چلیں جی جیسے آپ کی مرضی!

پھر اس بار تو سب سے پہلے انتظار تھا "دست کوزہ گر" کی قسط کا سو جلدی سے پڑھی کیونکہ ابھی بھی سب کی طرح دل کو اک آس سی تھی کہ شاید قبر میں سے نکلنے والی لاش

زوبیہ کی نہیں بلکہ کسی اور کی ہو مگر جب پوری پڑھ لی اور کنفرم ہو گیا تو دل بہت بوجھل سا ہو گیا۔ واقعتا" زوبیہ کی موت ایک موت تھی کہ جس نے ذہن و دل پر بہت اثر ڈالا' کاش کہ وہ بابل خانے سے نکلنے کی غلطی نہ کرتی یا تھوڑا سا خود پر اعتبار کرلیتی تو آج وہ ایک موت اس کا انجام تو نہ بنتی' خیر۔

ایان کے بارے میں مجھے بہت پہلے سے اندازہ تھا کہ اس نے طلاق والے مسئلے میں کوئی نہ کوئی تو پنگا کیا ہے اس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ کچھ لوگوں کو سبق سکھانے کے چکروں میں ہے مگر دوسروں کے چکر میں وہ دو بیچاری کے ساتھ کچھ زیادتی کر گیا بلکہ کچھ سے زیادہ ہی کر گیا۔

اچھا جی پھر ذرا غور کیا تو "دردل" کی اس بار بھی غیر حاضری کی اطلاع ملی۔

نیا ناول شروع ہو گیا' جب پڑھا تو کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ سر کے اوپر سے گزر گیا 'نمایا" یہ فرحانہ ناز کا پہلا سلسلے وار ناول ہے اور کردار اور کہانیاں اس میں تین چار فیملیز کے گرد گھومتی لگ رہی ہیں پتا نہیں "جبل پائیں گی یا نہیں' خیر میری تو دعا ہے کہ ان کی یہ تحریر آگے چل کر اور بھی اچھی ہو اور خوب کامیابی پائے اور وہ خوب نام کمائیں۔

پھر مکمل ناول کی باری آئی 'عائشہ نصیر سے مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ جیسے ہی میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور پھر مجھے یوں لگنے لگا کہ ان چاروں بندوں کی اکڑ کو دیکھتے ہوئے اس سے پہلے کہ میں خود تنگ آکر اس کو پڑھنا چھوڑ دوں وہ خود ہی ختم ہو گیا۔ شاید مجھ سے ڈر کے مارے۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ آخر وہ چاروں چاہتے کیا تھے 'سمیرا غزل کا افسانہ اچھا لگا۔

ناولٹ میں صدف ریحان نے کچھ بہترین لکھا۔

کرن کتاب زبردست لگی۔ ان باتوں سے آگاہی حاصل ہوئی جو کہ ہم جیسے ست الوجود بندے کر ہی نہیں سکتے کیکی ٹوٹکے وغیرہ۔ ٹائم ہی نہیں ملتا اپنے لیے تو۔

مستقل سلسلوں میں "ریت کا دھاگا" اور "فاؤنٹین چکن" پڑھ کر بہت ہنسی آئی "یادوں کے دریچے" سے میں تو اس بار تقریباً "سب ہی بہنوں کا انتخاب زبردست لگا۔

بخت عالی فاطمہ۔۔۔ نامعلوم

میں میٹرک کلاس سے کرن کی خاموش قاری ہوں لیکن اب جبکہ میں ماسٹرز کر رہی ہوں تو "دردل" نے خاموشی توڑنے پر مجبور کیا ہے۔ پلیز نبیلہ! دل آور کے ساتھ اتنا برا تو مت کریں۔ اس کا یقین اور مان کیوں توڑ دیا آپ نے؟

علیزے کا دل اتنا سخت کیوں ہے 'اسے دل آور کے ساتھ بھیج دیتیں تو دل اتنا نہ ٹوٹتا اب آگے جو بھی اچھا ہو جائے دل آور کی یہ تکلیف میں نہیں بھولوں گی بہت رلایا آپ نے اس بار۔

اگلی قسط میں پلیز سب اچھا کر دیں کیونکہ میں دل آور کو اب اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ اگر دل آور کے ساتھ اب کچھ برا ہوا تو میں "دردل" پڑھنا چھوڑ دوں گی۔ میں اب اور نہیں رو سکتی۔

باقی پورا کرن بہت اچھا ہے۔

"مستقل سلسلے" میں بھی سب سلسلے بہت اچھے لگے۔

لیلیٰ شاہ۔۔۔ چک سادہ گجرات

میں تین سال سے کرن کی خاموش قاری ہوں مجھے خاموشی توڑنے پر مجبور "دردل" نے کیا مجھ کو یہ کہانی بہت پسند ہے خاص کر زری کا کردار بیسٹ ہے۔ دل آور شاہ پر بہت غصہ آیا زری کو چاہنے والا کسی اور سے محبت کیسے کرنے لگا میرے نزدیک محبت کرنے والوں کو توحید جیسی محبت کرنی چاہیے صرف ایک شخص کو محبوب بنائے رکھنا پلیز آپ زری اور دل آور شاہ کو ملا دیں۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" پڑھا فاخرہ گل جی ویل ڈن بہت بہت ہی اچھا کہانی کو وائنڈ اپ کیا آپ نے زری شازین کو ہی ملے گی مجھ کو تو پہلے ہی یقین تھا صہبا نو اور اکمل کا ملنا بھی اچھا لگا۔۔۔ اینڈ بہت بہی اور منفرد تھا۔ اتنا مزے کا ناول لکھنے پر مبارک باد میری طرف سے۔

مجھے مدیرہ سے پوچھنا ہے کہ اگر میں اپنی کہانی بھیجوں تو آپ شائع کریں گی۔

ج : آپ اپنی کہانی ہمیں روانہ کر دیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

سونیا مبین۔۔۔ موہڑہ دھمیال

مدت ہوئی شاید زمانہ بیت گیا کرن کے لیے قلم اٹھائے آپ سب سے یوں ملے۔ زندگی بہت بدل گئی' میں سونیا

ربانی سے سونیا مبین بن کر قاضیاں سے یہاں موہڑہ دھمیال میں آگئی ہوں۔ چھوٹے سے خاندان کو چھوڑ کر بڑے سے خاندان کا حصہ بن گئی ہوں۔ 2 نومبر کو میری شادی ہوئی تھی۔ تب یہ ساتھ ٹوٹ گیا تھا اور آج یہ رشتہ پھر سے قائم ہو رہا ہے اور اب کے مبین کا شکریہ کہ وہ ہی ڈائجسٹ لا کر دیں گے اور انہوں نے ہی اجازت دی ہے۔ جگہ ملی تو پھر بات ہو گی۔

سائرہ پرواعلی۔۔۔ راجن پور

"کرن" حسب معمول چودہ کو مل گیا۔ ٹائیٹل پسند نہیں آیا "تا رے میرے نام" میں اپنا اور اپنی کزن کا خط دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ بلال قریشی سے ملاقات اچھی لگی "مقابل ہے آئینہ" میں کرن احمد چیمہ چھائی ہوئی تھیں۔ کرن احمد آپ بہت سویٹ ہو۔۔۔

"در دل" کھو نہ پا کر دل اداسی سے بھر گیا۔ نبیلہ جی ایک تو آپ غیر حاضری بہت زیادہ کرتی ہیں۔ ایک ماہ کیا کم ہوتا ہے انتظار کے لیے۔۔۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" کی لاسٹ ایسی موڑ دیکھ کر دل خوش بھی ہوا اور اداس بھی کہ آئندہ "کرن" میں اتنا اچھا ناول پڑھنے کو نہیں ملے گا۔ میران شاہ کے بارے میں پڑھ کر حیران رہ گئی یقین نہیں آ رہا کہ وہ اتنا بدل سکتا ہے۔ شاہ زین سے اتنے پیار سے بات کر سکتا ہے۔ شاہ زین، زری اور اکمل، مہو کے ملن پر دل خوشی سے بھر گیا۔ فاخرہ جی نے اینڈ ہماری توقعات کے مطابق کر کے ہمارے دلوں کو خوش کر دیا ہے۔ تھینکس فاخرہ جی۔

"بے چارگی" ام طیفور نے بہت جاندار ناول لکھا۔ کافی عرصے کے بعد اس طرح کی ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملی فرحانہ ناز ملک کا نیا سلسلے وار ناول "شام آرزو" ابھی نہیں پڑھا۔ سو تبصرہ کرنے سے معذرت، ریحانہ امجد بخاری نے بھی "وہ اک پری ہے" کا اینڈ کر ہی دیا ویسے تو یہ ناولٹ ہر لحاظ سے اچھا تھا مگر رائٹر نے فرزان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ آپ نے اس کی بھی فریال سے شادی کروانی تھی۔ کیا اس کا خوشیوں پہ کوئی حق نہیں تھا۔

"دست کوزہ گر" ابھی سو رہا۔ مکمل ناول "اس سے پہلے" عائشہ نصیر بازی لے گئیں۔ بہت شاندار ناول تھا۔ سالار اور حریم کا گریز، محبت، شرم سب کچھ اچھا لگا۔ بس فرہاد کی ناکام محبت نے دکھی کر دیا۔ عائشہ جی! کیوں کیا آپ نے ایسا بہت رلایا آپ نے۔ دو محبت کرنے والے دلوں کو آپ نے جدائی کیوں دی۔

"تم نے بہت دیر کر دی فرہاد۔ اب میں تمہارے بغیر جینا سیکھ گئی ہوں" اریبہ کے یہ الفاظ پڑھ کر فرہاد کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی رو پڑا تھا۔۔۔!

زینب صدیقی۔۔۔ کوٹ چھٹہ

"کرن" میں کافی عرصے کے بعد جلوہ گر ہوئی ہوں۔ وجہ گھریلو مصروفیات اور میری بوتیک۔۔۔ جس کی وجہ سے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ ٹائیٹل اچھا لگا۔ خاص کر ماڈل کی جیولری، مستقل سارے سلسلے اچھے لگے۔ خاص کر "مقابل ہے آئینہ" یہ سلسلہ تو بہت اچھا جا رہا ہے اسے بند مت کیجیے گا۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" بالآخر اس ناول کا اینڈ ہو ہی گیا۔ شروع سے لے کر اینڈ تک فاخرہ گل نے اس ناول پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔۔۔ شاہ زین کے کردار کی ثابت قدمی، بہادری اور ندی کا صبر، اکمل اور صباتو کی خاموش محبت سب بہت پسند آیا۔ اس سے پہلے "نازک رشتوں کی ڈور سے گندھا ناول پسند آیا" "بے چارگی" پڑھ کر دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ ایسی کھٹی میٹھی تحریریں ہر ماہ ڈائجسٹ میں ہونی چاہئیں۔

نفیسہ سعید "میرا یقین کرو" کے ساتھ حاضر تھیں شکر ہے پری وش کو مکرم علی کی محبت کا یقین تو آیا۔ ورنہ وہ بے خبری میں اپنا ہی نقصان کرتی۔

"مات" بھی ایک سبق آموز افسانہ تھا۔

"یادوں کے دریچے" میں حجاب اور سائرہ پرواعلی کی نظم اچھی لگی۔

"مسکراتی کرنیں" صائمہ خان اور گل شاہ کے لطیفے نے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ "خیلے یہ دہلا" محمود بابر فیصل کے جوابات پڑھ کر بے حد ہنسی آئی اور دل دکھ سے بھر گیا یہ سوچ کر کہ اتنے اچھے انسان اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

"تارے میرے نام" میں انیقہ انا، فوزیہ ثمریٹ اور اپنی بہنی سائرہ پرواعلی کا خط اچھا لگا۔ اب مجھے اجازت۔ اگر غم روزگار سے فرصت ملی تو آئندہ بھی "کرن" میں حاضری دوں گی۔

☼ ☼